رجسٹرڈ نمبر اے ۲۰۱

اُردوی معلیٰ

جلد ۰	بابت ماہ جنوری ۱۹۰۷ء	نمبر ۱

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اُردوی معلیٰ علی گڑھ

علی محمد خاں کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نسیم دہلوی

(از سنہ ۱۲۱۴ھ (غالباً) تا سنہ ۱۲۸۴ھ)

نام و تخلص | نواب اصغر علیخاں خلف نواب آقا علی خاں دہلوی ۔ نسیم تخلص ۔ علاوہ ازیں آپ بہت حکیم مومن خاں مومن دہلوی کے سب سے بہتر شاگرد تھے ۔ چنانچہ قیام دہلی کے زمانہ میں انکے ہاں جو مشاعرہ ہوتا تھا اسمیں مومن خاں بھی برابر شریک ہوا کرتے تھے اور اس زمانہ میں یہ اصغر تخلص کرتے تھے ۔

خاندانی حالات | مرزا نسیم اور انکے برادر بزرگ اکبر علیخاں اپنے دوا در بھائیوں احمد حسین خاں اور محمد حسین خاں سے ناراض ہوکر لکھنؤ چلے آئے اور پھر باقی حصہ عمر وہیں بسر کیا ۔ مرزا اکبر علی خاں اول درجے کے خوشنویس اور نہایت باوضع شخص تھے ۔ لکھنؤ کے دستور کیموافق مکان کے اندر زنانی بانات بیٹھے رہا کرتے تھے لیکن جب کوئی شخص ملنے آتا تھا تو نہایت پرتکلف پوشاک زیب کرکے ملاقات کو نکلتے تھے ۔ ان کے ہاں اور موتی نام دو لونڈیاں تھیں تنگدستی کی حالت میں بھی ان کو آزاد نہ کیا اور پابندی وضع کے لحاظ سے آخر عمر تک ہر حال میں ایک نوکر کو خدمت میں رکھا جو ان کے باہر نکلنے کے وقت دستور قدیم کے مطابق سامنے دست بستہ حاضر رہا کرتا تھا ۔ بھائی کی اس تمکنت کا کچھ حصہ نسیم کو بھی ملا تھا ۔ اور خودداری کا تو یہ عالم تھا کہ جب ان کے بھائیوں نے کچھ روز کے بعد بمقدرت تمام ۵۰۰ روپیے زادِ راہ کے بھیجکر ان کو واپس دہلی بلانا چاہا تو باوجود تنگی معاش اُنھوں نے وہ روپیے واپس کردیے اور بھائیوں کا احسان لینا گوارا نہ کیا ۔

اخلاق و عادات | دوات قلم کبھی اُنکے پاس نہ رہتا تھا اور اکثر غزلیں موزوں کرنیکے بعد قریب کی ایک مکتب میں ردّی کاغذ پر طالب علموں کے موٹے قلموں سے لکھ کر بے احتیاطی کیساتھ ڈالدیتے تھے ۔ اس صورت میں دیوان کے فراہم ہونے کی کیا صورت ہوسکتی تھی ۔ موجودہ دیوان کا جو اُنکے بعد چھاپا گیا قصہ اس طرح پر ہے کہ عبدالواحد خاں خلف مصطفیٰ خاں صاحب مالک مطبع مصطفائی

معذرت

اُردوی معلی کا یہ نمبر غیرمعمولی توقف کے ساتھ شائع ہو رہا ہو۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ کلکتے سے کاغذ کے آنے میں دیر ہوئی۔ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ خریداران رسالہ کو اس قسم کی شکایت کا موقع نہ دیا جائیگا۔ اس وقت تک اُردوی معلی ایوری فنشن قسم اول کے کاغذ پر چھپتا تھا لیکن سُدیشی ملک کے مؤید ہونیکی حیثیت سے ہمکو ولایتی کاغذ کا استعمال سخت ناگوار تھا۔ الحمد للہ کہ آخر ۱۹۰۸ء میں اُس کاغذ کا ذخیرہ جس کو ہمنے بہت دن قبل اکٹھا خرید کر لیا تھا ختم ہوگیا اور ماہ جنوری کا رسالہ سُدیشی کاغذ پر چھاپا گیا ہو اور آئندہ بھی چھپیگا۔ قیمت اور وزن میں یہ کاغذ ولایتی کاغذ کے برابر ہو۔ اسلیے اُمید ہو کہ خریداران رسالہ کو یہ تبدیل کسی حیثیت سے ناگوار نہ ہوگی۔

(اُردوی معلی علی گڈھ بسلسلۂ جدید ۱۹۰۶ء)

ایڈیٹر سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے

مقاصد ضروری (منجملہ دیگر مقاصد) لٹریچر و پالٹکس

قیمت سالانہ مع محصولڈاک

قسم اول۔ اوّل درجے کے ڈبل ایگی کاغذ پر ۲ر

قسم دوم عمدہ سفید کاغذ پر ...... ۱؎ ۸ر

قسم سوم۔ معمولی کاغذ پر ...... ۱؎ ۴ر

نوٹ (۱) اُردوی معلی کے ساتھ بطور ضمیمہ ہر سال اساتذہ قدیم کے غیرمطبوعہ دواوین میں سے کئی دیوان مع دیباچہ و مقدمہ شائع ہوتے ہیں۔ رسالہ قسم اوّل کی قیمت مع اُن دواوین کے حسب شرح سابق للعہ رسالانہ ہو۔

نوٹ (۲) جدید خریداران کو ان کتابوں سے جنکا اشتہار مقابل دوسرے کالم میں درج ہو قسم اوّل دوم و سوم کے خریداروں کو عہ، ۱ء، ۱۴ کی کتابیں بلاقیمت نذر ہونگی۔

(درخواست خریداری بنام سید فضل الحسن منیجر اُردوی معلی علی گڈھ)

دیوان غالب (طبع ثانی، مع شرح دیوان)

تقطیع ۲۰×۲۶ حجم تقریباً ۱۱ جزو کاغذ معمولی سفید صرف ۸ر مع محصولڈاک بمطبع وطبیہ میں تیار۔ دفتر اُردوی معلی علیگڈھ سے ملسکتا ہو۔

فہرست مضامین

(۱) دیباچہ (۲) مقدمہ (الف) غالب کے حالات (ب) غالب کی شاعری (۳) دیوان مع شرح (۴) ضمیمہ یعنی وہ غزلیں و اشعار جو مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہیں

دیوان مصحفی) ماخوذ از دیوان اول و دوم و سوم تقطیع ۱۸×۲۲ حجم ۷ جزو قیمت ۸ر مع محصولڈاک۔

دیوان شیفتہ) مع مقدمہ مفید و ضمیمہ شیفتہ بزبان فارسی شیفتہ تقطیع ۱۸×۲۲ حجم ۶ جزو قیمت ۸ر مع محصولڈاک

دیوان حسرت) اُستاد جرات مع مقدمہ مرتبہ حسرت قیمت ۴ر

دیوان میرسوز اُستاد مشہور مع مقدمہ

دیوان قائم چاندپوری شاگرد رشید سودا ۸ر قیمت

رپورٹ اُردو بمبئی کانفرس قیمت ۴ر

رپورٹ بنارس کانفرس قیمت ۴ر

نیشنل کانگرس اور مسلمان از ملا عبدالقیوم مرحوم۔ قیمت ۴ر

اردوی معلی جلد پنجم قسم اول از جولائی تا دسمبر ۱۹۰۶ء ...... ۱؎

اردوی معلی جلد ششم قسم دوم از جنوری تا جون ۱۹۰۷ء ...... ۱؎

" " جلد ہفتم ۱۹۰۷ء ۱؎

انوارالعیون ملفوظات مخدوم احمد عبدالحق ردولوی ۸ر

رسالہ جواز سود۔ مصنفہ جناب مولوی عبدالصمد صاحب بلند شہری ارمیں مصنف سے مدرستہ العلوم علیگڈھ کے پتہ سے ملسکتا ہو۔

رسید کتب

ہمارے پاس مندرجہ ذیل کتابیں بغرض تنقید آئی ہیں جنپر آئندہ ریویو کیا جائیگا (۱) رسوم جاہلیت از مولانا نجم الدین صاحب پھلواری (۲) آثار اکبری یعنی تاریخ فتح پور سیکری از سعید احمد صاحب مارہروی (۳) تاریخ کلکتہ از مولوی بدرالزمان صاحب کلکتی (۴) زینت النبات از اہلیہ تمیزالدین خاں صاحب عظیم آبادی (۵) شوہر کا رجھانا (۶) تسخیر پنجاب (۷) اختلاف اللسان از وجاہت جھنجھانوی۔

ان کے شاگرد اور قدردان شاگرد تھے اُنھوں نے اُستاد کی لاپروائی کو دیکھکر بطور خود جو کچھ رطب و یابس کلام ملسکا جمع کرنا شروع کیا اور چند روز کے بعد ایک بیاض کی صورت میں مرزا صاحب سامنے پیش کیا حضرت نے اُسے زیادہ تر اپنے معمولی اور کمزور کلام کا مجموعہ پاکر سب غلط شک کے بیما کہکر کہا تو مسترد کردیا لیکن ان کے بعد دلدادگان سخن نے اسی کو غنیمت سمجھا اور وہ نامنظور کلام بھی مطبوع اہل بینش قرار پایا اور اپنے رنگ میں سب سے نرالا ٹھہرا۔

آزادہ روی وخوش طبعی مرزا ایک آزاد مزاج اور رند مشرب شخص تھے لیکن باوجود رندانہ مزاجی بزرگوں سے عموماً اور اپنے بڑے بھائی سے خصوصاً ان کا برتاؤ نہایت مودبانہ ہوتا تھا وہ اپنے شاگردوں کی خاطر بھی حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تھا تو روز اُس کی مزاج پرسی کو جایا کرتے تھے۔

تلاوت قرآن روز ہوتی تھی۔ لیکن صرف چند آیتوں پر اکتفا کرتے تھے۔ آخر زمانہ میں صوم وصلواۃ کے بہت پابند ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی نماز کا وقت تنگ ہو جاتا تھا اور یہ اپنے رومال پر نماز پڑھنے کھڑے ہو جایا کرتے۔ رومال ناکافی ہوتا تھا تو فرمایا کرتے تھے کہ خدا جانتا ہے کہ نسیم کے پاس یہی ایک رومال ہے۔

فیاضی و نرم دلی نسیم کی رحمدلی اور فیاضی کی کیفیت بھی سننے کے قابل ہے۔ مرزا صاحب اکثر ملاقات احباب کیلئے منشی امیر اللہ تسلیم کو ہمراہ لیکر چوک سے نکلا کرتے تھے لیکن اتفاق سے دو ایک بار ایسا ہوا کہ خلاف معمول شاہراہ کو چھوڑ کر پیچ در پیچ گلیوں کا راستہ اختیار کیا گیا اور اُستاد تسلیم نے جب اس کا سبب دریافت کیا تو بڑے اصرار کے بعد فرمایا کہ اصل یہ ہے کہ میری جیب کئی روز سے خالی ہے پھر تم ہی کہو کہ میں بازار سے ہو کر کس طرح نکلتا۔ اور راہ میں اگر کوئی غریب مجھ سے سوال کر بیٹھتا تو میں اُس کو کیا جواب دیتا۔

لطیفہ نسیم کے صاحبزادے حسین بیگ عرف مرزا حسنا کی طبیعت شوق علم سے بالکل بیگانہ واقع ہوئی تھی۔ لوگ ان کی تعلیم کے متعلق اصرار کرتے تھے۔ لیکن مرزا آنکی بدشوقی کے لحاظ سے زیادہ

تنبیہ کرتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا لیکن باوجود کم علمی مرزا حسنا شعر موزوں کہنے سے عاری تھے۔
یک روز ایک صاحب نے مرزا نسیم سے ان کی موزونیٔ طبع کی تعریف کی اور ساتھ ہی اظہار تعجب
بھی کیا۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ اس میں حیرت کی کیا بات ہے حسین بیگ تو آخر میرا بیٹا ہے
میں جب پیشاب کرتا ہوں تو اس کی دھار بھی موزوں گرتی ہے۔

بیاض مومن خاں | مومن مرحوم نے ایک بیاض میں کتاب عروض مصنفہ حزیں کے
اقتباس کے علاوہ اپنے انداز شاعری کے خاص خاص نکتے درج کیے تھے اور اس بیاض کو
ہمیشہ اپنے سرہانے احتیاط سے تکیے کے نیچے رکھا کرتے تھے۔ مرزا نسیم نے چوری سے
اسکی نقل حاصل کر لی تھی اور بعد ازاں عذر خواہ ہوکر اس بیاض کا خاص طور پر درس بھی لیا تھا
استادی منشی امیر اللہ تسلیم فرماتے ہیں کہ میں نے بارہا اس بیاض کے دیکھنے کی اجازت طلب
کی لیکن میری درخواست منظور نہوئی۔ ہر بار حضرت نسیم یہی فرماتے رہے کہ "پہلے لیاقت پیدا کرو
پھر یہ تمھارے ہی لیے ہے"۔ افسوس کہ مرزا صاحب کی وفات کے بعد پھر اس نایاب بیاض کا
کچھ حال نہ معلوم ہوا۔

نسیم کا کمال سخن اور انکے شاگرد | مرزا نسیم کے کمال شاعری اور استادی کا اس سے زیادہ
اور کیا ثبوت ہوگا کہ دہلوی ہونے اور اپنے خاص رنگ پر قائم رہنے کے باوجود لکھنؤ میں اور اس لکھنؤ
میں جہاں ناسخ و آتش کے دعوائے استادی کے سامنے خود وہیں کے دیگر اساتذہ نے سپر ڈالدی
تھی اس یگانۂ عہد نے اپنے شاگردوں اور مداحوں کا ایک معقول گروہ پیدا کر لیا جن میں سے
عبد اللہ خاں مہر اشرف علی اشرف اور منشی امیر اللہ تسلیم کا نام دنیائے شاعری میں ہمیشہ یادگار رہیگا

وسعت نظر کی کیفیت | ایک دن کا ذکر ہے کہ مقبول الدولہ کے ہاں قلق اور بجو وغیرہ مشہور شعرا
عہد کی محفل میں مرزا صاحب کا بھی گزر ہوا حسب معمول حضرت تسلیم بھی آپکے ہمراہ تھے اثنائے گفتگو
میں یہ بحث پیش ہوئی کہ اردو زبان میں شناخت تذکیر و تانیث کا کوئی کلیہ قاعدہ نہیں
سب کو اس رائے سے اتفاق تھا۔ لیکن مرزا صاحب نے کہا کہ آپ لوگ یہ کیا فرماتے ہیں لعض

مستثنیات سے قطع نظر کرکے باقی تمام الفاظ کے متعلق کلیے موجود ہیں۔ جن سے حضرت تسلیم کی جانب اشارہ کرکے کہا کہ شاید یہ بھی بخوبی واقف ہیں۔ اُستاد تسلیم کا بیان ہے کہ خیر اُس وقت تو یہ بات رفت و گزشت ہو گئی لیکن واپسی کے وقت میں نے عرض کیا کہ آپ نے یہ کیا غضب کیا تھا۔ اگر کوئی صاحب مجھ سے کچھ پوچھ بیٹھتے تو میں کیا جواب دیتا۔ اُستاد نے میری نا واقفیت پر تعجب کیا اور پھر وہاں سے مکان تک پہنچتے پہنچتے وہ کلیہ قاعدے ایسے بیان کیے جن سے تقریباً ہر لفظ کی تذکیر و تانیث بآسانی دریافت ہو سکتی تھی

مشق و پُرگوئی | فطری بے پروائی کی بنا پر مرزا صاحب کی اکثر غزلیں مختصر ہوا کرتی تھیں ایک روز عبداللہ خاں مہر نے کہ استاد کی خدمت میں کسیقدر گستاخ بھی تھے ازراہ شوخی "جبین آیا" "یقین آیا" کے ردیف قافیے میں اپنا ۲۳ شعر کا ایک سہ غزلہ پیش کیا اور بطرز شائستہ اُستاد کی کم گوئی پر اعتراض کیا۔ مرزا انکی گفتگو سن کر مسکرائے۔ اور دوسرے وقت اسی زمین میں ستر اشعار کا ایک پنج غزلہ سُنایا جس میں سے ۴۰ شعر کی دو غزلیں مطبوعہ دیوان میں بھی موجود ہیں غزل آخر کے مقطع (نسیم ایسی غزل لکھی کرامت جس سے پیدا ہے۔ ہوئے شرمندہ حاسد منکروں کو اب یقین آیا) میں مہر کی شرارت شاگردانہ کے جواب میں اُن کو "منکر" کہکر شرمندہ کیا ہے۔

پُرگوئی کی دوسری مثال۔ | لکھنؤ کے عہد آخر میں قدردانی اہل کمال کے باب میں منشی نولکشور کا نام بھی خصوصیت کیساتھ ہمیشہ یادگار رہیگا۔ مرزا صاحب نے ہی منشی صاحب ہی کی خواہش سے الف لیلہ کو نظم کرنا شروع کیا تھا لیکن ابھی پہلا ہی دفتر ختم ہوا تھا کہ منشی صاحب کی جانب سے کتاب کو جلد ختم کرنیکا اصرار ہوا۔ مرزا صاحب کو یہ امر ناگوار ہوا اور انھوں نے اس شعر پر دفتر اول کو ختم کرکے چھوڑ دیا ؎ لکھا یہاں تک نسیم دہلوی نے۔ لکھا آگے سے طوطا رام جی نے۔ اسی زمانے میں منشی صاحب نے ایک گلدستہ نکالنا شروع کیا تھا جس میں ماہوار مشاعرے کی غزلیں شائع ہوا کرتی تھیں ایک مہینہ اتفاق سے مشاعرہ نہ ہوا اور غزلیں مہیا نہ ہو سکیں جب اشاعت گلدستہ کا وقت آیا تو مرزا صاحب سے پوچھا گیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آپ نے کہا کہ شام کو سب غزلیں مرتب

ہو جائیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور شام کو طرح گلدستہ یعنی "یکاں کیا گیا" "عیاں کیا گیا" کی ردیف قافیے میں مرزا صاحب نے اپنے تمام شاگردوں کے نام سے غزلیں لکھ کر گلدستہ پورا کر دیا۔

مرزا غالب کی سند کسی گلدستے میں نسیم کی ایک غزل دیکھکر مرزا غالب نے منشی نولکشور سے انکا حال دریافت کیا اور اُن کی چند دیگر غزلوں کا شوق ظاہر کیا۔ منشی صاحب نے ان سے مدت تمام سب حال پوچھکر لکھا اور غزلیں بھی بھیجیں۔ غالب نے جواب میں اپنی کمال پسندیدگی کا اظہار کیا اور ان کا دہلوی ہونا معلوم کر کے لکھا کہ "کہربا جستم و عقیق یافتم"۔

پیروی عوام سے اجتناب غالب کے ذکر کے ساتھ مرزا نسیم کے مزاج کی ایک اور خصوصیت بھی قابل ذکر ہے وہ یہ کہ جس طرح مرزا غالب کو شرکت عوام سے حد درجہ انکار تھا۔ اسی طرح نسیم کو بھی اپنی روش خاص کا اس قدر لحاظ تھا کہ بعض امور میں ان کا طرز عمل لوگوں کو حیرت انگیز معلوم ہوگا مثلاً معاملۂ مذہب ہر کہ نسیم ابتدا میں شیعہ تھے لیکن لکھنؤ میں آکر جب اس مذہب کو مجموعۂ بدعات عوام پایا تو مذہب اہل سنت اختیار کیا اور پھر اس پر آخر وقت تک قائم رہے اور شاعری میں بھی رعایات لفظی کی وبائی عام سے بالکل متاثر نہوے۔ اور نہ صرف اپنے کلام کو اس عیب سے حیرت انگیز طور پر پاک رکھا بلکہ بہت سے باشندگان لکھنؤ کے مذاق کو تبدیل کرنے میں بھی کامیاب ہوئے۔

یہانتک نسیم کا مختصر حال بیان کرنیکے بعد اب ہم اُن کی شاعری کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔

مرزا نسیم کی شاعری

دلفریبی خیال، رنگینی بیان شاعری کے دو خاص جوہر نسیم کو مومن خاں سے بحیثیت میراث اُستاد حاصل ہوئے تھے جن کو اُنھوں نے باضافہ تجدید زباں خوب سے خوب تر بناکر دنیائے شاعری میں اس آن بان کے ساتھ پیش کیا کہ لکھنؤ کے لفظ پرستوں سے بھی داد دہی اور اظہار پسندیدگی سے باز نہ رہ سکے۔ لکھنؤ کی زبان اور دہلی کے بیان کی پسندیدہ اور معتدل ترکیب کا جلوہ جو مرزا نسیم کی شاعری میں نظر آتا ہے اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں ملسکتی۔ اور یہیں سے ہی کہ ہم نسیم کی منتخب غزلوں کو اُردو شاعری کا بہترین نمونہ قرار دینے میں ملاحظہ

حجاب ابر مانع ہی گذر کیونکر ہو گلشن تک
وہ شبنم ہوں پہنچ سکتا نہیں بوٹوں کے دامن تک

خطا میری نہیں صیاد میری آرزو لیجا
کہ مجھکو کھینچ لائی تھی یہی دیوار گلشن تک

نگاہ و تیرے سے کیوں گھورتا ہی دمبدم ظالم
قسم لیلے جو میرا ہاتھ بھی پہنچا ہو دامن تک

بہار فصل گل آئی ہی میں کنج قفس میں ہوں
مبارکباد مجھکو ڈھونڈھ جاتی ہی نشیمن تک

خوشا قسمت قفس میں ہم قفس پر سینکڑوں پردے
نظر بھی ابتو جا سکتی نہیں دیوار گلشن تک

برستا ہی جو ابر تر تمنا میں ٹپکتی ہیں ..
ڈبو دے آب مے میں آج ساقی مجھکو گردن تک

اس غزل کی خوشگوار مستی نتیجہ ہی سادگی الفاظ' تازگی خیال اور رنگینی ترکیب کا اور یہی چیزیں نسیم کی شاعری کی جان ہیں جسکی نیرنگی اور دلپذیری اُس وقت کچھ اور بھی بڑھ جایا کرتی ہی جبکہ وہ تراکیب فارسی میں رنگینی کے ساتھ جدت کی شان کو بھی نمودار کرکے اپنے کلام کو بیمثالی کے عجیب و غریب عالم میں پہنچا دیتے ہیں۔ اشعار ذیل میں نشان زدہ ترکیبیں ملاحظہ ہوں۔

دیکھو او قاتل بسر کرتے ہیں کس مشکل سے ہم
چارہ گر سے درد نالاں درد سے دل دل سے ہم

ہائے کیا بیخود کیا ہی غفلت امید نے
حال دل کہتے ہیں اپنا پھر اُسی قاتل سے ہم

سینۂ دل میں ہجوم داغ حسرت ہی نسیم
پھول چن لیتے ہیں اپنے گلشن حاصل سے ہم

ساغر پلا کے بیخبر دو جہاں بنا
او پیر می فروش ہمیں بھی جواں بنا

اللہ رے درازی آغاز مدعا
نکلا جو حرف منہ سے مرے داستاں بنا

لیل و نہار گیسو و رخسار یار میں
جی چاہتا ہی بیٹھ رہیں اک جہاں بنا

عشاق جانفروش کے دیکھو تو حوصلے
مقتل تمام معرکہ امتحاں بنا

یہاں تک طول تھا اے ہمنفس کل ہجر کی شب میں
دعائیں جاگ کر سو سو رہی آغوش مطلب میں

ہمیں حضرت سلامت کہکے صلواتیں سناتے ہیں
غضب کی شوخیاں ہیں انکی دشنام مودب میں

مرے آنسو کے قطرے ہیں جسے شبنم سمجھتے ہو
ٹپکتا ہی زلال اشک چھنکر دامن شب میں

یہانتک راہ دیکھی زلف شب گون پری ہی
کہیں آ ڈر کہ جھک آئی ہیں نیندیں چشم کوکب میں

پیے انکا رساقی نے ہزاروں خون کر دیے
نگاہیں ڈوب کر رہ گئیں جامِ لبالب میں

بہا ہی نور کا ذرّہ ترے چاہِ زنخداں سے
بلندی حسن نے پائی نشیبِ سیبِ غبغب میں

چوتھے شعر میں نیند کا استعمال بصورت جمع کیفیت سے خالی نہیں اور یہ انداز مومن کے خاندان شاعری کے ساتھ مخصوص ہی۔ مرزا نسیم کے کلام میں اسکی مثالیں اور بھی جا بجا موجود ہیں مثلاً فرماتے ہیں

نسیم غفلت کی چل رہی ہی اُمنڈ رہی ہیں قضا کی نیندیں
کچھ ایسے سوئے ہیں سونیوالے کہ جاگنا حشر تک قسم ہی

کس کو غرض ہے جو اسیرِ بلا کیساتھ
بیکس وہ ہوں اثر بھی نہیں ہی دعا کیساتھ

جب لیجیے اُٹھا کے جنازے کو اقربا
محروم یاں ہوئیں مری آنسو بہا کیساتھ

بہاتی کھلے ہیں غنچے زمردیں ہی چمن کا ساماں
وظیفہ گل ہی اندنوں میں ترانہ عندلیبِ نالاں

فسانہ غم نے بعد مدت اثر دکھایا ہی غفلتوں کا
ہوئے ہیں مصروف چارہ سازی دلِ طپاں خار پرشیاں

سبوئے غنچہ چھلک رہے ہیں مہک رہی ہی زبانِ ریحاں
سرورِ مے سے ہی لغزش پڑ رہے ہیں افتادگی کے احساں

یہ تین شعر ایک قصیدے سے لیے گئے ہیں جنکو دیکھکر ارباب بینش معلوم کر سکتے ہیں کہ مرزا نسیم نے اپنے رنگ سخن کو کسی حالتمیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہی۔ لیکن اختلاف مذاق کے کرشمے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ جن باتوں پر دلدادگانِ نسیم مٹے ہوئے ہیں اُنہیں کو بعض خشک مزاج پیروان ناسخ و اسیر عیوب سمجھکر قابل ترک قرار دیتے ہیں مثلاً نسیم کے چند شعر ہیں

نہیں لگتی پلک اُڑی ہوئی ہیں حسن کے جلوے
نگاہوں میں کھٹکتا ہی تصورِ روئے جاناں کا

(2) گر جانتے جگائیگی یہ خبر حشر کی
احسان نہ لیتے راحتِ خوابِ مزار کا

(3) تو فراغت ہو گئی کیسا سبک جاں ہو گیا
چاک دامن ہو گیا ٹکڑے گریباں ہو گیا

(4) اُڑے اوراق گل بادِ خزاں سے
ہوئی برہم کتاب گلستاں آج

(5) یہ چونکر شور ہو عالم میں میری فکر خاطر کا
دلوں کو کھینچ لیتا ہوں تمہارا رنگ ہو کر

(6) کاٹ لیں ہم آپ سر اپنا توقف کیا ضرور
ہی بعید از شرط الفت رنجش بازوی دوست

ہم گریۂ گلو تنگ سے یادِ گلِ تر میں
صیاد بنا لیں گے قفس میں چمن اپنا

سودیشی اور بائیکاٹ

(اور ہمارے صوبے کے کانگرس لیڈر)

سودیشی تحریک اور بائیکاٹ کے لازم و ملزوم ہونیکے اہم مسئلے پر اگرچہ خاص کانگرس میں زیادہ بحث نہیں ہوئی لیکن پرائیویٹ جلسوں اور ممبران کانگرس کی گفتگوی باہم میں سب سے زیادہ حصہ اسی مضمون کے متعلق ہوتا تھا ہمنے اس بحث پر فریق نرم و فریق گرم دونوں کے خیالات سے حتی الامکان واقفیت بہم پہنچائی اور دونو کے دلایل کو بغور سننے کے بعد اب ہم بلا خوف تردید علانیہ کہہ سکتے ہیں کہ اہلِ ہند کے حقیقی لیڈر مسٹر تلک کی رائے بالکل صحیح ہے اور

سودیشی تحریک کی کامیابی اور بائیکاٹ ضرور لازم و ملزوم ہیں

ہم کو افسوس ہے کہ ہمارے صوبے کے سرغنایان کانگریس نے کسی نامعلوم مصلحت کے خیال سے اپنی تمام قوت تحریک بائیکاٹ کے خلاف صرف کرنیکا قصد کرلیا ہے۔ اور دشمنان ہند یعنی پائنیر و انگلشمین کی مانند ایڈوکیٹ اور انڈین پیپل بھی بنگال بائیکاٹ کی ناکامیابی کی خبریں نہایت مسرت کیساتھ چھاپنے لگے ہیں اور بائیکاٹ کو ناقابل عمل تحریک بتاکر ہمت افزائی کی بجائے لوگوں کو یاس و ناامیدی کے قعر میں دھکیلنے کی کوشش میں نہایت فخر کیساتھ مشغول ہیں۔ چنانچہ کانگرس میں بھی ایک سے زیادہ موقعوں پر اس دعوائی غلط کے ظاہر کرنے کی کوشش کیگئی کہ صوبجات آگرہ و اودھ کے تمام ڈیلیگیٹ بائیکاٹ کے خلاف ہیں۔ اب اگر کسی تحریک کی موافقت یا مخالفت صرف چند سربرآوردہ لوگوں کی مرضی پر منحصر ہے اور وہ لوگ تمام صوبے کیجانب سے اظہار رائی کا حق رکھتے ہیں تو ہم کو اس باب میں کچھ نہیں کہنا ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہے اور بیشک ایسا نہونا چاہیے تو یقیناً بائیکاٹ کے خلاف تمام دلیلیں سراسر غلط ہیں اور صریح مغالطے جنکے بلا چون و چرا تسلیم کرنیکے لیے اس صوبہ کا ہی نوجوان اور آزاد خیال گروہ ہرگز تیار نہیں ہے۔ اصل میں صورت حال اس طور پر واقع ہوئی ہے کہ ابتدا میں ہندوستان کے ساتھ انگلینڈ کی تجارتی پالیسی یہ تھی کہ یہاں سے صرف خام پیداوار حاصل کیجائے اور انگلستان کے کارخانجات صنعت و حرفت کو ترقی دیجاتے اس پالیسی کی تکمیل کیلئے ضروری تھا کہ یہاں کی صنعت برباد کر دیجائے اور ہندوستان محض ایک زراعتی ملک بنا دیا جائے

چنانچہ اسی ضمن میں ہماری ریشم و پارچہ بافی کی صنعت کو انگلستان کی ناجائز کارروائیوں سے تقریباً نابود کر دیا
اب سوال یہ ہے کہ وہ نیست شدہ پرانی اور نئی صنعتیں ہندوستان میں کیونکر رائج ہو کر کامیاب بھی ہوں۔
ظاہر ہے کہ اسکی صرف دو صورتیں ہو سکتی ہیں اول یہ کہ حکومت اُن کی نگہداشت میں مصروف ہو اور اشیائے
ممالک غیر پر محصول لگا کر دیسی چیزوں کی ترقی کی حفاظت کرے جیسا کہ انگلستان نے اپنی صنعت پارچہ بافی کے
فروغ کیلیے ہندوستان کے سوتی اور ریشمی مال پر ایک زمانے میں ۷۰ فیصدی سے لیکر ۸۰ فیصدی تک محصول لگا دیا
تھا لیکن جب ہم کو یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ حکومت ہند ہرگز اس امر پر راضی نہ ہوگی کہ انگریزی مال پر ہندوستان
کے فائدے کیلیے محصول لگایا جائے تو سوائے اسکے اور کوئی صورت باقی نہیں رہتی کہ ہم پروٹیکشن یا حفاظتی
محصول کی بجائے اپنے اوپر لازم کرلیں کہ دیسی چیز کے مقابلے میں ولایتی چیز اس سے کم دام میں بھی ہرگز خرید
نہ کرینگے اور اسی کا نام بوائکاٹ ہے بیشک ہمکو اس اصول کے مطابق اکثر اوقات گراں چیز خریدنا پڑیگی
لیکن سمجھنا یہ چاہیے کہ اگر گورنمنٹ ہماری موید ہوتی یا ہمکو وضع قانون کا اختیار ہوتا تو کیا صورت ہوتی
ظاہر ہے کہ ہم پروٹکشن کی پالیسی اختیار کرتے اور اشیائے ممالک غیر پر اتنا محصول لگا دیتے کہ دیسی چیزوں
کے مقابلے میں انکی قیمت گراں ہو جاتی اور اس وقت ہم دیسی ہی چیزوں کو خریدتے جو درحقیقت ولایتی
چیزوں سے گراں ہوتیں۔ لیکن مصنوعی طور پر اُن سے سستی نظر آتیں۔ پس ہم

صوبجات متحدہ کے کانگرس لیڈروں سے سوال

کرتے ہیں کہ وہ بوائکاٹ کو کس بنا پر ناپسند کرتے ہیں اور سودیشی چیزوں کو کسی قدر گراں داموں میں
بھی خرید کرنے پر انھیں اُصولاً کیا اعتراض ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو بوائکاٹ
پر اُصولاً کوئی اعتراض عائد نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس پر عمل کرنے میں دقتیں ضرور پیدا ہونگی اور انھیں
دقتوں کو مخالفین بوائکاٹ ہر موقع پر بطور دلیل پیش کیا کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون میں
ان دلیلوں کی لغویت کو قطعی طور پر ثابت کر دکھائیں۔

پہلا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ محض اصول کی خاطر سے ولایت کی سستی چیزوں کے
مقابلے میں دیس کی گراں چیزیں نہ خریدیں گے اور ایسے بوائکاٹ کامیاب نہ ہوگا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اس خیال
سے لوگوں کو اگر صلاح نیک دیجائے تو یقیناً وہ بوائکاٹ کی حمایت میں نقصان اُٹھانا بھی منظور کرلیں۔
کیونکہ درحقیقت بوائکاٹ کا منشائے آخری اسی دقت کو رفع کرنا یعنی ایسی صورت کا پیدا کرنا ہے جسمیں سودیشی
چیزیں ولایتی چیزوں سے سستی پڑیں مثلاً مزدوری کے ارزاں ہونے اور روئی کے ملک ہی میں موجود ہونے
اور کرایہ آمد و رفت انگلستان کی بچت کے سبب سے اگر ہندوستان ہی میں کپڑا بننے لگے تو یقیناً وہ منچسٹر کے
بنے ہوئے کپڑے سے سستا پڑیگا۔ لیکن اس ارزانی کو پیدا کرنیکے لیے اول ضرورت اس بات کی ہوگی
کہ ہندوستان کے کارخانجات پارچہ بافی کو کسی نہ کسی طرح اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ منچسٹر کے

کارخانوں کی برابر پہنچ سکیں جسکے لیے سوا اسکے اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم لوگ اس وقت تک کہ ہندوستان فری ٹریڈ کیلیے تیار ہو جائے کسیقدر مالی نقصان بھی برداشت کر کے غیر ممالک خصوصاً انگلستان کی چیزوں سے پرہیز کریں اور اگر ہم ہوشمند ہیں تو ہمکو اس ابتدائی نقصان کو بخوشی برداشت کرنا چاہیے کیونکہ اسی کی وجہ سے آئندہ ہمکو انتہائی فائدہ پہنچنے کی اُمید ہے یہ نقصان بالکل اس نقصان کے مانند ہوگا جو طالب علم تحصیل علم کیلیے بصورت فیس کے اکثر اوقات اپنے اوپر جبر کر کے بھی برداشت کرتا ہے

پس امرا اور متوسط درجے کے لوگوں کا فرض ہے کہ بتقاضائے حب ملک نیز اپنے آئندہ فوائد کثیر کے لحاظ سے کسیقدر مالی نقصان ضرور گوارا کریں۔ رہے غربا جو ذرا سا بھی نقصان نہیں برداشت کر سکتے اُن کو لازم ہے کہ مالی نقصان کی بجائے کسیقدر ترک راحت و ترک فیشن ہی سے اس مبارک تحریک کی مدد کریں یعنی اس طرح کہ بجائے تنزیب اور چائنا کے کچھ روز کیلیے جولاہوں کے ہاتھ کے بنے ہوئے موٹے کپڑے استعمال کریں۔ یہ کپڑے ولایتی کپڑوں سے مضبوط بھی رہیں گے اور انمیں دام بھی کم خرچ ہونگے۔ البتہ کسیقدر تکلیف ضرور ہوگی اور شاید فیشن میں بھی فرق آئے۔

ہمارے ملک کے سرمایہ دار اور کاریگر سالہا سال تک کاروبار تجارت سے مجبوراً علیحدہ رہنے کے سبب سے تجارتی حوصلہ مندی اور دوربینی سے تقریباً محروم ہو گئے ہیں اسلیے یہ اُمید کرنا کہ امید موہوم پر وہ نئی انڈسٹریوں پر اپنا سرمایہ لگانے کیلیے تیار ہو جائینگے بالکل عبث ہے صرف سودیشی تحریک ان کو اظہار اولوالعزمی پر ہرگز آمادہ نہیں کر سکتی برخلاف اسکے سودیشی مع بائیکاٹ کے ذریعہ سے چونکہ دیسی چیزوں کی مانگ بڑھنے کی قطعی امید ہوگی اسلیے پست ہمت سرمایہ دار بھی مختلف ملوں اور کارخانوں کے قائم کرنے پر آمادہ ہو جائینگے اور صاف ظاہر ہے کہ جب مختلف کارخانے قائم ہوں گے تو انمیں مقابلہ بھی ہوگا اور کاریگروں کی واقفیت اور کاریگری میں بھی ترقی ہوگی جس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ دیسی چیزیں بھی بہت بننے لگیں گی اور رفتہ رفتہ ان چیزوں کی خوبی یہانتک ترقی کر جائیگی کہ پھر ہم کو بائیکاٹ کی ضرورت بھی باقی نہ رہیگی اور ہم بھی فری ٹریڈ کے اصول پر عمل کر سکیں گے۔ چنانچہ اسی بنا پر مسٹر دادا بھائی نوروجی نے باوجودیکہ فری ٹریڈر ہونیکے اپنے پریسیڈنشل ایڈریس میں ہندوستان کی موجودہ تمدنی حالت میں سودیشی تحریک اور بائیکاٹ کی ضرورت کو تسلیم کیا۔ کیونکہ بقول مسٹر گوکھلے فری ٹریڈ کی پالیسی کا اصل منشا یہ ہے کہ خواہ کوئی مال ہو وہ وہاں تیار کیا جائے جہاں اسکی تیاری میں صرف کم سے کم ہو۔ اور وہاں فروخت کیا جائے جہاں اسکی قیمت زیادہ ملے۔ اگر کسی خاص موقع پر ان اغراض میں خلل واقع ہو تو اس خرابی کو مٹانیوالی تمام کاروائیاں فری ٹریڈ کے موافق خیال کیجائینگی۔ اب ہر شخص کو اس امر کا اقبال ہوگا کہ مزدوری کے ارزاں ہونے اور روئی کے پاس موجود ہونیسے ہندوستانکو سوتی مال بنانیکا اعلیٰ موقع حاصل ہے اور اگر اس معاملہ میں سودیشی تحریک اسے اپنی اصلی حالت پر از سر نو قائم کرنے میں معاون ہو تو یہ تحریک فری ٹریڈ کے خلاف نہیں بلکہ اسکے موافق ہوگی"

یہاں تک بوائیکاٹ کے اقتصادی پہلو پر نظر کرنیکے بعد اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اس تحریک کا ایک پولیٹکل پہلو بھی ہے جس کے ذریعہ سے زیردست یا مفتوح قومیں بلا کشت و خون جنگ و جدال زبردست یا فاتح قوموں کو اُن کی درازدستیوں اور بے انصافیوں سے باز رکھ سکتی ہیں چنانچہ بوائیکاٹ کی اسی پولیٹکل حیثیت کے لحاظ سے ہمارے صوبے اور بہار کے توقیر یافتہ حکام پرست حضرات اس تحریک سے علیحدہ ہی رہنا مناسب سمجھتے ہیں اور ظاہر ہیں اس پر

دوسرا اعتراض

یہ کہا جاتا ہے کہ لارڈ کرزن اور سر فلر کے مظالم بیجا کی بنا پر اگرچہ بنگال بوائیکاٹ کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے لیکن دوسرے صوبوں پر چونکہ ابھی تک اس درجہ جور و جفا کی نوبت نہیں آئی ہے اس لیے ان کو اس تحریک میں حصہ نہ لینا چاہیے۔ ظاہر میں یہ اعتراض نہایت وقیع معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہی دلیل سب سے زیادہ پوچ اور لچر ہے۔ جس کے پیش کرنے والے بلاشبہ دانستہ یا نادانستہ طور پر نیشنل کانگرس کے اصل اصول کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے خیال میں کانگرس کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور مختلف قوموں کی بیگانگی باہم کو مٹا کر پولیٹکل حیثیت سے تمام اہل ہند کو ایک حقیقی قوم بنا دے کانگرس کے وجود سے قبل مختلف صوبوں میں مختلف پولیٹکل انجمنیں قائم تھیں جن کا کام یہ تھا کہ مقامی شکایتوں کو مقامی حکام کے روبرو پیش کیا کریں۔ یہ انجمنیں بجائے خود مفید تھیں لیکن چونکہ ایک صوبے کو دوسرے صوبے سے کوئی تعلق نہ تھا اس لیے ان کا دائرہ عمل و اقتدار بالکل محدود تھا چنانچہ زیادہ تر اسی کوتاہی کو رفع کرنیکی غرض سے نیشنل کانگرس کی بنیاد پڑی اور اس وقت کانگرس کی کامیابیوں میں سے مسلمہ طور پر سب سے بڑی کامیابی یہی سمجھی جاتی ہے کہ اسکے ذریعہ سے پرووِنشلزم کی اسپرٹ کی بجائے اہل ہند کے دلوں میں "نیشنل اسپرٹ" کا مادہ پیدا ہو گیا ہے۔

اس مقدمہ کے ثابت ہو جانیکے بعد اب جو شخص یہ کہے کہ "بنگالیوں پر ظلم ہوا ہے اس لیے صرف بنگالی فریاد کریں۔ مدراسیوں۔ الہ آبادیوں اور لکھنویوں کو اس سے کیا مطلب" تو اس

شخص کو کانگرس لیڈر مجھنا لفظ لیڈر کی ہتک کرنا ہو۔ رہی زبانی ہمدردی اس کے ہم قائل نہیں ہیں کیونکہ ایسی آسان اور بے معنی ہمدردی کا اظہار تو برا ڈرک۔ کرزن اور فلر کی زبان سے بھی ہو سکتا ہے اور ہوا بھی ہے۔

طرفہ ماجرا یہ ہو کہ مخالفین بوائیکاٹ کا یہ دعوی ہی سراسر غلط ہو کہ ظلم صرف بنگال پر ہوا ہے۔ کیونکہ کلکتہ کانگرس کے رزولیوشن میں بنگال بوائیکاٹ کا جواز اس لیے منظور کیا گیا ہو کہ "رعایا کو انتظام مملکت میں مطلق دخل نہیں ہو اور گورنمنٹ ان کے دعاوی پر مطلق توجہ نہیں کرتی" اور یہ صورت حال صرف بنگال ہی تک محدود نہیں ہو بلکہ تمام ہندوستان کے لیے یکساں ہو۔

اس اعتراض دوم کی مہملیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہو کہ اس سے ایک طرح پر یہ بھی سمجھا جا سکتا ہو کہ اگر تقسیم بنگال کی تجویز آج مسترد ہو جائے تو بنگالی سودیشی اور بوائیکاٹ سے دست بردار ہو جائینگے حالانکہ کم از کم اہل بنگال میں سے فریق گرم کا ہرگز یہ خیال نہیں ہو ان کا تو یہ قول ہو کہ "مشیت الٰہی نے بذریعہ تقسیم بنگال بوائیکاٹ او سلف ہیلپ کا خیال دفعتاً ہمارے دلوں میں ڈالدیا ہے اور اب کہ ہم اس اصول پر قائم ہو گئے ہیں تو اس واقعہ اتفاقی کے ساتھ اصول سلف ہیلپ کی نسبت قائم رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہو۔ اگرچہ یہی واقعہ اس اصول کی دریافت کا باعث ہوا ہو اب ہم بوائیکاٹ سے صرف اپنے غصے کا اظہار نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ اسکے ذریعہ سے اپنی ایک بہت بڑی اقتصادی ضرورت کو بھی رفع کرنا چاہتے ہیں یعنی ملک کی برباد شدہ صنعت و حرفت کو از سر نو زندہ کرنیکا ارادہ رکھتے ہیں" کاش ہمارے صوبے کے کانگرس لیڈر بھی محب وطن بنگالیوں کے اس بیان سے سبق لیں اور سمجھیں کہ

بوائیکاٹ پر عمل کرنا بہر حال لازمی ہو

یعنی یہ کہ بفرض محال اگر پولیٹیکل اغراض کے لیے بوائیکاٹ کرنا نامناسب بھی ہو تو کم از کم ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے اس کے ضروری ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ اس مضمون کے ابتدائی حصے میں ثابت ہو چکا ہو

تیسرا اعتراض

یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ ہم غیر ممالک کی تمام چیزوں کو بائیکاٹ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ایسا نا قابل عمل چیزوں کو کیا جائے۔ اسی ضمن میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بائیکاٹ کے لغوی معنی یہ ہیں کہ اغیار سے تمام تعلقات یکلخت دفعتاً توڑ دیے جائیں اور یہ ہندوستانیوں سے موجودہ حالت میں اس وقت ممکن نہیں ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری حالت زار اس امر کی مقتضی نہیں ہے کہ ہم کسی لفظ کے لغوی معنوں کے پھیر میں پڑے رہیں اور کل ممکن نہ ہو تو جزو سے بھی ابتدا نہ کریں۔ اصل یہ ہے کہ اصول بائیکاٹ کو تسلیم کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ممالک غیر کی تمام چیزوں کو ترک کرنے کا ایک آئیڈیل قائم ہو جائے جس کا کسی وقت میں پورا ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے ضروریات میں سے کوئی شے ایسی نہیں ہے جو بر اعظم ہند میں پیدا نہ ہو سکتی ہو۔

کمی صرف اسقدر ہے کہ بعض چیزوں کے پیدا کرنے کا سامان نہیں ہے۔ اور اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے ہم ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اس باب میں بعض عقلمندوں کا یہ قول کہ جبتک ہم کسی چیز کو فوراً حاصل نہ کر سکتے ہوں اس وقت تک اس کی خواہش ہی نہ کریں ہرگز لحاظ کے قابل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ امر فطرتِ انسان کے خلاف ہے۔ پس ہمکو مخالفین کے طعنوں سے پست ہمت نہ ہونا چاہیے بلکہ اپنے مقصد آخری کو پیش نظر رکھتے ہوئے جبتک ضرورت ہو۔

بائیکاٹ کو انگلستان کے مال تک محدود کر دینا چاہیے

جسپر تقریباً ہر شخص عمل بھی کر سکتا ہے کیونکہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے کہ اہل ہند کی ضروریات روزمرہ میں سے بہت ہی کم چیزیں ایسی ہیں جنکے لیے انھیں انگریزی مال کی خریداری پر مجبور ہونا پڑے۔ اس میں شک نہیں کہ کارخانوں اور ملوں کے لیے انگریزی کلوں اور مشینوں کی خریداری مجبوراً کرنا پڑیگی لیکن ایسے لوگوں کی نسبتی تعداد زیادہ نہیں ہے اور عام طور پر لوگ یقیناً ذرا سی احتیاط کرکے انگریزی مال کو بکامیابی بائیکاٹ کر سکتے ہیں۔ تاہم اگر کسی سے یہ بھی نہو سکے تو اُسے چاہیے کہ ابتدا میں بائیکاٹ کے

حلقہ کو بھی محدود کرسکے اور بقول لالہ لاجپت رائے ''صرف اُن ایک یا دو یا زائد چیزوں کو بائیکاٹ کرنا شروع کرے جو فی الحال ہندوستان میں بن سکتی ہیں اور جن کو ترقی دیکر ہم ارزاں بھی کرسکتے ہیں مثلاً اور

انگریزی کپڑے کا بائیکاٹ

جس سے دو فائدے ہونگے۔ اول یہ کہ ہم انگلینڈ پر اپنی ناراضی کا اظہار کرکے اپنے پولیٹکل مطالبوں کو تقویت پہنچائیں گے۔ دوسرے یہ کہ ممالک غیر کی سب سے بڑی تجارت پر حملہ کرسکیں گے جس میں کامیابی کی بھی معقول اُمید ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں زراعت کے بعد سب سے بڑی صنعت پارچہ بافی ہی کی ایسی باقی ہے جسکو ہم تھوڑی ہی سی کوشش سے دوبارہ سرسبز کرسکتے ہیں۔

بعض لوگ لفظ بائیکاٹ کو انگریزی لغت میں آئرلینڈ کے ایک قصہ سے متعلق بتاکر

آخری اعتراض

یہ کرتے ہیں کہ اس لفظ میں دوسروں کو نقصان پہنچانے کا مفہوم پنہاں ہے جو انگریزوں کو ضرور ناگوار گذریگا۔ بیشک گذریگا لیکن یقیناً عوام انگلستان کی ناراضی لغوی تحقیق کی بجائے مالی نقصان پر مبنی ہوگی۔ اور اگر سودیشی تحریک سے اُن کو نقصان پہنچیگا تو وہ اس لفظ سے بھی اسیقدر ناراض ہونگے جتنے کہ بائیکاٹ سے پس جب ہندوستانی صنعت و حرفت کی ترقی انگریزی تجارت کو نقصان پہنچائے بغیر نہیں ہوسکتی تو ہمیں دو امور کے درمیان فیصلہ کرلینا ہے کہ

''آیا ہم ملک کی ترقی کا خیال چھوڑ دیں یا انگریزوں کو خوش رکھیں''

اگر ہمارے صوبے کے لیڈر اپنے انگریز دوستوں کی آزردگی کے خیال سے ''بائیکاٹ'' کے لفظ سے بچنا چاہتے ہیں تو یہ بات تعجب انگیز ہے کہ کانگرس میں ''سلف گورنمنٹ'' کا مطالبہ کرنے میں کیوں بیباک ہوجاتے ہیں جو انگلستان کو بائیکاٹ سے کئی گنا زیادہ ناگوار ہوتا ہوگا۔ خیر اب رہی صرف مسلمانوں کی مخالفت وہ ہمارے نزدیک نیچرل نہیں ہے۔ کیونکہ فطرتاً کوئی ہندوستانی عام اس سے کہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اپنے دیس کا مخالف نہیں ہوسکتا پس ضرور ہے کہ اسکی مخالفت ظاہری کی بنا خوشامد پر ہو یا خوف پر جو غیر طبعی ہونیکے سبب سے یقیناً کبھی کبھی کم ہوجائیگی۔ بہرحال ہمکو ایسی مخالفتوں کی پرواہ نہ کرنا چاہیے خصوصاً ایسی حالت میں کہ

معتوبہ وائیڈ اینڈ رول" کی پالیسی کی بدولت ہمکو ہر مفید ملک کام میں اسی کی قسم کی مشکلوں کے پیش آنیکا یقین کامل ہو پس" جبکہ ہر طرح پر اہل ملک حق پر ہیں تو ان کو کسی کی عارضی خوشی اور ناخوشی کی پروانہ کرکے اپنے کام میں مشغول رہنا چاہیے۔ خدا انکی مدد کریگا۔" فقط

بلبل

(مشہور انگریزی شاعر کیٹس کی نظم نائٹنگیل کا ترجمہ)

میرے دلمیں درد اُٹھا ہوا اور ایک مست کردینے والی غفلت میرے حواس پر غالب آگئی ہے۔ گویا میں نے بادۂ ارغوانی کا ایک ساغر پی لیا ہے یا کسی خواب آور شربت کا جام تلچھٹ سمیت پیکر ملک خود فراموشی میں پہنچ گیا ہوں۔ اے بلبل تو یہ خیال نہ کرنا کہ تیری خوش قسمتی پر مجھے رشک آتا ہے۔ بلکہ تیری آزادی اور خوش وقتی نے میرے دلپر ایک مسرت بخش اثر پیدا کر دیا ہے۔ کیونکہ اے درختوں پر اُڑنیوالے ہلکے پروں والے فرشتے تو کسی خوشگوار سبزہ زار میں بیشمار درختوں کے گھنے سایہ میں بہت ہی بے تکلفی کے ساتھ اپنے گلوئے خوش آہنگ سے موسم بہار کے مضمون پر نغمہ سنجی کر رہا ہے

آہ اس وقت مجھے کوئی اُس بادۂ گلگوں کا ایک گھونٹ پلادے جو ایک عرصہ تک زمین میں دفن رہنے سے سرد ہو گیا ہو جس میں گلہائے معطر، خوش رنگ سبزہ، گرمی خورشید سے جوش مسرت میں آئی ہوئی صحرا کی نازک اندام لڑکیوں کے ناچ اور گانے کا مزہ آتا ہو۔ آہ میرے آگے کوئی شراب پرتگالی کی ایک صراحی رکھدے جسمیں صاف و سرخ شراب بھری ہو اُسکے ساتھ ہی ایک ساغر بھی ہو جس کا منہ مے ارغوانی کے اثر سے سُرخ ہو گیا ہو اور جسکے کنارے پر حباب چشمک زنی کر رہے ہوں اگر ایسی شراب مجھے ملجائے تو اُس کا ایک ہی جام پی کر دنیا کے تمام تفکرات کو بھول جاؤں اور اے پیارے بلبل تیرے ساتھ سیر صحرا میں محو ہو جاؤں۔

اسقدر محویت مجھپر طاری ہو کہ اپنی ذات سے بیخبر ہو جاؤں اور وہ تکالیف و مصائب و آفات جنکے صدمے ہم انسان اس دنیا میں ایک دوسرے کو کراہتے دیکھتے اور سنتے ہیں جہاں زمانہ کی کاٹ چھانٹ

ست نیچے ہوئے عَلم کا نشان ڈسپنے والے تھوڑے سے سفید بادل ہجوم آلام سے کانپتے ہیں جہاں سرخی شباب
فق ہو کر موہوم سی رہجاتی ہو اور آخر رفتہ رفتہ نا پید ہو جاتی ہو جہاں خوشی کا محض خیال بھی تنا ور اُگتا ہو کہ
فوراً اس قسم کے خیال پر غم کی فوج کشی ہوتی ہو اور مایوسی اُن آنکھوں کو بند کر دیتی ہو جو ایک زمانے کے بعد سست
کسی موہوم خوشی کی خبر سنکر غایت شوق سے ابھی نیم وا بھی ہونے پائی تھیں جہاں حسینوں کی چشم
کی برق اندازی کو بھی قیام نہیں اور جہاں خود محبت کی دیوی کی زندگی یکروزہ ہو ان سب باتوں کو تیری
ذات میں محو ہو کر بھول جاؤں گا اسلیے کہ اے خوش نصیب بلبل تجھ تک ان افکار و آلام اور نقص عدم ثبات
کی رسائی نہیں اے دنیاوی افکار تم مجھ سے دور ہو جاؤ اے پیاری بلبل مجھے اب ان سے کوئی تعلق نہیں
کیونکہ میں اب تیرے ساتھ اُڑنے کے لیے تیار ہوں مگر کیا سست رفتار نشۂ شراب کی مدد سے میں تیرے ساتھ
ہم پروازی کی تاب لا سکوں گا نہیں نہیں۔ میں برق سیر نظم کے خیالی پروں پر سوار ہو کر تیرا ساتھ دونگا
گو اس میں بھی میری قوت متخیلہ ضعف کی مقر ہو اور ابھی سے تیری تیز روی اُسے پیچھے ڈال رہی ہو۔ آہا
کیسی پیاری رات ہو خوش قسمتی سے ملکہ قمر اپنے زمردیں تخت پر جلوہ افروز ہو اور زرّیں لباس نجوم کمر
زریں باندھے ہوئے اسکے گرد پرا باندھے ہیں لیکن جہاں میں بیٹھا ہوا ہوں اُس سراپا حسن ملکہ کا جلوۂ
جہاں آرا نظر نہیں آتا صرف اسکے حسن کی تھوڑی سی شعاع خوشگوار ہوا کے جھونکے اپنے ساتھ اُڑا لاتے
ہیں اور وہ گنجان درختوں کے ہلنے والے پتوں کی جالی اور جھومتی ہوئی سبز شاخوں کی آڑ سے جھانک لیتی ہیں
تاریکی شب اور اپنی از خود رفتگی کے باعث میں اُن پھولوں کو دیکھ نہیں سکتا جو میرے پیش پا اُفتادہ
ہیں اور نہ مجھے یہ خبر ہو کہ میرے سر پر شاخہائے زمردیں کن نرم اور مشک بیز پھولوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں
مگر اس تاریکی میں بھی نسیم معنبر کے ہلکے جھونکے میرے مشام کو معطر کرتے ہوئے دماغ میں پہنچتے ہیں اور میری
آنکھوں کے آگے اُن تمام چیزوں کی خیالی تصویر کھنچ جاتی ہو جنمیں اس خوشگوار موسم کی برکتیں فطرت نے
ودیعت کر دی ہیں۔ سرسبز پودے۔ جھاڑیاں جنگلی میوہ دار درخت۔ سفید صحرائی پھول۔ پردۂ برگ میں
چھپا ہوا سادہ مگر خوشرنگ بنفشہ موسم بہار کے شباب پر آئے ہوئے گلہائے رنگین بادۂ شبنم سے بھرے
بعطر غنچے غرضکہ موسم بہار کی دلچسپ شام کا پورا سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہو۔

اس تاریکی میں خاموشی کیساتھ میں تیرا نغمۂ دلکش سنتا ہوں اکثر ایسا اتفاق ہوا ہی کہ آسمان موت کو میں نے محبت کی نظر سے دیکھا ہی اسے بہت پیارے ناموں سے یاد کیا ہی تاکہ حالت اطمینان میں میرے پاس آکر میرا دم نکال لے۔ مگر آہ اس سہانے وقت میں تو میری خوش قسمتی ایسے اعلیٰ درجہ کے کمال کو پہونچ گئی ہی کہ "ہر کمالے را زوالے" کا خیال میرے دل میں بُری طرح کھٹک رہا ہی۔ اب یہ ڈر معلوم ہوتا ہی کہ کہیں اس زمانہ سعادت کے گذرنیکے بعد پھر انہیں دنیوی مصائب کا سامنا ہو اس لیے اب یہی آرزو ہی کہ اسیوقت میری جان نکلجائے۔ ہم فانیوں کو آخر مرنا تو ہی ہی پھر اس سے بہتر اور کونسا وقت ہو سکتا ہی کہ آدھی رات کے سہانے وقت میں جب۔ تو اپنی شیریں آواز اور نغمۂ دلکش کے ذریعہ اس لطف اور مزے کے ساتھ فرحت باد میں اپنی روح پھونک رہا ہی۔ عالم محویت میں بغیر کسی تکلیف کے میری روح پرواز کرجائے۔ ارے پیارے بلبل تو تو ہمیشہ گاتا رہیگا مگر یہ فانی کان تیرے نغمۂ شیریں کو پھر نہ سن سکینگے۔ اے غیر فانی پرندے! تو مرنیکے لیے نہیں پیدا ہوا ہی۔ بے رحم زمانہ تجھے پامال نہیں کرسکتا ہی شیریں آواز جو میں آج اس بے ثبات رات میں سن رہا ہوں اگلے زمانے میں شاہ و گدا امیر و فقیر سن چکے ہیں شاید یہ وہی نغمہ دلربا ہی جس نے زمانہ کی ستائی ہوئی نازآفریں محبوبہ رتھ کے پرالم دل میں چٹکیاں لی تھیں جب وہ الفت وطن کی بیمار چشم پُرنم کے ساتھ اجنبی زمین پر کھڑی تھی۔ یہ وہی پیارا راگ ہی جو خوفناک موجزن دریا سے گھرے ہوئے قلعۂ جادو میں ناز پرور گرفتار شہزادی کے غم آشنا کانوں میں پہنچا جس سے متاثر ہوکر اسکے دل میں اُمید کی ایک ہلکی سی جھلک پیدا ہوئی اُس نے قلعہ کی کھڑکی کھول دی اور اپنے دل کے مالک وارفتادہ عاشق کے شوق دید میں متلاطم دریا پر نظر دوڑائی جسے ایک ظالم ساحر نے اُس سے چھڑا دیا تھا۔

ہائے "چھڑا دیا تھا" اس لفظ کی یاد نے میرے زخم دلکو تازہ کر دیا اور سارے بدن میں سنسنی پیدا کردی یہ ایسا لفظ ہی کہ میرے کانوں میں گونجکر تجھ سے مجھے جدا کر رہا ہی اور اپنی فانی ذات کی طرف مجھے بُلا رہا ہی خداحافظ اے پیارے بلبل! مشہور ہی کہ قوت متخیلہ آدمی کو بہت دہوکا دیسکتی ہی مگر میرے حق میں تو اب اسمیں دہوکا دینے کی بھی طاقت نہیں رہی اب میری آنکھ کھل گئی اور یہ ظاہر ہوگیا کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا۔ الوداع! الوداع!!! اب تیری دلفریب آواز دھیمی ہوتی جاتی ہی۔ لو وہ اس میدان سے نکلکر چشمہ کو طے کر چکی اور پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئی۔ ہائے! اب تو وہ دور بھی نہیں سنائی دیتی اے لو پلک جھپکتے ہی وہ پہاڑ سے بھی اُتر کر اُس طرف کی وادی میں دفن ہوگئی اے خدا میری آنکھیں مجھے دہوکا تو نہیں دیتیں یا کہیں عالم بیداری ہی میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ ہائے وہ شیریں آواز اور دلکش نغمہ کہاں غائب ہوگیا۔

(ماخوذ از غنچۂ سجادیہ)

مکتوبات امیر مینائی

مرتبہ حضرت ثاقب

نعیم الحق آزاد شیخپوری کے نام

مجبی زاد لطفکم سلام مسنون ۔ سیر خلوت کے بھیجنے کی اجازت کیا دوں اور اُس کے دیکھنے کا اقرار کیونکر کروں ۔ جب افکار و آلام و امراض سے ایک غزل بھی دیکھ لینا دشوار ہوتا ہے مجھے مجبور و معذور سمجھ کر معاف فرمائیے ۔ آپ کی غزل اگر پہنچی ہوگی تو اصلاح کے بستے میں رکھی ہوگی ۔ مجھے ابتک اُسکے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی ۔ جب گلچین کے چھپنے کا وقت آئیگا دیکھکر بھیجدی جائیگی ۔

مین نے تواب یہی مشرب اختیار کرلیا ہی کہ آئی اور آئے ۔ گئی اور گئے سب مین ہمزہ "ی" خیال کیجائے اور ۲۰ عدد لیے جائین ۔ پہلے میرا خیال تھا کہ آئے مین ۱۰ عدد اور آئی مین ۲۰ عدد شمار کیے جائین مگر اب بعض وجوہ سے یائے معروف اور یائے مجہول دونوں کے ۲۰ عدد قرار دیے ہین ۔ اگر آپ کو یہ مشرب پسند آئے تو آپ بھی اختیار کیجیے ۔ اور جلال نے آئے مین دس عدد نہیں لیے ہین بلکہ بیس عدد لیے ہین ۔ البتہ بوئے میں "ی" نہیں لکھی ہے ۔ واو کو اضافت دی ہے چنانچہ دیوان مین بھی بغیر "ی" کے چھپوایا ہے اور افادۂ تاریخ میں بھی اس سے بحث کی ہے ۔ مگر مین اس کو پسند نہین کرتا ۔

امیر فقیر ۔ ۲۱ اپریل ۱۸۹۳ء

دفتر امیر اللغات ۔ رام پور

حکیم برہم صاحب کے نام

پیارے برہم ۔ لکھ کر پچتا رہا ہون کہ برہمی پیارے ہونے کی چیز کہان ہے کہ مین نے پیارے برہم القاب مین لکھا ۔ پھر یون دل کو تسکین دیتا ہوں کہ کسی کی برہمی بھی تو کسی کو

مزہ دیکھاتی ہے۔ میرا مخاطب تو بعنایت الٰہی مجھپر مہربان ہو ابتدا میں البتہ کسیقدر اثر تخلص کو کام میں لایا تھا مگر جب دیکھا کہ اس سے یہ کڑیاں نہ اٹھیں گی تو اب رحم آگیا مہربان ہوگیا اور خدا سے اُمید ہو کہ مہربان ہی رہیگا۔ اسکی تقصیرات صدور سی ہوسلی ہی عفو کریگا۔ پیارے برہم ۱۸ فروری کا خط اس وقت نظر کے سامنے ہو اور تاخیر و تقصیر جواب سے مجھے محجوب کر رہا ہی۔ امیر اللغات کو خدا رونق دے ذرا میری زیر باری گھٹے تو ضرور ایک وقت اصلاح کیواسطے نکالوں گا۔ امیر اللغات کا پہلا حصہ چھپ گیا۔ اس ہفتے میں خریداروں کو پہنچیگا۔ اشتہارات ہندوستانی بعض اخباروں میں چھپ گئے۔ انگریزی اخبار پائنیر کے ۲۰ مارچ کے ڈیلی میں تو ۲۱ مارچ کو شائع ہوگیا۔ عنقریب اشتہار انگریزی بھی جو ایک منتخب ادیب مسٹر فلپ صاحب ڈائرکٹر ریاست رامپور نے لکھا ہی پائنیر میں ملفوف ہوکر نکلیگا تاکہ عموماً فرنگیوں کو اطلاع ہوجائے صنم خانے کو چندے ابھی اور رہنے دو۔ خدا ذرا اطمینان دے تو اچھا ہو کہ نکلے بغیر اپنے چھپوائے خاطر خواہ نہ چھپے گا۔ منشی نظام الدین صاحب نظام کی لیاقت سے میں بخوبی آگاہ ہوں افسوس کہ بڑی ناقدردانی کے وقت میں وہ پیدا ہوئے اور بہت خراب مقام پر اُن کا قیام ہی خدا اُن کو کہیں اچھی جگہ پہنچائے۔ میری آرزو تو یہ ہو کہ امیر اللغات کو رونق ہو تو اُن کو اسی دفتر میں رونق افزائی کی تکلیف دوں۔ میرا سلام کہیے گا۔ محمد احمد تسلیم گذارہیں۔

امیر فقیر۔ ۲۸ مارچ ۱۸۹۲ء

حکیم عابد علی صاحب کوثر خیرآبادی کے نام

مجی و مشفقی زاد عنایتکم۔ سلام مسنون اخلاص و دعا مشحون۔ آپکا محبت نامہ مرقومہ ۱۸ جولائی آیا تھا میں سخت نادم ہوں کہ نہ آپکی غزل دیکھ سکا نہ خط کا جواب لکھ سکا۔ کیا کروں بیماریوں سے تو نجات ہی نہیں ہوتی۔ اب بھی بعض اعزا سخت بیمار ہیں۔ جنکی بیماری بہت ہی مکلف روح ہی۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ عجب اتفاق ہی کہ میری طرح آپ کو بھی کاہشوں سے فراغت نہیں ہوتی۔ آپ کے بھائی کی بیوی کا دو معصومہ لڑکیوں کو چھوڑ کر رحلت کر جانا بڑے

کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اس موقع پر مجھ کو کہنا یہ ہو کہ مولانا پر اُن اعتراضات کے علاوہ جو مہمل ہیں، بعض بجا اور درست اعتراضات بھی ہیں جن کا باعث اگر غور کیا جاوے تو سراسر عصبیت نظر آتا ہو۔ لاریب جس مقام، خاندان اور جس سوسائٹی میں جو شخص نشو و نما حاصل کرتا ہے اس کی طرز، انداز، اخلاق، عادات اور خیالات اس کا خمیر بن جاتے ہیں لیکن یہ حالات ایسے ہیں کہ انسانی طبیعت اپنر قابو رکھتی ہو اور ایک منٹ میں ان سب سے علیحدہ بھی ہو سکتی ہو۔ ایک جج اور منصف کیلیے یہ بہت ضروری بات ہو کہ اُسے اپنی طبیعت پر اس قدر قابو ہو کہ وہ انصاف کیوقت ان تمام امور سے مبرا ہو۔

لیکن باوجود نقاد ہونیکے مولانا حالی نے اپنی تصانیف میں اس امر کا لحاظ نہیں کیا مثلاً ان کا ایک خیال لکھنؤ پر دہلی کی فوقیت کا ایسا ہو کہ اُنھوں نے اس بحث پر جہاں کہیں خامہ فرسائی کی ہے حد انصاف و صداقت سے گزر گئے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ مرزا شوق صاحبِ مثنوی زہرِ عشق کو خواجہ میر اثر دہلوی کا مقلد بنایا ہو۔

ہم ذیل میں تذکرہ گلشن ہند سے خواجہ میر اثر مرحوم کی مثنوی کے چند اشعار نقل کرتے ہیں جنکے دیکھنے سے مولانا کے دعوی کی حقیقت ناظرین پر خود بخود روشن ہو جائیگی۔

ناک تیری عجب سجیلی ہے — پتلی اور اونچی اور نکیلی ہے
ناک ہو یا کہ ایک طوطا ہے — چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے
نتھنے ایسے ترے پھڑکتے ہیں — جانور وحشی جوں بھڑکتے ہیں
ذائقہ میں تو جیسے یہ لب ہیں — شہد و شربت جو کچھ کہو سب ہیں
دانت جب مجھ کو یاد آتے ہیں — دل کلیجا سب ہی چباتے ہیں
دیکھ کر آنکھیں آ بدار کو یاں — لوٹ جاتا ہو گو ہر غلطاں
گر کبھو اسکے جی میں آوے ہو — مسّی دو انگلیاں لگاوے ہو
دانت پھر یوں چمکتے ہیں سارے — رات اندھیری میں جیسے ہوں تارے

جب خیال آتا ہے ہر گردن کا | یاں ڈھلک جائے ہر مرتبکا
گو کہ شفاف ہے تن مینا | یاں تو جھکتی ہے گردن مینا
کیوں نہ کھینچے وہ سب آپکو دور | جسمیں ایسا بھرا ہوا ہو غرور
دھیان میں جب وہ بازو آتے ہیں | ہاتھ پاؤں اپنے پیٹ جاتے ہیں

انگلیاں جب وہ یاد آتی ہیں!
دلیں ناخن میرے گڑاتی ہیں

ان اشعار کے دیکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ سوائے بحر کے اور کسی چیز میں زہر عشق کو ان سے کچھ بھی مناسبت ہے۔ گو یہ ایک مشہور مقولہ ہے کہ "خطائے بزرگان گرفتن خطا ست"۔ لیکن ہماری دانست میں اس پر عمل کرنا ضروری نہیں کیونکہ اس سے اخلاقی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر ہم مولانا حالی سے اپنی گستاخی کی نسبت معافی مانگنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

ضیاء الحسن علوی

میرے دوستانے والے

میں چاہتا ہوں کہ لوحۂ عشق کی نقاشی کروں حسن و جذبات محبت، خیالات سودا کی تصویریں لفظوں میں، منظوم لفظوں میں، شعر میں کھینچوں۔ میرا کلام اہل درد کو رلائے اہل محبت میں جوش پیدا کرے، اور حسرت زدوں کی تمناؤں اور حسرتوں کی ترجمانی کرے میں ایک قوم کی زبان بنوں: میں شاعر ہونا چاہتا ہوں۔

میں مصور ہونا چاہتا ہوں: چاہتا ہوں، کہ اصل میں لوحۂ عشق کی نقاشی کروں۔ حسن، جذبات محبت اور خیالات سودا کی تصویریں، حقیقی تصویریں کھینچوں۔ شاعر جو بتلانا چاہتا ہے، میں اُس کی صورت بنا کے دکھا دوں۔ میری رنگ آمیزیاں صفحۂ قرطاس پر باغ کا باغ کھلا دیں، حسین اور دل آویز خیالات کو مجسم کر کے دکھا دیں۔

میں چاہتا ہوں کہ نثار بنوں، جس کی نثر پر شعرا کو رشک ہو۔ جس طرح چشمہ کا صاف اور شفاف پانی جھرنے میں سے گرتا ہے، اور رنگ برنگ کے چھوٹے پتھر اُسکی تہ میں چمکتے نظر آتے ہیں، میری نثر بھی ایسی ہی صاف اور شفاف ہو، اور رنگ برنگ کے روشن خیالات اُس کی تہ میں چمکتے نظر آئیں۔

میں سردارِ قوم ہونا چاہتا ہوں: گھر گھر میرا نام عزت سے لیا جائے، مجھ سے قوم کی اُمیدیں وابستہ ہوں۔ میں قوم کو شاہراہِ ترقی پر لیجاؤں، میں اُن کے حقوق کی حفاظت میں راتدن کوشاں رہوں، اسی دھن میں راتوں کو نہ سوؤں، دنوں کو مصروف رہوں۔

ہاں! میری تلوار کی جھنکار سے زمانہ گونج اُٹھے، میرے نام کے آتے ہی شیروں کا زہرہ پانی ہو جائے، میری جہانگیرانہ سطوت کی مدح میں نئے فردوسی اور ہومر پیدا ہوں، میں اور موت ہم مشرب رفیق ہوں۔ میں جبار ہوں اور جباروں کو ستانے والا۔ تاریخ میں میرا نام خون اور شعلے سے لکھا جائے۔ میں نبرد آزما بننا چاہتا ہوں۔

یہ میرا دماغ کہتا ہے۔

مگر وہ گوشت کا ٹکڑا جو تو نے میرے سینے میں پیدا کر دیا ہے، اور جو اب بھی ہر وقت کی طرح دھڑک رہا ہے، اور جب تک میں زندہ ہوں دھڑکا کرے گا اور مجھے مصیبت میں ڈالا کرے گا کہتا ہے:-

"نہیں، میں شہرت نہیں چاہتا، میں محبت چاہتا ہوں، سوزِ الفت چاہتا ہوں! چاہتا ہوں، کسی ایک کے لیے دھڑکوں، کسی ایک کے لیے تڑپوں، کسی ایک پر فدا ہو جاؤں"!

(یلدرم)

ازبغداد

بیاض حسرت

ماخوذ از تذکرۂ مصحفی

اثر۔ محمد میر برادر خواجہ میر درد "شعر ہندی و فارسی کم از برادر بزرگ نمی گوید"

کب کب تیری گلی میں ہم بیقرار آئے — سو بار جی نے چاہا تب ایکبار آئے
جو سزا دیجیے ہے بجا مجھکو — تجھ سے کرنی نہ تھی وفا مجھکو

مرزا سلیمان شکوہ

ساقیا ہے یہ جام کا عالم — جیسے ماہ تمام کا عالم
اب خدا پھر ہمیں نہ دکھلائے — شب ہجراں کی شام کا عالم
تجھپہ بھی ان دنوں ہی نام خدا — کچھ عجب دھوم دھام کا عالم

مرزا جان طپش شاگرد میر درد

اس گلشن جہاں میں جو آیا سو داغ ہے — گلچین روزگار سے کس کو فراغ ہے
خاک سے جام کیا جام کو پھر خاک کیا — تو نے کیا کیا نہ کچھ اے گردش افلاک کیا

اشرف علیخاں فغاں

کیا تجھ سے خوش ہے دل ناشاد رفتگاں — اتنا بھی تو نہیں کہ کرے یاد رفتگاں
واماندگان راہ عدم گوشش کیجیو — بانگ جرس نہیں یہ ہے فریاد رفتگاں

محب۔ شیخ ولی اللہ شاہجہاں آبادی

اس بت نے گلابی جو اٹھا منہ سے لگائی — شیشے میں عجب آن سے جھلکی تھی خدائی
واللہ ہمیں عشق کی بھولی ہوئی سب چال — کافر تری رفتار نے پھر یاد دلائی
عاشق کو محب سلطنت ہر دو جہاں ہے — گر یار کے کوچہ کی میسر ہو گدائی
اسے ذبح کرنے دیجو تو نہ منہ سے آہ کیجو — جو یہ رسم عاشقی ہے تو محب نباہ کیجو

فقط

انبیائے ہنود

(از ملا عبد القیوم مرحوم)

فلسفۂ الٰہیہ کا مسلم مسئلہ ہی کہ واجب تعالیٰ تنزہ۔ تجرد۔ اور صفائی کے اُن مراتب عالیہ میں ہے جن کا ادراک کرنے سے عقل انسانی بالکل عاجز اور قاصر ہی۔ اور ہم ممکنات سراپا غواشی ظلمات و حجاب ہیولانی میں مستور و مغشی ہیں۔ نیز یہ امر ثابت و محقق ہی کہ واجب تعالےٰ مریدِ اشیاء اور مدبر و مؤثر عالم ہی۔ کافۂ بلاد و جمیع عباد کی تدبیر و انتظام اور نظم و نسق اُسی کے ارادے اور مشیت سے ہی۔ اور تمام بندوں کی بھلائی بُرائی ہدایت و ضلالت اُسی کے دستِ اختیار میں ہی اُسکو تمام عالم کے ساتھ اور تمام عالم کو اُس کے ساتھ ایک قسم کا خاص علاقہ و ربط و ارتباط ہی۔ جو مؤثر و متاثر میں شرط ہی۔ چونکہ وہ غایت لطافت اور عالم نہایت کثافت میں ہی۔ لہٰذا ضرورت ہی کہ جاعل اور مجعول۔ یا خالق اور مخلوق کے درمیان ایک ایسا واسطہ و ربط یا برزخ ہو جو ایک طرف تو تنزہ اور صفائی کے لحاظ سے مبدء عالیہ سے اتصال رکھتا ہو۔ اور دوسری طرف ظلمت و مادیت کے اعتبار سے ملحق بہ مادیت ہو۔ اسی برزخ اور اسی واسطہ و رابطہ کا نام با صطلاح شرع "نبی یا رسول" رکھا جاتا ہی۔

جبکہ امر مسلم ہو چکا۔ تو اب جو بات معرض بحث میں آسکتی ہو یہ ہے کہ تبلیغ کے بدون بھی کوئی اُمت قابل تعذیب ہو سکتی ہی یا نہیں؟ یعنی کسی ملک اور کسی قوم میں جب خدا کیجانب سے کوئی نبی اور کوئی رسول ہی نہیں بھیجا گیا۔ تو آیا وہ قوم مستوجب عذاب الٰہی و عقاب ایزدی قرار دیجا سکتی ہی یا نہیں؟ یہ بات بالکل خلاف عقل ہی۔ نیز مناسب عدل و ملائم انصاف بھی نہیں کہ تبلیغ رسالت اور اتمام حجت کے بغیر کوئی گروہ مستوجب عذاب و مستحق عقاب سمجھ لیا جائے۔ عادل حقیقی کی نسبت یہ گمان کرنا

کہ وہ تبلیغ رسالت کے بغیر اپنے بندوں کو جہنم میں جھونک دیگا' سراسر مسلمانوں کے ایمان وعقائد سے منافی ہو کیونکہ خدائے تعالیٰ نے صریحاً ارشاد فرمایا ہو" اِنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ" یعنی خدائے تعالیٰ اپنے بندوںپر ہرگز ظلم کرنیوالا نہیں ہو اسلیے علم کلام میں یہ مسئلہ مسلم و محقق ہو کہ قبل دعوت کوئی امت معذب نہیں ہوتی۔ اسی واسطے پہاڑوں کے دامن اور غاروں میں رہنے والے جن کو دعوت نہ پہنچی ہو معذب نہ ہوں گے۔

جب یہ مقدمہ بھی ثابت ہوگیا تو اب دیکھنا یہ ہو کہ کوئی قوم اور کوئی ملک بغیر نبی اور بغیر رسول کے خالی رہ سکتا ہے۔ یا ہر قوم اور ہر ملک کیلیے کسی نہ کسی رہنما اور ہادی کی ضرورت ہو؟ قرآن مجید خود اس سوال کا نہایت واضح طور پر جواب دیتا ہو:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ہر قوم کیلیے رسول ہو

وَمَا مِنْ قَرْیَةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ کوئی گاؤں ایسا نہیں ہے جسمیں کوئی نذیر یعنی نبی نہ گیا ہو

ظاہر ہو کہ جب کوئی قوم اور کوئی قریہ تک رسول اور نذیر سے خالی نہ چھوٹا تو ہنود کی کثیر التعداد قومیں اور ہندوستان کی سی وسیع قلمرو کیونکر نذیر سے خالی رہ سکتی ہو۔ قرآن مجید میں ایک موقع پر ارشاد ہوا ہو:۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ انبیا میں سے بعض ایسے ہیں جنکا قصہ ہمنے تجھ سے بیان کیا اور بعض ایسے ہیں جنکا قصہ ہم نے تجھ سے بیان نہیں کیا

اس آیت سے ظاہر ہو کہ بہتیرے نبی ایسے ہیں جن کا حال ہم کو معلوم نہیں۔ خدائے تعالیٰ ہی بخوبی جانتا ہو۔ لہذا اُن بزرگوں کی نسبت جنکے ارشادات اور جن کی تعلیم و ہدایت ایک خاص حد تک مفید قوم اور مصلح ملک ثابت ہوئی ہو۔ یہ خیال کرنا کہ وہ خدا کی جانب سے بھیجے گئے ہیں اور نبی یا پیغمبر کہے جا سکتے ہیں۔ کوئی نامناسب بات نہوگی۔ دیگر ممالک میں بعض ایسے بزرگوار باخدا پائے جاتے ہیں۔ جن کی نبوت

یا رسالت کے متعلق کتاب الٰہی تو ساکت و صامت ہے لیکن اُن کی تلقین، اُن کا رفارم و تبلیغات۔ اور اُن کے سوانح زندگی بتلاتے ہیں کہ اُنھیں نبی یا پیغمبر کہنا نازیبا نہ ہوگا۔

ہندوستان میں رامچندر جی، لچھمن جی، کرشن جی، وغیرہ اوتار ہنود، ایسے بزرگوار ہیں۔ جن کی تلقین و رہنمائی، اور فلسفیانہ و خدا پرستانہ زندگی، اُن کو نبی اور رسول کا خطاب دینے میں پس و پیش نہیں کرتی ہے۔ اسی طرح ایران میں جناب زردشت کو بھی پیغمبر کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تعلیم نفس و نور حاصل کیا تھا۔ علی ہذالقیاس چین، اور دیگر ممالک بعیدہ میں انبیاء کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا انکار ایک ایسی سخت اور فحش غلطی ہوگی جس پر آیات قرآنی شاہد ہیں۔

علمائے عظام اسلام، اور صوفیہ کرام عالیمقام، مثلاً حضرت مرزا مظہر جانجاناں، حضرت قاضی ثناءاللہ صاحب پانی پتی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی تحریرات میں یہ امر نہایت مستدلانہ طور پر مسطور و مذکور ہے کہ رامچندر جی، لچھمن جی، کرشن جی، وغیرہ اوتار ہنود۔ غالباً انبیائے مبعوثین میں سے ہیں۔ مرور زمانہ سے لوگوں نے ان کے حالات و روایات میں خلط ملط کر دیا ہے۔ ان حضرات کا ملخص استدلال وہی دو قرآنی آیتیں ہیں، جن کو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔ اور اب دوبارہ درج کرنے کی حاجت نہیں، علاوہ اسکے بعض اہل کشف و شہود مثل حضرت سید عبدالرزاق بانسوی، مجدد الف ثانی، وغیرہ اس بات کے قائل ہیں کہ سرزمین ہند میں انوار نبوت نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ اجودھیا میں حضرت شیث کی قبر ہے جس کو ہندو، رام جی کا سمادھ بتلاتے ہیں۔ اور یہ مسلم ہے کہ ورود آدم علیہ السلام لنکا میں ہوا ہے۔ جو مہبط و قدمگاہ حضرت ابوالبشر ہونے کی وجہ سے آجتک زیارتگاہ مسلمین و ہنود ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ اور چونکہ روایتوں میں یہ وارد و ثابت ہے کہ آنحضرت صلعم کا نور مبارک حضرت آدم علیہ السلام کی جبین مبارک میں ودیعت کیا

اسیلئے ظہور نور آنحضرت صلعم بھی اولاً ہند ہی میں ہوا ہی۔
غرض مذکورۂ بالا اوتار ہنود منجملۂ ارباب نفوس زاکیہ و عقول عالیہ و محسوب فی الانبیاء ہیں۔ اور اس بنا پر مسلمانوں کو ضروری ہی کہ اُنھیں وقعت اور عظمت کی نظر سے دیکھیں اور اُن کا نام بے ادبی سے نہ لیں۔ کہ قرآنی ہدایت و تعلیم ہم کو یہ آدب سکھاتی ہی کہ ہم مشرکین کے بتوں کو بھی بُرا نہ کہیں کہ وہ اسوجہ سے خدا کو بُرا بھلا کہینگے اور ہم بالفرض و بالواسطہ اس بُرائی و خرابی کے باعث موجب ٹہرینگے۔
حضرت مرزا مظہر جانجانان ہنود کی بابت اہل شرک ہونیکے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کو اہل توحید بتاتے ہیں۔ اور بتوں کی پرستش کو مثل تصور شیخ اہل تصوف کے خیال کرتے ہیں۔ فقط (ماخوذ از صحیفہ)

بلجیم کے دلفریب نظارے

نمبر ۳

برسلس کی بعض سڑکیں بہت اونچی نیچی ہیں اور پُرانے اور نئے محلے صاف ایک دوسرے سے علیحدہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح شہر کے دو حصے ہوگئے ہیں ایک نو جہاں نئی طرز کی عمارتیں ہیں۔ اور دوسرا جہاں پرانے طرز کی عمارتیں ہیں جو اب رفتہ رفتہ معدوم ہوتی جاتی ہیں۔ ایک طرف جب میں رائل پیلس کی اطراف و جوانب کی عمارتوں کا خیال کرتا ہوں اور دوسری طرف جب ہوٹل "دیل" کی پرانی اور ازمنۂ وسطی کی عمارتوں کو دیکھتا ہوں اور ان دونوں کا مقابلہ کرتا ہوں تو ایک فرق عظیم معلوم ہوتا ہی۔ مگر جب یہ خیال کیا جاتا ہی کہ کتنی مختلف قومیں اس ملک پر حکومت کر چکی ہیں۔ تو یہ فرق کچھ تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا۔ اوّل نیدرلینڈ کے شاہزادوں کا یہاں زور رہا۔ پھر اسپانیہ کی سلطنت ہوئی۔ اس زمانہ میں جنگ و جدال کیوجہ سے برسلس

کو بہت ہی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر آسٹریا کی حکومت ہوئی۔ اس کے بعد
فرانسیسیوں کا دور آیا۔ پھر ہالینڈ کے ساتھ اتحاد ہوا اور بکثرت بغاوتیں ہوئیں۔
بالآخر ۱۸۳۱ء میں موجودہ بادشاہ لیوپولڈ کا باپ تخت نشین ہوا۔ اس تمام زمانۂ انقلاب
میں برسلس کی عمارتوں میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہوا۔ ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت۔ قدیم
زمانہ کے جو کچھ آثار باقی رہ گئے ہیں شائقین کیلیے بہت غنیمت ہیں۔ ان عمارتوں میں
جو زمانہ وسطی کی کہی جاتی ہیں اوّل نمبر "گرانڈ پلیس" یا "مارکٹ پلیس" کا ہی۔ یہ ایک مربع
بازار ہی۔ جو قدیم شہر کے وسط میں واقع ہی اور یورپ کی زمانہ وسطی کی خوبصورت
یادگاروں میں شمار کیا جاتا ہی۔ برسلس کی تاریخ کو اس بازار سے بہت کچھ تعلق ہی۔
۱۵۶۸ء میں یہاں ڈیوک آف آلوا ہسپانیہ کے جنرل کے حکم سے ۲۵ امرا رکے
سر قلم کیے گئے تھے۔ اس بازار کے چار طرف نہایت خوبصورت پرانے طرز کے
محلات ہیں جو مختلف دستکاریوں کی طرف منسوب ہیں اور ان سب کے سامنے
برسل کا وہ خوبصورت اور عالیشان ٹاؤن ھال واقع ہی جسے "ہوٹل دی ویل" کے نام
سے پکارتے ہیں۔ اس ہوٹل کی جانب یسار ایک محل ہی جو بوچڑوں کے محل
کے نام سے مشہور ہی اور علامت کے طور پر اس کے اوپر ایک بطخ بنی ہوئی ہے
تیراندازوں کے نام سے مشہور ایک محل اس کے سامنے ہی جس پر علامت کے
طور پر روموس رمیس اور بھیڑیے کے بت نصب ہیں۔ اسکے بائیں طرف جہازرانوں
کا محل ہی جس کا چھجا ایک جہاز کے پتوار کی مانند ہی۔ اور جس پر چار توپیں
لگی ہوئی ہیں۔ اسکے قریب بڑھیئیوں کا محل ہی جس کی کھڑکیوں پر نہایت خوبصورت
کام کیا ہوا ہی اور جانب راست ایک اور عمدہ محل ہی جو چھاپنے والوں کے نام
سے منسوب ہی۔ اس کے بعد درزیوں کا ایک محل ہی جو اپنی خوبصورتی میں کسی سے
کم نہیں ہی۔ ان محلات سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان میں یہ دستکار جمع ہو کر اپنی دکانیں

کھولتے ہیں۔ یہاں ان دستکاروں کے وکلا اور قائم مقام آکر جمع ہوتے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے اپنے حقوق کی حفاظت کیلیے انجمنیں قائم کی ہیں جو ان محلات میں اجلاس کرتی ہیں۔

جو مربع جگہ ان محلات کے بیچ میں ہے وہاں اب بھی بازار لگتا ہے اور انواع و اقسام کے لوگ اقطاع عالم سے آکر خرید و فروخت کرتے ہیں۔

ٹاؤن ہال یعنی ہوٹل ڈی ویل عمارت کے لحاظ سے بے مثل ہے۔ بازار کیجانب جو رخ ہے وہ بالکل گاتھک طرز کا ہے اور اوپر سے لیکر نیچے تک تمام تصاویر کندہ ہیں جن میں معماروں کے بت بھی شامل ہیں۔ اس کا مینار ۳۰۰ فیٹ اونچا ہے اور خوبصورتی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اس کے اوپر میکائیل فرشتہ کا مسی بت ۱۶ فیٹ لمبا ایک ہاتھ میں تلوار لیے کھڑا ہے۔ ہوٹل ڈی ویل کے اندر کے دالان میں دو خوبصورت فوارے جاری ہیں جنپر پانی کی دیبی کی مورتیں بنی ہوئی ہیں۔ اس محل کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی ظاہری خوبیوں کا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔ نیچے اوپر تمام کمرے ایسے خوبصورت سامان سے سجے ہیں کہ انسان ششدر رہجاتا ہے ایک کمرے میں پرانے بادشاہوں کی تصویریں ہیں۔ دوسرے میں نہایت خوبصورت طریقے سے کپڑے پر مختلف تاریخی واقعات اور افسانے کڑھے ہوئے ہیں۔ ایک کمرے کی چھت پر اولمپیا کے دیوتاؤں کی تصویریں منقوش ہیں۔ ایک کمرے کی چھت پر بہت سے فرشتوں کے مرقعے ہیں جنمیں سے ایک میں یہ صفت ہے کہ جس رخ سے چاہو دیکھو

ملہ جس دن میں بازار گیا تھا اُس دن اتفاق سے بہت بڑا مجمع تھا۔ اس مجمع میں چند عورتیں دیہاتی لباس پہنے جگہ جگہ ناچتی پھرتی نظر آئیں۔ ان میں سے ایک ہاتھ میں دف کی مانند ایک باجا تھا جسے وہ ہاتھ سے بجاتی جاتی تھی اور باقی عورتیں اسکے سامنے ناچتی تھیں۔ انہیں دیکھکر مجھے ہندستان کے چھوٹے درجے کے نٹ اور کنجر یاد آئے۔ جو اسی طرح گاتے بجاتے اور ناچتے بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہی کہ وہ فرشتہ تمہاری ہی طرف دیکھ رہا ہی۔

تمام کمروں میں مجھے میکس میلین (MAX MILIAN) کا کمرہ بہت پسند آیا۔ اس کی چھت پر نہایت خوبصورت کام کیا ہوا تھا اور دیوار پر بہت سی عمدہ تصویریں بنی تھیں۔ جھاڑ فانوس اور شاہ بلوط کی میزیں اور کرسیاں جنسے یہ کمرہ سجایا گیا تھا ایسی نفیس اور خوبصورت تھیں کہ بہت کم اُن کی مثل دیکھنے میں آئی ہیں۔

دعوت کا کمرہ ۶۵ فیٹ لمبا ہی اور نہایت نفیس شاہ بلوط پر گاتھک طریقے کی دستکاریاں کرکے سجایا گیا ہی۔ کپڑوں پر مختلف دستکاروں کی تصویریں اپنے خاص طرز لباس میں دکھائی گئی ہیں۔ قریب ہی برسلس کے مے ار (AJOT) اور مشہور مجسٹریٹوں کے نہایت عمدہ رومین بت نصب ہیں۔ جو کمرہ شادیوں کے نام سے منسوب ہی اُس پر بہت سے افسانے منقوش ہیں اور برسلس کے مشہور امرا کے لکڑی کے بت نصب ہیں۔ اس محل کا زینہ نہایت خوبصورت ہی۔ اور اُس پر دو نہایت عالیشان تصاویر ہیں جو قابل ذکر ہیں۔ ایک میں بادشاہ جان سوم دستکاران برسلس کو اُن کے حقوق عطا کر رہا ہی تاکہ اپنی اپنی ریپریزنٹیٹو جماعتیں مقرر کرسکیں۔ دوسرے میں برگنڈی (ملکہ) قسم کھا رہی ہی کہ برسلس کے شہریوں کے حقوق کی ہمیشہ حفاظت کریگی۔ ایک اور تصویر ہی جس میں امرا کے خلاف بغاوت اور اعلان امن وامان کے سین دکھائے ہیں۔ اسکے بعد زینے سے نیچے اُترنے کا راستہ ہی۔ باہر سے نکل کر عمارت کی پشت پر اگر دیکھو تو اُس کی تعمیر بالکل نئی طرز کی معلوم ہوگی کیونکہ اس طرف کا پرانا حصہ فرانسیسیوں کی لڑائی میں تباہ ہوگیا تھا اور اب نیا بنایا گیا ہی۔

ہوٹل سے تھوڑے فاصلے پر مینی کن کا فوارہ ہی۔ یہ ایک عجیب و دلچسپ بت ہی جسے دیکھنے کو لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ کہتے ہیں سترہویں صدی عیسوی میں یہاں کے کسی امیر کا چھ سات برس کا ایک لڑکا فوت ہوگیا تھا اُس لڑکے کی یادگار کے طور

اُس امیر نے اُس کا یہ تانبے کا بت بنا کر اس جگہ ایک اونچے مقام پر نصب کیا ہے۔ مینی کن تنگ دھڑنگ ایک ہاتھ کمر پر رکھے دوسرے ہاتھ سے اپنی پہنو کو تھامے کھڑا پیشاب کر رہا ہے۔ لوگ بکثرت اس تماشہ کو دیکھنے آتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس کو یہاں کے لوگوں نے مسخرانہ طور پر تصور کیا ہے۔ مگر چھوٹے درجے کے لوگ قریب قریب اس کی پوجا کرتے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ یہاں ایک بڑا میلہ لگتا ہے جس میں مینی کن کو لمبی ٹوپی اور کوٹ پتلون پہنا کر سجاتے ہیں اور اُسکے گلے میں ہار ڈالتے ہیں۔ جس طرح برسلس کی بادشاہت بدلتی رہی ہے اُسی طرح اس لڑکے کا لباس بھی بدلتا رہا ہے۔ جب نوئی پنزدہم نے اس شہر پر قبضہ کیا تو اس کو فرانسیسی لباس پہنایا۔ بلکہ یہاں تک کہ اس مسخرے بادشاہ نے اس مسی بت کو جس کی ہیئت کذائی پر شاید اُسے بہت لطف آیا ہوگا تمغہ کراس لوئی بھی عطا کیا تھا۔ اب بھی یہ حال ہے کہ غیر ملک کے مسافر ضرور ان حضرت کا درشن کرنے آتے ہیں اور بڑی بڑی فیشن ایبل لیڈیاں گاڑیوں پر سوار اس کے قریب سے گذرتی اور رومال منھ پر رکھکر کن انکھیوں سے دیکھتی جاتی ہیں۔ میرے ساتھ گاڑی پر ایک امریکن لیڈی تھی۔ اُس نے بیان کیا کہ امریکہ میں بہت سے لوگوں سے اُس نے اس تماشے کا حال سُنا تھا۔ اس بت کے پوسٹ کارڈ ہزاروں طرح کے ہر طرف شہر میں بکتے ہیں۔ اور اس کے چھوٹے چھوٹے بت جن کے سروں پر ربڑ کی پھلی لگی رہتی ہے جسے دبانے سے پیشاب کے مقام سے دھار نکلتی ہے۔ ہزارہا دکانوں پر دیکھنے میں آتے ہیں۔

یہاں سے نکلکر ہم "یادگار شہدا" دیکھنے کے لیے گئے۔ یہ ایک خوبصورت عمارت ہے جو بلجیم کے اُن باشندوں کی یادگار میں تعمیر کی گئی ہے جو ۱۸۳۰ء میں فتح کی لڑائی میں مارے گئے تھے۔ اس کے بعد ہم نے وہ خوبصورت مینار دیکھا جو "مینار کانگرس" کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس کی تعمیر ۱۸۵۰ء میں ہوئی تھی تاکہ اُس کانگرس کی یادگار رہے جس نے ۱۸۳۱ء میں بلجیم کی موجودہ بادشاہت کو قائم کیا۔ یہ مینار دورک

طرز کا ۱۴۷ فیٹ لمبا ہی اور اس کے اوپر بادشاہ کا ایک مسی بت ۱۴ فیٹ اونچا نصب ہے اس کے نیچے نو مورتیں بنی ہیں جو بلجیم کے نو اضلاع کو بتاتی ہیں۔ چاروں کونوں پر چار عورتوں کے تانبے کے بت کھڑے ہیں جو آزادی قلم۔ آزادی تعلیم۔ آزادی مجالس اور آزادی مذہب کے نام سے موسوم ہیں۔ کانگرس کے ممبروں کے نام بھی مینار پر کندہ ہیں۔ ۱۹۶ چکردار سیڑھیوں کا ایک زینہ ہی جس کے ذریعہ سے چوٹی پر پہنچتے ہیں جہاں سے گرد و نواح کا نہایت دلچسپ سین پیش نظر ہوتا ہی۔

اس کے بعد ہم نے کونٹ الگمان اور ہورن کی یادگار کو دیکھا۔ یہ ایک چھوٹی سی جگہ ہی جس کے گرد لوہے کی سلاخوں کا جنگلہ ہی۔ نیچے ایک فوارہ ہی جس کے دائیں بائیں فلیمش سپاہیوں کے بت بنے ہوئے ہیں۔ اسکے اوپر اگمان اور ہیورن کے دو عظیم الشان مسی بت نصب ہیں جو گویا کہ ساتھ ساتھ قتل گاہ کی طرف جا رہے ہیں۔ ان دو بلجی امرا نے اپنے ملک کی خدمت میں جان دی تھی اسلیے اُن کے بت یہاں نصب کیے گئے اور یہ عزت بخشی گئی۔ بعد ازاں ہم "سان گلوڈ" کا گرجا دیکھنے گئے جو برسلس میں ایک نہایت عالیشان عمارت ہی اور گیارہویں صدی عیسوی کی یادگار ہی۔ اندر سے شیشے کی کھڑکیاں جنپر مسیحی تاریخ کی تصویریں منقوش ہیں نہایت قدیم معلوم ہوتی ہیں۔ رومن کیتھولک ہونے کے باعث اس کے اندر حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی بہت سی مورتیں نصب ہیں یہ قصہ مشہور ہی کہ ان میں سے کسی بت کو ایک زمانہ میں چند یہودی چرا لیگئے تھے تو اس گرجے کی موم بتیاں روئیں اور اُن کی گریہ وزاری کے سبب سے لوگوں نے چوروں کو پکڑ کر قتل کیا تھا۔ جب یہ کہانی مجھ سے بیان کیگئی تو میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف غور سے دیکھا جن میں سے اکثر انگلستان کے نہایت تعلیم یافتہ سوسائٹی کے اشخاص تھے۔ ان میں سے بعض کا مذہب رومن کیتھولک تھا۔ سب کے چہروں سے پایا جاتا تھا کہ دلمیں آمنا صدقنا کہ رہے ہیں خصوصًا ایک مرد بزرگ اور اُن کے بچے جو ہمراہ تھے اس واقعہ کو سن کر ایسے متاثر ہوئے

کر غصہ میں یہودیوں کو بُرا بھلا تک کہنے لگے اس شخص نے ستونوں کے سامنے کی خاک جہاں وہ بان سا۔ رہا تھا خوب اپنے اور اپنے بچوں کے منھ پر ملی اور باہر نکل کر یہاں کا متبرک پانی اپنی آنکھوں اور پیشانی پر اچھی طرح لگایا اور جھک جھک کر نہایت خشوع وخضوع کی حالت میں دعا مانگتا رہا۔

یہاں سے نکلکر ہم چیمبر آف ڈیپوٹیز (CHAMBER-of DePUTIES) کے دیکھنے کے لیے گئے۔ راستہ میں برسلس کے خوبصورت پارک سے ہوتے ہوئے گذرے جہاں پہلے کسی زمانہ میں ایک شکارگاہ تھی اور جہاں سے شہزادہ فریڈرک نے دس ہزار آدمیوں کے ساتھ برسلس میں داخل ہونے کیلیے کئی بار ناکامیابی کیساتھ حملے کیے تھے۔ اب یہاں درختوں کے خوبصورت کنج اور نفیس و نازک فوارے اور مشہور ومعروف بت نصب ہیں۔ یہاں اب خاص وعام موسم گرما کی تیز دھوپ سے پناہ لینے کے لیے سایہ دار درختوں کے نیچے جمع ہوتے ہیں۔ بینڈ بجتا ہے اور رات کے وقت ایک تھیٹر میں فیشن ایبل سوسائٹی کا مجمع رہتا ہے۔ اور رقص وسرود کی مجلسیں ہوتی ہیں۔

اس باغ میں سے ہم محل پارلیمنٹ میں داخل ہوئے۔ اس محل کے سامنے پرستار اور نرگس کے دو خوبصورت بت ایک حوض کے کنارے نہایت خوبصورتی کے ساتھ نصب ہیں اور موسم بہار اور موسم گرما کی دو پریاں کھڑی اپنے اپنے موسم کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔ چیمبر آف ڈیپوٹیز یا بلجیم کا ہاؤس آف پارلیمنٹ اسی باغ کے اندر ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے واقع ہے۔ باہر سے یہ عمارت کچھ عظیم الشان نہیں معلوم ہوتی اور اندر سے بھی ایسی عمدہ نہیں جیسے کہ پیرس یا لندن کے ہاؤسز آف پارلیمنٹ ہیں۔ لیکن اپنی حیثیت کے لحاظ سے نہایت نفیس اور مختصر اور موقع کے لحاظ سے نہایت پرفضا مقام پر واقع ہے اس عمارت کے اندر متعدد کمرے ہیں۔ جہاں ممبر اخبارات وغیرہ

پڑھتے یا بیٹھ کر گپ شپ اڑاتے ہیں۔ اس کی دیواریں نہایت خوبصورت نقش و نگار سے سجی ہوئی ہیں اور ایک ہال ہے جہاں الماریاں ہیں جنمیں بہت خانے ہیں۔ ان خانوں ممبروں کے ٹکٹ لگے ہوئے ہیں کہ اپنی چیزیں اپنے رکھ سکیں اور قریب ہی بلور کے بہت سے دستے لٹک رہے ہیں جنمیں بٹن دبانے سے برقی روشنی ہو جاتی ہے تاکہ وہ اپنے سگار سلگا سکیں۔ بڑے ہال میں آٹھ ستون ہیں اور ارد گرد گیلریاں ہیں۔ اس مقام پر پارلیمنٹ کا اجلاس ہوتا ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ ممبر اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر بول نہیں سکتا بلکہ "اسپیکر" کی کرسی کے پاس جاکر بولتا ہے۔ اکثر گالی گلوچ کی بھی نوبت آجاتی ہے اور تکرار بڑھ کر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی ہے اور بہت کچھ شور و غوغا ہوتا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ یہ ایک ایسی چھوٹا سا ہال ہے جہاں پانچ چھ مختلف اُصولوں اور پارٹیوں کے لوگ جمع ہوتے ہیں اور اپنی اپنی پارٹی کے حقوق کی حفاظت میں جا بیجا حملے کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

اس کے بعد ہم نے وہ عجیب عمارت دیکھی جو محل عدالت کے نام سے مشہور ہے۔ یہ محل ایک ایسے اونچے مقام پر واقع ہے کہ برسلس کے تمام عمارتیں وہاں سے نظر آتی ہیں اور شہر کا ایک بہت اچھا سین آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ شہر کے ایک جانب تو کھپریل کے پرانے مکانات دکھائی دیتے ہیں اور دوسری طرف خوبصورت باغات اور عالیشان عمارتیں ہیں۔ ہر طرف پیچدار سڑکیں اور آدمیوں اور گاڑیوں کے ہجوم کے ہجوم نظر آتے ہیں۔ اس عمارت کو گو میں بہت خوبصورت عمارت نہیں کہہ سکتا تاہم یہ بات مسلمہ ہے کہ "محل عدالت" موجودہ زمانے کی دستکاری کی ایک عجیب و غریب مثال ہے۔ اس کی تعمیر ۱۸۶۶ء میں شروع ہوئی تھی اور ۱۸۸۳ء میں اس عمارت کا افتتاح ایک ایسے موقع پر ہوا جبکہ آزادی بلجیم کی پنجاہ سالہ جبلی تمام ملک میں منائی جا رہی تھی۔ اس عمارت کا رقبہ ۲۷۰,۰۰۰ مربع فیٹ ہے جو سینٹ پیٹر (St Peters) کے گرجے واقع روم سے بھی گوئی سبقت لیگیا ہے۔ اس کی لمبائی ۵۹۰ فیٹ اور چوڑائی ۵۶۰ فیٹ ہے اور تعمیر میں

پچاس ملین فرانک صرف ہوئے ہیں جسکے تین چار کروڑ روپے ہوتے ہیں۔

وقعی پہلی نظر میں یہ ایک ایسی عظیم الشان عمارت معلوم ہوتی ہے کہ شبہ ہوتا ہی کہ شاید اہرام مصری کے بانیوں اور شام کے محلات کی بنیاد رکھنے والوں نے یہاں آکر اپنے دست بازو سے کام کیا ہی اور درحقیقت اس کے بنانے والے کا یہ مقولہ تھا کہ اس عمارت کا نقشہ کھینچتے وقت میری نظر میں شام و مصر کی عمارتوں کی تصویریں پھر رہی تھیں۔ عمارت کی ظاہری صورت ایسی ہی کہ گویا بہت بڑا اہرام ہی جو اونچائی کے ساتھ چھوٹا ہوتا جاتا ہی۔ اس کے اوپر ایک اور چوکور قطعہ ہی جس کے چہار طرف ستون ہیں جو اوپر ایک گول عمارت کو اُٹھائے ہوئے ہیں۔ سب کے اوپر ایک گنبد ہی جس کی اونچائی زمین سے چار سو فیٹ ہی۔ یہ گنبد عمارت کے مقابلہ میں بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہی جو میری رائے میں بہت بڑا نقص ہی۔ ستونوں والی گول عمارت کے گرد بڑے بڑے بت نصب ہیں جو انصاف۔ قانون۔ قوت اور رحم کی مورتیں ہیں۔ اندر داخل ہونے کا دروازہ نہایت عظیم الشان ہی جس کے کنارے پر دو بڑے بڑے ٹھوس تانبے کے پھاٹک ہیں اوپر چڑھنے کیلیے جو زینہ ہی اُس پر بھی بڑے بڑے مشہور لوگوں کے مثلاً ڈیماستھنیز سیسرو وغیرہ کے بت نصب ہیں۔ اس محل کے اندر عدالت کے ۲۷ بڑے بڑے کمرے اور ۲۴۵ دیگر کمرے ہیں اور آٹھ بڑے بڑے کھلے ہوئے دالان ہیں۔ بلجیم سے چھوٹے ملک میں عدالت کی اتنی عظیم الشان عمارت کہ دنیا میں جواب نہ رکھتی ہو مجھے عجیب معلوم ہوئی۔ یہ عمارت بیشک ایسی ہی کہ ملک اس پر ناز کرسکتا ہی۔ اس میں شک نہیں کہ عدالت کی عمارت جو دارالانصاف ہی ایسی ہی ہونی چاہیے تاکہ عوام کی تخیلات پر اثر پڑے اور قومی جبروت اور ملکی شان و شوکت کی یادگار باقی رہے۔ فقط۔

انڈین نیشنل کانگرس کا بائیسواں اجلاس بمقام کلکتہ

۲۶، ۲۷، ۲۸ اور ۲۵ دسمبر کو غیر معمولی کامیابی کیساتھ ختم ہوا۔ ۲۰۰۰ کے قریب ملکی ڈیلیگیٹ اور دس ہزار سے زیادہ وزیٹر تقریباً ہر اجلاس میں موجود ہوتے تھے اور پہلے روز تو حاضرین کی مجموعی تعداد ۲۰ ہزار سے شاید ہی کم ہو۔ مہمانوں کے قیام اور خورونوش کا بلامعاوضہ معقول انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن اس ظاہری کامیابی سے زیادہ قابل قدر وہ

اصلی کامیابی

تھی جو بدخواہانِ ملک خصوصاً انگلو انڈین اخباروں کے زعم کے خلاف کانگرس کو حاصل ہوئی یعنی یہ کہ بسبب نیتوں کے خلوص اور مقصد اصلی کے واحد ہونے کے کانگرس کو ماڈریٹس اور ایکسٹریمسٹ کی ظاہری کشمکش سے بجائے نقصان کے مزید تقویت حاصل ہوئی اور فریق نرم نے فریق گرم کے اختلاف سے متاثر ہو کر باحتیاط مناسب بعض ایسے اصولوں کو منظور کر لیا جن کے بغیر کانگریس کا اثر نہایت کمزور تھا اور گورنمنٹ انکے مطالبہ کو باطمینان کلی نظرانداز کر سکتی تھی۔ چنانچہ مفصلہ ذیل امور وہ ہیں جن کو

کلکتہ کانگرس کے خصوصیات

میں سے شمار کرنا چاہیے۔ مثلاً شخصی قوت کے مقابل میں پبلک کی قوت کا وجود بااثر طریقہ کانگرس میں پہلی ہی بار نمودار ہوا اور اس شان سے نمودار ہوا کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے اور ارباب بینش نے بنگاہ مستقبل شناس معلوم کر لیا کہ جس قوت کے ابتدا میں یہ کرشمے ہیں اس کا آخر کار تمام ہندوستان کے دل پر چھا جانا ایک امر یقینی ہے۔ لاریب فریق گرم کے آغازِ اقتدار کا یہ پہلا نمونہ تھا جس کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ تجویز بائیکاٹ کی منظوری سے یہ اصول قرار پا گیا کہ جب داد و فریاد کی شنوائی نہ ہو تو بجائے عرض معروض کے دیگر

ذرائع مخالفت کا اختیار کرنا بھی جائز ہی اور سودیشی تحریک کی کامیابی کیلیے بوائیکاٹ کا ہونا بھی ضروری ہی۔ اگرچہ فریق نرم کی خاطر سے اس سال سودیشی کے رزولیوشن میں بوائیکاٹ کی جگہ صرف اس کے مفہوم سے کام لیا گیا۔ لیکن ان سب خصوصیتوں سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ کلکتہ کانگرس نے پہلی بار

سلف گورنمنٹ کو اپنا مقصد آخری قرار دے لیا

اور پریسیڈنٹ کانگرس نے بذریعہ لفظ "سوراج" سیلف گورنمنٹ کی تشریح بھی اس طور پر کردی کہ آیندہ کسی کو اس کے مفہوم کی نسبت غلط فہمی پیدا کرنے کی ہمت نہ ہوگی۔ اس حصہ ایڈریس پر اینگلو انڈین اخباروں نے بہت کچھ اعتراض کییے ہیں لیکن ہمارے خیال میں یہی وہ حصہ ہی جس کی بنا پر

ہندوستان کے محترم بزرگ دادابھائی نوروزجی کا ایڈریس

تاریخ کانگرس میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ ورنہ اس کا حصہ ثانی فرسودگی دلائل و خیالات کے عیوب سے اس قدر پر ہی کہ فریق گرم کے قابل دید روزانہ اخبار "بندے ماترم" نے غالباً اسی کی نسبت سے تمام ایڈریس کو یک قلم ناقص کہدینے میں تامل نہیں کیا۔ بیشک وزرائے انگلستان و ہند کی اسپیچوں میں عدل و انصاف یا انسانی ہمدردی کے متعلق نہایت شاندار اور دلفریب فقرے موجود ہیں لیکن ہم کو یہ بھی معلوم ہی کہ اہل ہند کے ساتھ معاملت کرنیمیں یہ فقرے بالکل فراموش کردیے جاتے ہیں یا اُن کے مفہوم کی تاویل کردیجاتی ہی اور ہمارے ساتھ اظہار ہمدردی کا اسکے سوا اور کچھ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم اس فریب التفات کا شکار ہوکر جد وجہد پیہم سے غافل اور صفات بلند خیالی و اولوالعزمی سے ہمیشہ کیلیے محروم ہوجائیں۔ پس اس حال میں کہ گزارش مودب اور استدعائی گدایانہ کو بائیس سال کے تجربے نے بیکار ثابت کردیا ہی۔ اب بھی ہمکو اس قدیم طریق پر قائم

۱؎ اس بحث پر کسی دوسری جگہ مضمون "سودیشی و بوائیکاٹ" کا پہلا نمبر قابل توجہ ناظرین ہی۔

رہنے کو صلاح دینا بالکل بیمعنی ہے۔ ہمارے خیال میں اب وہ وقت آگیا ہے کہ اہلِ ہند

ملک کے حقیقی لیڈر مسٹر تلک کی تجویز سلف ہیلپ

کے مطابق سودیشی سے شروع کرکے اور بائیکاٹ کو ذریعہ بناکر سلف گورنمنٹ کے مقصد آخری کو بکامیابی تمام حاصل کریں۔

کلکتہ کانگرس کے رزولیوشنوں کی فہرست

(۱) تعزیت ڈبلیو سی بانرجی۔ بدرالدین طیب جی۔ آنند موہن بوس

(۲) جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی حالت زار پر گورنمنٹ کی توجہ اور حفاظت کی ضرورت۔

(۳) فوجی اور ملکی اخراجات حکومت کی زیادتی کا شکوہ اور ان کو کم کرکے تعلیم حفظ صحت اور زراعت پیشہ فرقوں کی امداد کے کاموں میں زیادہ روپیہ صرف کرنیکی ضرورت۔

(۴) جوڈیشل اور اگزکٹو اختیارات کی فوری علیحدگی کا تقاضا۔

(۵) فیصلہ پریوی کونسل کے خلاف وقف علی الاولاد کو جائز اور مطابق شرع محمدی قرار دینے کیلیے ایک کمیشن کے تقرر کی درخواست۔

(۶) تقسیم بنگال پر اظہار ناراضی اور اس کی تنسیخ یا ترمیم کا تقاضائے شدید۔

(۷) صوبہ بنگال میں تحریک بائیکاٹ کا جواز اس بنا پر کہ رعایا کو انتظام مملکت میں مطلق دخل نہیں ہے اور گورنمنٹ ان کے دعاوی پر مطلق توجہ نہیں کرتی۔

(۸) سودیشی تحریک کی تائید اور اہلِ ہند سے درخواست کہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کیلیے (۱) دیسی صنعتوں کو قائم کرنیکی بلیغ کوشش کریں اور (۲) دیسی مال کی خریداری اور خرچ بڑھانیکے لیے سودیشی اشیا کو ممالک غیر کی چیزوں پر بہرحال ترجیح دیں یعنی اگرچہ اس میں کچھ نقصان بھی برداشت کرنا پڑے۔

(۹) صیغہ تعلیم کو گورنمنٹ کے زیر اثر کردینے کی پالیسی پر اعتراض اور ابتدائی تعلیم کو بلا فیس اور رفتہ رفتہ جبری کردینے نیز صنعتی تعلیم کی جانب گورنمنٹ کی مزید توجہ کا تقاضا۔

(۱۰) قومی اصول پر خود اہل ملک کے زیر اثر نیشنل ایجوکیشن کے انتظام کی ضرورت۔

(۱۱) سلف گورنمنٹ کا مطالبہ اور اسکے ابتدائی مراحل کے فوری آغاز کا تقاضا۔

(۱۲) ہندوستان سے زرعی ملک میں محاصل زمین پر گورنمنٹ کے مطالبوں کی کوئی حد مقرر ہونیکی ضرورت جیساکہ لارڈ کیننگ اور لارڈ رپن نے تجویز کیا تھا۔ لیکن جس کو لارڈ کرزن نے نامنظور کردیا۔

(۱۳) خدمات ولایت کے متعلق مسٹر گوکھلے کا شکریہ۔

(۱۴) ممبران برٹش کمیٹی کانگرس کا شکریہ۔

(۱۵) کانگرس کانسٹیٹیوشن کی مفصد ذیل امتحانی تجویز صرف ایک سال کیلیے کہ۔

(۱) ہر صوبے میں ایک پراونشل کانگریس کمیٹی قائم ہو (۲) اس کی تجویز سے ہر ضلع میں ڈسٹرکٹ ایسوسی ایشن قائم کیجائے جس کے ذریعہ سے سال بھر تک پولیٹیکل کام جاری رہے

(۳) ہر سال تمام ہندوستان کیلیے ایک اسٹینڈنگ کانگرس کمیٹی مقرر ہوا کرے جو کانگرس کے رزولیوشنوں کو صورت عمل میں لانے اور کانگرس کیطرف سے ضروری امور کا فیصلہ کرنے کی ذمہ وار ہو اور اس کی ممبری کے واسطے علاوہ اس سال کے پریسیڈنٹ اور جنرل سکرٹریوں کے بنگال آسام ۱۰۔ برہما سے ۱۲ بمبئی سے ۸ مدراس سے ۸ صوبجات متحدہ سے ۶ پنجاب سے ۶ اور ممالک متوسط و برار سے ۴ شخص منتخب کیے جائیں۔

(۴) پریسیڈنٹ کے انتخاب کا یہ طریقہ ہوگا کہ جس صوبے میں کانگرس کا اجلاس ہو وہاں کی استقبالی کمیٹی کسی کو اس عہدے کیلیے نامزد کرے اور دوسری پراونشل کمیٹیوں سے مشورہ کرنے کے بعد اگر استقبالی کمیٹی کے کم از کم ۳/۴ ممبر اس نامزدگی کے موافق ہوں تو وہ شخص صدر انجمن بنایا جائے ورنہ اس امر کا فیصلہ سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی پر چھوڑ دیا جائے جسکا فیصلہ آخری ہوگا۔

(۵) کانگرس کا پروگرام طے کرنیکے لیے ہر سال ایک سبجکٹس کمیٹی قائم ہوگی جس میں بنگال آسام و برما سے ۱۵ مدراس سے ۱۵ بمبئی سے ۱۵ صوبجات متحدہ سے ۱۰ پنجاب سے ۱۰ اور ممالک متوسط و برار سے ۱۰ اور جس صوبے میں کانگرس کا اجلاس ہو وہاں سے ۱۰ مزید ممبر لیے جائیں اور ان ممبروں کو کانگرس ڈیلیگیٹ منتخب کریں۔ علاوہ ان ممبروں کے موجودہ اور گذشتہ کانگرسوں اور استقبالی کمیٹیوں کے پریسیڈنٹ جو کانگرس میں موجود ہوں نیز اس سال کے جنرل سکریٹری اور لوکل سکریٹری بھی اکس آفشیو ممبر شمار کیے جائیں۔[۱]

(۶) کانگرس کا آیندہ اجلاس بمقام ناگپور ہو۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا بیسواں اجلاس بمقام ڈھاکہ

بصدارت جسٹس شرف الدین بخوبی تمام ختم ہوا۔ ڈیلیگیٹوں، وزیٹروں اور تماشائیوں کی مجموعی تعداد ۳۰۰۰ سے کم نہ تھی تینتیس رزولیوشن منظور ہوئے جنمیں سے تعزیت کا مبارکباد اور شکریے کے ۱۲ رزولیوشنوں کے علاوہ باقی تجویزیں زیادہ تر مشرقی بنگال کی تعلیمی ضروریات سے متعلق تھیں۔ چونکہ ہندوستان کی نجات کا دارومدار بہت کچھ اہل ہند کے تعلیم یافتہ ہونے پر ہے اس لیے ہمارے خیال میں ہر بہی خواہ ملک کو اس کانفرنس سے ہمدردی رکھنا لازم ہے۔ لیکن باوجود ہمدردی ہم اس کی بعض کوتاہیوں کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ مثلاً اول یہ کہ تعزیت و تہنیت کے رزولیوشنوں کی کثرت وقار کانفرنس کے منافی تھی لیکن جب اراکین کانفرنس نے اس کو جائز ہی سمجھ لیا تھا تو بدرالدین طیب جی مرحوم کی وفات کے متعلق اظہار افسوس نہ کرنا ایک ایسا امر تھا جس کو اگرچہ ہم اتفاقی فروگذاشت سمجھتے ہیں لیکن بدگمان لوگ بلاشبہ تنگدلی و پست خیالی کا بدترین نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ

---

[۱] حسب دستور سابق کلکتہ کانگرس کی بھی اُردو رپورٹ بطور ضمیمہ اردوئے معلے عنقریب شائع کیجائیگی جسمیں کانگرس کے مفصل حالات اور تمام ضروری اسپیچیں درج کیجائیں گی۔

مسلمان لیڈروں کے بیجا خوف یا کسی غیر معلوم سبب سے اہم ترین تعلیمی مسائل ہر سال پیش ہونے سے رہجاتے ہیں۔ سال گذشتہ میں ایجوکیشن کی رپورٹ پر اظہار رائے نہایت ضروری تھا لیکن نہوا۔ اور اس سال ابتدائی تعلیم کے بلا فیس اور رفتہ رفتہ جبری کردیے جانے کا مسئلہ خاص طور پر قابل بحث تھا لیکن اس کیجانب کسی نے توجہ نہ کی۔ بہر حال جو کچھ ہوسکا اسکے بھی ضروری اور مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ نواب صاحب ڈھاکہ کے پولٹیکل طرز عمل سے ہمکو قطعی بیزاری ہی۔ لیکن انصاف کا خون ہوگا اگر ہم مہمانان کانفرنس کیساتھ انکی فیاض میزبانی اور مسلمانان مشرقی بنگال کو تعلیمی پستی سے نکالنے کی حوصلہ مند سعی کا شکریہ واجب ادا کرنے سے قاصر رہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ

آثار زمانہ نے آخرکار مسلمانوں کو بھی پالٹکس میں حصہ لینے پر مجبور کیا اور ڈھاکے کی تعلیمی کانفرنس کے بعد بصدارت نواب وقار الملک بہادر مسلم لیگ کا پہلا جلسہ منعقد ہوا جسکے حسب ذیل مقاصد قرار پائے۔

(الف) مسلمانان ہند کے دل میں برٹش گورنمنٹ کی نسبت وفادارانہ خیالات کو ترقی دینا اور گورنمنٹ کی کسی کارروائی کے متعلق ان میں جو غلط فہمی پیدا ہو اُس کو دور کرنا۔

(ب) مسلمانان ہند کے پولٹیکل حقوق و فوائد کی نگہداشت اور ان کی ضروریات اور خواہشوں کو مودبانہ طریقہ سے گورنمنٹ میں پیش کرنا۔

(س) لیگ کے دیگر مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر مسلمانان ہند میں ایسے خیالات پیدا ہونے دینا جو دوسرے فرقوں کی نسبت معاندانہ ہوں۔

یہ مقاصد اُس "جوہر دو آتشہ جہلیت" یعنی نواب صاحب ڈھاکہ کی تجویز سے بیشک بہتر ہیں جس کا منشاء "تائید احکام گورنمنٹ اور تخریب فتنہ کانگرس" کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

لیکن ان کے قابل تعریف ہونیمیں ہم کو اب بھی شبہ ہی۔ کیونکہ مقصد اول میں جزدآخر کے الفاظ اس قدر مبہم واقع ہوئے ہیں جنسے سوا اس کے اور کچھ نتیجہ نہیں نکلسکتا کہ جس طرح احکام الٰہی درحقیقت مخلوق کی بہبودی کیلیے ہوتے ہیں لیکن جاہل انسان ان میں سے بعض کو بظاہر صورت اپنے خلاف سمجھ لیتا ہی اسی طرح گورنمنٹ کی بھی تمام کارروائیاں دراصل مسلمانوں کے مفید مطلب ہوتی ہیں اور اگر اتفاق سے کوئی کارروائی مسلمانوں کو اپنے اغراض کے خلاف نظر آتی ہی تو یہ نتیجہ ہوتا ہی محض ان کی غلط فہمی اور کوتاہ نظری کا جس کا دور کرنا مسلم لیگ کا فرض ہوگا۔

جو لوگ اظہار وفاداری میں اسدرجہ مبالغے اور گورنمنٹ سے بدگمان ہونے میں اسقدر احتیاط سے کام لینا چاہتے ہوں اُن کو پولٹیکل رفارم کے سرآزاد اور بیباک فرض کو اپنی جانب منسوب کرنیمیں ضرور تامل کرنا چاہیے تھا۔ خیر۔

اب دیکھنا یہ ہی کہ مقصد دوم وسوم کی عملی صورت کیا قرار پاتی ہو۔ اگر ہماری اُمید کے مطابق ان کا مفہوم یہ ثابت ہوگا کہ صرف اختلافی مسائل نیز معاملات مخصوص باہل اسلام میں مسلم لیگ کی پالیسی جدا گانہ قائم ہوگی لیکن متفق علیہ مسائل میں مقاصد کانگرس کی تائید کی جائے گی تو ہم بھی اس لیگ کے خیر مقدم کیلیے تیار ہیں۔ ورنہ بصورت دیگر نواب صاحب ڈھاکہ کی تجویز کے بعد اس کی نسبت بھی ہمکو یہ کہنے میں باک نہو گا کہ "ایں ہم بچہ شتر است"۔

حصۂ نظم

غزل۔ جناب شفق عمادپوری تلمیذ حضرت امیر مینائی

اثر کو ساتھ لیئے کامیاب ہو کے پھری
فلک سے میری دُعا مستجاب ہو کے پھری

صبا نے غنچو نکے بند نقاب کھولدیے
چمن میں نکہت گل بیحجاب ہو کے پھری

بھر آیا دل جو میری بیکسی پہ اُسے قاتل
گلے پہ تیغ رواں آب آب ہو کے پھری

اٹھا کے نکہتِ گیسوئے عنبریں لائی
تیری گلی سے صبا مشکناب ہو کے پھری

یونہیں پھر آیا کئی بار میکدے سے جا کر
پھری جو شیخ کی نیت خراب ہو کے پھری

جلا لیا جو مجھے آ کے اُس مسیحا نے
اجل قریب سے ناکامیاب ہو کے پھری

گئی جو باب اثر تک ستمکشوں کی دعا
ستمگروں کیلیے اک عذاب ہو کے پھری

بھر آئی آنکھ جو نرگس کی اشک شبنم سے
میری نگاہ میں چشمِ پُرآب ہو کے پھری

وہ میگسار تھی ساقی نگاہ مست تیری
کہ ساری بزم میں جامِ شراب ہو کے پھری

خزاں میں چھوٹ کے آئی قفس سے سوئے چمن
خراب بلبلِ خانہ خراب ہو کے پھری

ہے لاجواب شفق مصرعِ جنابِ وحید
پھری جو اُن سے طبیعت خراب ہو کے پھری

غزل حضرتِ ضامن کنتوری

جفا کرے نہ تھا طالب میں تم سے مہربانی کا
مگر اس بے رخی نے لطف کھو دیا زندگانی کا

خیالِ یار گھبرایا ہوا ہے تنگیٔ دل سے
اس اجڑے گھر میں کچھ ساماں نہیں ہے میہمانی کا

نقابِ عارض محض تھی پہلے مگر تیری اداؤں نے
سکھایا ہے قضا کو یہ طریقہ جانستانی کا

سنبھل کر پانوں رکھنا بزم میں رندوں کی اے واعظ
بچھا ہے دام یاں موجِ شرابِ ارغوانی کا

نہیں نہ ہمار غنائی قناعت پستیٔ ہمت
مگر بغیرتی کیوں ہو وسیلہ کامرانی کا

دو عالم کی بقا کا ہو فنائے عشق سرآ
یہ مرنا غازہ ہی روئے حیاتِ جاودانی کا

نظر یہ انقلاب آئے سرائے دہر میں ضامن
کہ ہو غم کا محل وہ دل جو گھر تھا شادمانی کا

غزل حسرت موہانی

ازبسکہ نازِ یار بشکلِ عتاب تھا
جو کامیاب تھا وہی ناکامیاب تھا

اب آرزوئے شوق کی بیباکیاں کہاں
یعنی وہ سب لوازمِ عہدِ شباب تھا

محرومیوں میں میری وفا بیمثال تھی
خودداریوں میں تیرا ستم لاجواب تھا

محفل میں اسکی رنگِ محبت کی تھی نمود
جو تھا سو بادہ ہائے وفا کا خراب تھا

حالت عجیب تھی دلِ بے اختیار کی
بزمِ خیال میں جو وہ بت بیحجاب تھا

اب میں ہوں اور تغافلِ بیپایاں کے گلے
وہ میں کہ موردِ کرمِ بے حساب تھا

حیرانیٔ نگاہ سے حسرت جمالِ یار
تھا پردۂ حجاب میں گو بے نقاب تھا

غزل جناب محشر لکھنوی

ہجومِ گریہ میں یاں دل میں اب لہو ہی نہیں
وہاں اجازتِ تشریحِ آرزو ہی نہیں

یہ کہہ کے آئے ہیں وہ میرے قتل کرنیکو
کہ آج تیغ نہیں یا رگِ گلو ہی نہیں

عبث ہی دیر و حرم تک وہ دوش آ سکی
جسے سلیقۂ اظہارِ آرزو ہی نہیں

مبارک اُس کو ہو محرومیٔ ستمگاری
جسے محبتِ معشوق تندخو ہی نہیں

بزورِ دستِ اجل اپنا خلعتِ ہستی
ہوا یہ چاک کہ گنجایشِ رفو ہی نہیں

حیاتِ رفتہ نہیں دوست جسکو پا نہ سکیں
مگر بحدِ کمال اپنی جستجو ہی نہیں

نظارۂ درِ دیوارِ کعبہ کیا کیجے
ہزار جلوے ہیں پیشِ نگاہ تو ہی نہیں

جہانِ شوق کبھی دل کے ساتھ تھا محشر
وہ جب سے مر گیا اب کوئی آرزو ہی نہیں

غزل حضرت راز لکھنوی

نشۂ مے سے نہ تھے ہوش بجا بھول گئے
بات کی بات بھی کچھ یاد رہی یا بھول گئے

میرا افسانہ اُنہیں اور تو سب یاد رہا
حرفِ مطلب جب آئے تو کہا بھول گئے

میری قسمت میری تقدیر مقدر میرا
دل کے دیتے ہی وہ سب عہدِ وفا بھول گئے

رازؔ افسانۂ غم آپکا سب حرف بحرف
پہلے تھا یاد مگر اب بخدا بھول گئے

رجسٹرڈ نمبر ۱۰۵

اردوی معلی

جلد ۳	بابت ماہ فروری و مارچ ۱۹۱۰ء	نمبر ۲ و ۳

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی۔ بی اے

فہرست مضامین

ضمیمہ اردوی معلی۔ دیوان مصحفی ان خریداروں کے لیے جو دو سالانہ دیتے ہیں

مقام اشاعت دفتر اردوی معلی علی گڑھ
علی محمد خاں کے اہتمام سے
مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرۃ الشعرا

حضرت میرزا مظہر جانجاناںؒ

(۱۱۱۱ھ تا ۱۱۹۵ ہجری)

نام و خاندان مرزا جانجاناں نام مظہر تخلص۔ اصل انکی شرفائے بخارا سے ہے۔[1] والد ان کے مرزا جان جانی تخلص عالمگیر کے دربار سے متعلق تھے نسب[2] اُن کا باپ کی طرف سے محمد ابن حنیفہ سے ملتا ہے کہ حضرت علی کے بیٹے تھے۔ ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں دادا بھی دربار شاہی میں صاحب منصب تھے۔ پردادا سے اکبر بادشاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں۔ مرزا جان ازراہ محبت بیٹے کو جان جاناں کہکر پکارتے تھے اسی سبب سے ان کا نام ہی جانجاناں مشہور ہوگیا۔ لیکن آبحیات میں ہے کہ[3] اُن کے والد نوکری چھوڑ کر دلی کو پھرے۔ یہ کالاباغ علاقہ مالوہ میں ۱۱ رمضان کو جمعہ کے دن پیدا ہوئے عالمگیر کو خبر گذری۔ آئین سلطنت تھا کہ اُمرا کے ہاں اولاد ہو تو حضور میں عرض کریں۔ بادشاہ خود نام رکھیں یا پیش شدہ ناموں میں سے پسند کریں ...... غرض عالمگیر نے کہا کہ بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے۔ باپ مرزا جان ہے۔ اس کا نام ہمنے جانجاناں رکھا۔ پھر اگرچہ باپنے شمس الدین نام رکھا مگر عالمگیری نام کے سامنے نہ چمکا۔ مرزا جان کسی سبب سے عالمگیر سے رنجیدہ ہوکر اکبرآباد میں جابسے تھے اور آخرکار وہاں سے بھی نقل مکان کرکے دہلی کو مسکن قرار دیا۔ اور وہیں مرزا کو ۱۶ برس کی عمر میں چھوڑ کر انتقال کیا۔[4]

سلسلۂ باطنی والد کے انتقال کے بعد اُنھوں نے طریق فقر اختیار کیا اور کسب باطن

[1] تذکرہ کار سندیلیسی ص ۳۰۱ [2] آبحیات آزاد ص ۱۴۰ [3] تذکرہ کار سندیلیسی ص ۱۵۱ [4] تذکرہ سندیلیسی ص ۱۴۱

حضرت سید نور محمد بداونی نقشبندی مجددی قدس سرہٗ سے کرکے ۱۲ برس کی محنت شاقہ
کے بعد درجہ کمال پر فائز ہوئے۔ چنانچہ ان کا سلسلہ اس وقت تک باقی ہو۔ ہزار ہا مسلمان
بلکہ ہندو بھی اُنکے مرید تھے۔ جس کا سبب یہ تھا کہ غلبۂ تصوف کی بنا پر ان کے دل میں تعصب
کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ یہ ہنود کی بابت اہل شرک ہونے کے قائل
نہ تھے بلکہ ان کو اہل توحید جانتے اور بتوں کی پرستش کو ارباب تصوف کے تصور شیخ
کے مانند خیال کرتے تھے۔

اخلاق و عادات حضرت میرزا مظہر فقیرمنش صاحب درد حسن دوست نازک مزاج
قناعت پسند اور خوش مذاق تھے۔ چنانچہ فتح علیشاہ اپنے تذکرہ ریختہ گویاں مولفہ ۱۱۶۲ھ
میں لکھتا ہو کہ "از بدو حیات الی یومنا ہذا ..... از بلند مشتی بتوکل و انزوا بسر بردہ و از راہ ہمتی
سر استغنا بپادشاہ و وزیر فرو نساختہ تکیہ مسند فراغت و مربع نشین چار بالش عزت است"
اور منشی کریم الدین ترجمہ تاریخ شعرائے اُردو مطبوعہ ۱۸۴۸ء میں اپنے زمانے کی زبان میں
لکھتے ہیں کہ "نفاست اور نزاکت اسقدر مزاج میں تھی کہ اس کے بیان کرنیکے واسطے ایک
دفتر درکار ہی۔ کہتے ہیں کہ اُن کے مکان میں کوئی شے بدزیب یا بے قرینہ نہ رکھی دیکھی
اگر مرزا بازار کو بارادہ سیر آتے تھے اور راہ میں کسی غریب کی چارپائی خراب یا جھلنگا پڑا
پاتے اُسی جا بیٹھ جاتے اور کہتے کہ جب تک یہ درست نہو لیگی میں آگے نہ جاؤنگا۔
کوئی نواب عالیقدر اُن کی ملاقات کیواسطے ایک روز آیا تھا اُس نے جھجر میں سے
پانی پیکر آبخورا ٹیڑھا رکھدیا تھا۔ اُس سے خفا ہوئے اور کہا کہ تو بالکل گدھا ہی۔ کس
بیوقوف نے تجھے نواب بنا دیا ہی آبخورہ سیدھا رکھنا بھی نہیں آتا۔ مرزا کی یہ حالت تھی
کہ اگر کوئی شخص بے انتظام یا بدزیب پاتے فوراً مثل ماہی بے آب تڑپنے لگتے۔ ثقہ
لوگوں کی زبانی سُننے میں آیا ہی کہ مولوی غلام یحییٰ جن کی تصنیف سے ایک رسالہ
مسمّی غلام یحییٰ حاشیہ میرزاہد پر ہی بسبب الہام اور ہدایت خواب کے اُن سے

بیعت کا ارادہ کر کے شاہجہاں آباد میں آیا تھا۔ اس کی ڈاڑھی بہت بڑی انبوہ دار تھی
جمعہ کے دن جامع مسجد میں مرزا سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے بسبب اس کے کہ نفاست
طبیعت میں بہت رکھتے تھے مولوی مذکور کی ڈاڑھی بے زیب پاکر ارشاد کیا کہ اگر مجھ سے
بیعت کیا چاہتے ہو اور کچھ کسب باطن مجھ سے منظور ہو تو ڈاڑھی کو ترشوا ڈالیے۔ صورت
بھلے مانسوں کی بنائیے۔ یہ ریچھ کی صورت اپنے پسند نہیں۔ چونکہ یہ مقولہ اُن کا خلاف
شرع تھا مولوی مذکور نے نہ مانا اور ارادہ بیعت کا فسخ کر کے جامع مسجد میں اقامت کی
پھر خواب میں معلوم ہوا کہ اگر کچھ تجھکو کسب باطن منظور ہے تو مرزا کا کہنا مان لے یہی خواب
تین روز تک دیکھا کہ ایک بزرگ خواب میں یہ کہتا ہے کہ مرزا جو کہے سو مان لے۔ پھر
لاچار ہو کر مرزا سے ملاقات کی آپنے پھر وہی ارشاد کیا کہ طالب اور مطلوب اور مرید
اور مرشد میں مناسبت چاہیئے۔ مرزا کی ڈاڑھی بہت چھوٹی تھی۔ خشخاشی ڈاڑھی
رکھتے تھے۔ لاچار ہو کر مولوی غلام یحیی نے ڈاڑھی کتروائی۔

وضع و قطع و طرز گفتگو سید انشاء اللہ خاں ایک مرتبہ مرزا کی ملاقات کو تشریف
لیگئے تھے اس کا حال دریائے لطافت میں اس طور پر لکھا ہے کہ "خط را تراشیدہ و
جامۂ ململ ڈھاکہ پوشیدہ۔ دستار سرخ باندھنو بر سر گذاشتم و دیگر لباس ہم ازیں قبیل
و از سلاح آنچہ با خود گرفتم کٹار بسیار بخوبی بود کہ بکمر زدہ بودم۔ باین ہیئت بسواری فیل
روانہ خدمت سراپا افادت ایشاں شدم۔ چوں بالائے بام کہ کیول رام بانیہ متصل
جامع مسجد ساختہ پیشکش مرزا صاحب کردہ بود برآمدم دیدم کہ جناب معزی الیہ باپیراہن
و کلاہ سفید و دوپٹہ ناسپالی رنگ بصورت عموسہ بر دوش گذاشتہ نشستہ اند۔ بکمال
ادب سلامے بر ایشاں کردم از فرط عنایت و کثرت مکارم اخلاق کہ شیوۂ ستودۂ
بزرگان خدا پرست است بجواب سلام ملتفت شدہ برخاستند و سر این بے لیاقت
در کنار گرفتہ پہلوئے خود جا دادند۔"

سید انشا رنے عرض کیا کہ "ابتدائے سن صبا سے تا اوائل ریعان اور اوائل ریعان سے الی الآن بہ اشتیاق مالا یطاق تقبیل عتبۂ عالیہ نہ بحدے تھا کہ سلک تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے لہذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں"

مرزا صاحب نے جواب میں فرمایا کہ "اپنے تئیں کو بھی بدو طفیل سے تمہیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست اور مجالست رہا کی ہو"

تصانیف مرزا کی تصانیف میں سے ایک دیوان فارسی ہو جسکی نسبت کہا جاتا ہی کہ ۱۱۵۰ھ میں ۱۰ ہزار شعر میں سے ایک ہزار شعر انتخاب کیا تھا۔ اسی واسطے اکثر غزلیں ناتمام اور بے ترتیب ہیں[۵۱]۔ لیکن درحقیقت اس بے ترتیبی کی ایک وجہ اور بھی ہے جسے فتح علی الحسینی الگردیزی نے اپنے تذکرہ ریختہ گویاں میں اس طرح پر لکھا ہی کہ "از آنجا کہ از علم فقہ و حدیث حظے وافر وارد و از کتب سیر و تواریخ بہرۂ تمام میرسد از بلند ہمتی بہ شعر و شاعری فرو دمی آید و ایں شغلہ با را سرمایۂ افتخار نے انگار د چنانچہ اکثر از اشعارش از راہِ بے پروائی از صفحۂ خاطر محو شدند و بر خے از عدم توجہ واعتنا باین فن مہجور و ابتر گشتند"۔ فتح علیشاہ کی یہ رائے مرزا کے اردو کلام پر فارسی سے بھی زیادہ صادق آتی ہی کہ اس میں سے چند غزلوں اور اشعار کے سوا آج اور کچھ بھی دستیاب نہیں ہو سکتا۔

فارسی دیوان اور اردو کلام کے علاوہ اساتذہ فارس کے اشعار کا ایک مختصر انتخاب موسوم بہ خریطۂ جواہر بھی مرزا سے یادگار ہی جو کسی زمانے میں چھپ بھی چکا ہی۔ اور بقول مولوی محمد حسین آزاد حقیقت میں خریطۂ جواہر ہی۔ اس کے دیکھنے سے انکی سخن فہمی اور خوبی انتخاب کا حال واضح ہوتا ہی افسوس کہ اب وہ بھی کمیاب ہو گیا ہی۔

---

[۵۱] آبحیات آزاد صفحہ ۱۴۵۔

آزاد خیالی و بے تعصبی مرزا صاحب ہندوستان کے مشاہیر صوفیہ کرام میں سے تھے۔ لیکن عام صوفیوں کی روش کے خلاف اُن کے بعض عقائد اور خیالات کی آزادی کا حال معلوم کر کے تعجب ہوتا ہی نقشبندی طریق کے پیرو تھے لیکن ڈارھی کتروانے کو ناجائز سمجھنا تو درکنار آپ نے مولوی غلام یحیٰی کو بیعت کیوقت خود ڈارھی کم کرنے پر مجبور کیا۔ اور ہندوؤں کی بت پرستی کو ملایان وقت کے عقیدے کے بالکل خلاف، تصور شیخ سے مشابہ قرار دیا۔ سُنّی مذہب تھے لیکن محبت اہل بیت کا یہ حال تھا کہ انکی شہادت کے متعلق بھی بعض لوگوں کا یہ خیال ہی کہ[۱] "مرزا صاحب چونکہ اکثر اشعار حضرت علی کی مدح میں کہا کرتے تھے اس پر بگڑ کر کسی سُنّی نے یہ حرکت کی۔

نکرد مظہر ما طاعتے و رفت بخاک
نجات خود بہ تولّائے بو تراب گزاشت

اور صاحب آب حیات لکھتے ہیں کہ جد مرحوم ایک اردو کا شعر ان کے نام سے پڑھا کرتے تھے

ہوں تو سُنّی پر علی کا صدق دل سے ہوں غلام
خواہ ایرانی کہو تم خواہ تورانی مجھے

لیکن یہ محبت قلبی محبت تھی جسکو بدعات عوام سے کچھ واسطہ نہ تھا۔

شہادت چنانچہ اُنکی شہادت کا اصل واقعہ کار سند میتی میر عبد الحی تاباں کی زبانی، جو اُن کے خاص اور منظور نظر مرید تھے، ان الفاظ میں بیان کرتا ہی کہ[۲] "وہ اپنے مکان پر بیٹھے ہوئے تعزیے شیعوں کے دیکھتے تھے۔ اس اثنا میں وہ دیکھ کر چلے بلکہ اُنہوں نے یہ کہا کہ "لکڑی کی کھپچیوں کی تعظیم کرنی اور سجدہ کرنا واہیات بات ہی"۔ یہ ناگوار باتیں علم بردار وغیرہ اپنے فرقے کے بدلا لینے کے درپے ہوئے۔" اور ساتویں محرم کی تھی کہ رات کیوقت ایک شخص مٹھائی کی ٹوکری ہاتھ

---

[۱] تذکرہ حکیم قدرت اللہ خان قاسم از آبحیات [۲] تاریخ شعرائے ہند مترجمہ منشی عبد الکریم و ڈاکٹر فیلن

لیے آیا۔ دروازہ بند تھا آواز دی اور ظاہر کیا کہ میں مرید ہوں۔ نذر لیکر آیا ہوں۔ وہ باہر نکلے تو ایک قرابین ماری کہ گولی سینہ کے پار ہوگئی۔ وہ تو بھاگ گیا لیکن انہیں زخم کاری آیا۔ تین دن تک زندہ رہے۔ اس عالم اضطراب میں لوٹتے تھے اور اپنا ہی شعر پڑھتے تھے۔

شعر

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن — خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

یہ تین دن نہایت استقلال اور ثابت قدمی سے گزارے بلکہ جب شاہ عالم بادشاہ کو خبر پہنچی تو بعد تحقیقات کے کہلا بھیجا کہ قاتل نہیں ملتا نشان دو تو ہم اُسے سزا دیں۔ جواب میں کہا کہ فقیر کشتۂ راہ خدا ہیں اور مرشے کا مارنا قتل نہیں ہے۔ قاتل ملے تو آپ سزا نہ دیں یہاں بھیجدیں۔ آخر دسویں کو شام کیوقت دنیا سے انتقال کیا۔ بہت لوگوں نے تاریخیں لکھیں۔ مگر اوّل درجے پر میر قمرالدین منّت کی تاریخ ہے جس کا مادہ خاص الفاظ حدیث ہیں اور اتفاق یہ کہ موزوں ہیں۔ عاش حمیداً۔ مات شہیداً۔

دلّی میں چتلی قبر کے پاس گھر ہی میں دفن کر دیے گئے کہ اب خانقاہ کہلاتی ہے قبر پر اُنھیں کا شعر لکھا ہے۔

شعر

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے — کہ این مقتول را جز بیگناہی نیست تقصیرے

تاریخ مرزا سودا نے بھی کہی۔

مرزا کا ہوا جو قاتل اک مرتد شوم — اور اُنکی ہوئی خبر شہادت کی علوم
تاریخ از روے درد یہ سُن کے کہی — سودا نے کہ ہائے جانجانان مظلوم

۱۱۹۵ھ

مرزا رفیع الدین سودا اور میر قمرالدین منّت دونوں شیعہ مذہب تھے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہر شخص کو یہ یقین تھا کہ مرزا صاحب نے تعزیوں کی نسبت جو کچھ کہا وہ اپنی فطری آزاد خیالی کی بنا پر کہا تھا نہ کبھی تعصب کے خیال سے ورنہ یہ دونوں حضرات اُن کو شہید اور مظلوم نہ ٹھہراتے۔

مرید اور شاگرد حضرت شاہ غلام علی دہلوی قدس سرہٗ کے علاوہ جو خلیفہ اور مرید خاص تھے اور جن کا سلسلہ اس وقت تک قائم ہے اور بھی آپ کے سیکڑوں مرید تھے جنھیں سے میر عبدالحی تاباں اور ب و ن لعل بیدار دنیائے شاعری میں بھی مشہور ہیں[۱] شاگردوں میں قریب قریب کل صاحب دیوان اُستاد گذرے ہیں۔ مثلاً۔

مظہر

حزیں | یقین | بیاں | حسرت | شاعر

(۱) خواجہ احسن الدین خان بیاؔن دہلوی (۲) انعام اللہ خاں یقیںؔ (۳) میر محمد حیات حسرتؔ دہلوی (۴) میر باقر حزیںؔ (۵) خواجہ کمال الدین شاعرؔ جن میں سے بیاؔن کا تذکرہ اردوئے معلیٰ کے کسی گذشتہ پرچے میں ہوچکا ہے اور حزیںؔ و شاعرؔ یقینؔ و حسرتؔ کا مختصر ذکر اور اُن کے دواوین[۵] کا انتخاب اس مضمون کے آخر میں درج کیا جائیگا۔

حضرت میرزا مظہر کی شاعری

حضرت میرزا مظہر کی شاعری کے باب میں مصحفی کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ "ہنوز دور دور الہام گویاں بود اوّل کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست .... فی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ باعتقاد فقیر مرزا است بعدہٗ انتعش بدیگراں رسیدہ"[۲]

اس بیان سے ثابت ہوگیا کہ ریختہ گوئی کی ابتدا کرنیوالوں میں سے حضرت مرزا صاحب بھی مرتبۂ بلند رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کا زمانہ دور فارسی گویاں والہام گویاں سے بالکل متصل تھا۔ اس لیے اُنکی ابتدائی اُردو غزلوں میں فارسی لفظوں اور ترکیبوں کا اسقدر غلبہ ہوتا تھا کہ ایک موقع پر مرزا رفیع سوداؔ اسکی ہجو میں لکھتے ہیں۔ ۵

[۵] ان سب شاعروں کے دیوان دفتر اُردوئے معلیٰ میں موجود ہیں۔ حسرت۔ [۲] تذکرۂ شعرائے مصحفی قلمی۔

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ — سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
آگاہ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ — واقف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹ کا
سنکر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ یہ ہے — اور ریختہ بھی ہے تو فیروز شہ کی لاٹ کا
قصہ اس کا حال یہی ہے جو سچ کہوں — کتا ہے دھوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

سودا کی اس ہجو میں مبالغہ ضرور ہے لیکن اس کی صحت میں شبہ نہیں۔ ایہام گوئی کے عیب سے مرزا صاحب نے اپنے کلام کو بچانے کی بہت کوشش کی ہے لیکن اُس زمانے کے رنگ سے بالکل قطع نظر کر لینا اُن کے اختیار میں نہ تھا۔ چنانچہ ان کے علاوہ ان کے شاگردوں کے دواوین میں بھی ایہام گوئی کی عجیب و غریب مثالیں موجود ہیں جنمیں سے چند بطور مشتے نمونہ از خروارے ہم آگے چلکر درج کریں گے۔

مرزا کے اُردو کلام کے متعلق پہلے ہی بیان ہو چکا ہے کہ اس کا بہت سا حصہ ضائع ہو گیا۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ اس موقع پر ہم اُن کی صرف اُن چند غزلوں کے انتخاب پر اکتفا کرتے ہیں جو مختلف تذکروں اور بیاضوں سے دستیاب ہو سکیں البتہ ان کے شاگردوں کے دواوین سے متعدد غزلیں نقل کرینگے جن کو حضرت مرزا صاحب ہی کے کلام کا نمونہ سمجھنا چاہیے کیوں کہ شاگردوں کی زبان اور انداز بیان میں اُستاد کی روش سخن سنجی سے بہت ہی کم اختلاف ہے۔

(۱) نمونہ کلام فارسی بطور تبرک

آسماں از صبح تا صبح دگر قربان اوست — ویں قمر ہر شب کہ میگردد بلا گردان اوست
گیرم نام لب یار میرزا مظہر — شراب یا دمدہ جان روزہ دار مرا
ما از لب قلیان کسے کام گرفتیم — آخر ز لبش بوسہ بہ پیغام گرفتیم

(۲) نمونہ ریختہ

چلے[۱] اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا — نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

[۱] ماخوذ از آبحیات آزاد۔

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی بسر کرتے — اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا — ڈبایا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خاندان اپنا
رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی — مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشق بدگماں اپنا
مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بیکس کی غربت پر — کہ جن نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا
جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے — غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا
کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو بے ظالم — کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جانجاں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا — لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
لوگ کہتے ہیں موا مظہرِ بیکس افسوس — کیا ہوا اس کو وہ اتنا کبھی بیمار نہ تھا

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے — کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو — یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے
نہیں آتا اسے تکیہ پہ آرام — یہ سر پاؤں سے تیرے ہل رہا ہے

اگر ملیے تو خفت ہے وگر دوری قیامت ہے — غرض نازک دماغوں کو محبت سخت آفت ہے
کوئی لیوے دل اپنے کی خبر یا دلبر اپنے کی — کسی کا یار جب عاشق کہیں ہو کیا قیامت ہے

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار — ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور — کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار
نرگس و گل کی دیکھو کلیاں کھل جاتی ہیں سب — پھیر ان خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو کیا اب کام ہے گلشن سے لیک — جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار
شاخ گل ہلتی نہیں یہ بلبلوں کو باغ میں — ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

تجلی گر تری پست و بلند ان کو نہ دکھلاتی — فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی
حنا تیری کفِ پا گر نہ اس شوخی سے سہلاتی — یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں انہوں کی نیند کیوں جاتی

لہ ماخوذ از تذکرہ فتح علیشاہ قلمی

الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے مینہ نہ برساتی

اتنی فرصت دے کہ رخصت ہولیں اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آزاد ہم

نہیں کچھ غم کہ کیوں ملتا نہیں یہاں مجھ سے ملنے میرا
کہ میں روتا ہوں دل کی بیکسی پر آگئے دل میرا

الٰہی مت کسو کے پیش رنج انتظار آوے
ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

مندرجہ بالا انتخاب کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہجو سودا کا مضمون حضرت مرزا صاحب کے ابتدائی کلام پر صادق آتا ہو تو آتا ہو بعد کی غزلیں اپنی بے تکلفی اور صفائی کے رنگ میں اپنی آپ ہی نظیر ہیں۔

مختصر حال و انتخاب کلام شاگردان حضرت میرزا مظہر رح

(۱) حزین دہلوی

میر محمد باقر نام حزیںؔ تخلص میرزا مظہر رح کے شاگرد بھی تھے اور مرید بھی چنانچہ دیوان میں جہاں کہیں استاد کا ذکر کیا ہے اس سے ان کے کمال اخلاص و عقیدت کا پتا لگتا ہے۔

ط

جس طرح جی چاہتا ہے ہو نہیں سکتی حزیںؔ
حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

اے حزیںؔ شکر کہ ہے مصحف ارباب خیال
فیض سے حضرت استاد کے دیوان میرا

مصائب روزگار سے تنگ آ کر بربنائے افسردہ خاطری ترک وطن کر کے عظیم آباد میں جا رہے تھے۔ علی ابراہیم صاحب تذکرہ مشہور اُن سے بخوبی واقف تھا۔ اُن سے ایک دیوان مع قصائد یادگار موجود ہے جس میں سے چند غزلوں کے منتخب اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

جو ہیں آنکھوں کے مخمور اُن کو میخانے سے کیا نسبت
نگہ کے ہیں جو تشنہ اُن کو پیمانے سے کیا نسبت

خبر لے یا نہ لے صیاد ہمکو دام میں مرنا
گرفتار وفا کو آب اور دانے سے کیا نسبت

ہوا ہی تو عزیب دیوانہ ان شہری غزالوں کا
تجھے صحرا سے اب کیا کام ویرانے سے کیا نسبت

نہ ہو نا عشق ہی یا ملائے نالاں کے نہیں لائق
فغاں کا ضبط کرنا دردمنداں کے نہیں لائق

تحمل رکھتی ہی ہم کو ناتوانی جور کے سہنے سے
یہ تھوڑا سا ہوا اُس تیر مژگاں کے نہیں لائق

اگر دو دن جنوں رکھتا ہی جا وادی میں مجنوں کی
حزیں تجھ سے دیوانہ پھر بیاباں کے نہیں لائق

لطف سے سرسبز کر اپنے محبت کا چمن
خشک رہتا ہی وفا بن جان الفت کا چمن

قرض ہوگی صبا تیرے شہید دشت سے لہو
تب کرے گی حشر میں رنگین قیامت کا چمن

خاک پر میری تو رشح ست کر اے ابر بہار
ہو رہا ہی اشک سے سیراب حسرت کا چمن

ملکے میں ان کو خط سے خط اٹھاتا ہو حزیں
سیر کرتا ہوں خدا کی دیکھ قدرت کا چمن

آئینہ خوباں کے منہ پر خودستائی کیا کرے
جب صفا عارض کی دیکھے خودنمائی کیا کرے

بیطرح دل پر گراں آنے لگے ہیں جور و ظلم
دیکھئے ہم سے تری یہ بیوفائی کیا کرے

نہ ہوتا اسقدر خوباں میں گرد تند خو نازک
تو کب ہوتی ہماری شاعری کی گفتگو نازک

(۱۲) شاعر

خواجہ کمال الدین نام شاعر تخلص یہ بھی مرزا مظہر کے مرید اور صاحب دیوان شاگرد تھے۔ زیادہ حال ان کا تحقیق نہیں ہوا اسلیے مجبوراً ہم ان کے دیوان سے چند غزلوں کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

پھبتا ہی کیا یہ تجھکو اے یار مسکرانا
ٹک واسطے خدا کے یکبار مسکرانا

غنچوں کو اے ستمگر تیرے دہن کے آگے
ہسننا تو ایک طرف ہی دشوار مسکرانا

شاعر ہی ہیچ گوئی اپنی پہ آپ قائل
یار ورنہ اس کے سُنکر اشعار مسکرانا

کس سے جا کر کروں تری فریاد
تو ہی دے آپ اپنے ظلم کی داد

جا سکے تو بھی نہ یہ جنوں میرا
رگ جاں کھول دے اگر صیاد

شاعر اگر تری غلامی میں
دونوں عالم سے ہوگیا آزاد

تڑپے وہ قاتل اگر بہ ادا و ناز　　عالم کو قتل عام کرے ہر ادا و ناز
تصویر اُس کی مانی و بہزاد کھینچ کھینچ　　آخر تھکے ہوا نہ مصوّر ادا و ناز
شاعر ہزار عشوہ گر دنیں وہ ایک ہے　　ایسا تو اور کوئی نہیں در ادا و ناز

اب نعش مری پر جو نہیں کچھ ستم تیغ　　شائد کہ سُنا اُس نے کہیں نام دم تیغ
زخموں کی ترقی کا مزا قتل کرے ہے　　کھاؤں ہیں غم ناز ترا یا کہ غم تیغ
پھنس رہنے سے ہر زخم میں قاتل تھود بتنگ　　چسپید گئی شوق ہے کیونکر نہ بجے تیغ[لہ]

تھا دل سو پھنس رہا ہے ہمارا بدام زلف　　اب ہو گئی زباں بھی گرفتار دام زلف
پیری کی صبح ہو تو کہاں پھر یہ دھوم دھام　　نادان تو یہی جان غنیمت ہے شام زلف
عارض پہ اُسکے تِل نہیں دل ہے جلا ہوا　　شاعر جو مدتوں سے پڑا تھا بکام زلف

کیوں نہ ہووے بہار آنکھوں میں　　ہے مرا گلعذار آنکھوں میں
شاعر آنسو نہ پوچھیو ہرگز　　میں نے ان بیقرار آنکھوں میں
ق
یار کی نذر کو یہ رکھے ہیں　　گوہر آبدار آنکھوں میں

یار دل کو لیے ہی جاتا ہے　　مجھ کو بیدل کیے ہی جاتا ہے
بول اُٹھا درد عشق سُنکے طبیب　　یہ مرض جی لیے ہی جاتا ہے
فکر چاک جگر تو کرنا صبح　　جیب کو کیا سیے ہی جاتا ہے
اپنی سو سو مجھے سُناتا تھا　　بات میری پیے ہی جاتا ہے
آہ تو کس اُمید پر شاعر　　ہجر میں یوں جیے ہی جاتا ہے

ہجر کی تو شب میں تھا جینا بدشواری مجھے　　مل گئی بارے بھلی یہ آہ بیچاری مجھے

کیا کیا اثر دیے ہیں بتوں کی نگاہ کو　　یارب عطا ہو کچھ تو ہماری بھی آہ کو

[لہ] "خم تیغ"، "دم تیغ" کے ساتھ "بجے تیغ" کے قافیے کو شاعر نے یکسانی آواز کے لحاظ سے جائز قرار دیا ہے اور ہمارے نزدیک اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے

کس شام ہجر کا ہمیں ہوا گذارا | یوں ہی چراغ کب تھا ہلکے دل ہمارا

(۴۳) حسرت دہلوی

میر محمد حیات دہلوی حسرت تخلص مشہور بنام ہیبت قلی خان' نواب شوکت جنگ والد اُن کے نواب صولت جنگ۔ صوبہ دار پورنیہ بنگال نواب سراج الدولہ کی خدمت میں بھی رہے تھے۔ اور خود حسرت ؁۱۱۹۰ھ میں نواب مبارک الدولہ میر مبارک علی خاں صوبہ بنگال کے افسروں میں سے تھے۔

انکی بدیہہ گوئی' حاضرجوابی۔ ظرافت اور دقیقہ رسی کا افسانہ تذکروں کے ذریعہ سے ابتک باقی ہی ؁۱۲۱۱ھ میں انتقال کیا۔ اور دیوان اُردو کے علاوہ ایک قصہ طوطی نامہ یادگار چھوڑا۔ ذیل کی چند غزلوں کے منتخب اشعار ان کے دیوان سے نقل کیے جاتے ہیں۔

ہی یاد تجھسے میرا وہ شرح حال دینا | اور سُن سُن اسکو تیرا ہنس ہنس کے ٹال دینا

قید الفت میں ہمیں لا پہلے وابستہ کیا | پھر تیغ بے نیازی سے جگر خستہ کیا

سیر رکھتا ہی ہمارا شیوۂ دیوانگی | عشق نے داغ جنوں سے ہمکو گلدستہ کیا

اسکی مژگاں کی رہیں کیا زیاں ہمسے سدا | اسکے ابرو نے جگر کو چاک پیوستہ کیا

ہوں مُرید معتقد آزاد مرد عشق کا | ہم کو ہر تکلیف سے دنیا کی وارستہ کیا

عالم بالا سے حسرت پہنچے ہی فیض سخن | فکر قد میں اسکے اپنا شعر برجستہ کیا

فتنہ جو تری نرگس فتاں میں دیکھا | آشوب نہ وہ زلف پریشاں میں دیکھا

کس ساعت بد قید قفس میں وہ پڑی تھی | بلبل کو نہ پھر ہم نے گلستاں میں دیکھا

حسرت اسے بے برگ کریں آنکھ سے دیکھوں | جس باغ کو جوش گل و ریحاں میں دیکھا

ہمسے وحشت اسے کیا کہتے ہیں | سب سے الفت اسے کیا کہتے ہیں

لی اُٹھا چشم مروت ہم سے | بے مروت اسے کیا کہتے ہیں

اُسکے دل میں کبھی تاثیر نہ کی — نالے محبت اسے کیا کہتے ہیں
بے سبب صاف وہ لوٹنے صاحب — اتنی کلفت اسے کیا کہتے ہیں
اتنا بھی عشق میں رسوا ہونا — کہہ تو حسرت اسے کیا کہتے ہیں

عشق میں یار اگر وفا نہ کرے — کیا کرے کوئی اور کیا نہ کرے
کبھو دشمن کا آشنا بھی خدا — تجھسا بیگانہ آشنا نہ کرے
عشق کے رابطے سوا حسرت — شاہ سے نسبتِ گدا نہ کرے

کیا عہدِ وفا کوئی ہوسناک سے باندھے — کافر ہو جو دل اُس بتِ بیباک سے باندھے
قائل ہوں تیری ساحری چشم کا تب میں — راہ اشک کی اس دیدۂ نمناک سے باندھے
بے تیغ و کفن اس سے کروں عرض میں احوال — کب تک وہ زبان خوئے غضبناک سے باندھے
فتنہ سے اماں مانگتے ہیں لوگ تو حسرت — اک تو ہی کہ دل اس قدِ چالاک سے باندھے

چاہے سو ہمیں کر تو گنہگار ہیں تیرے — تقدیر بھی اپنی کہ گرفتار ہیں تیرے
ہر لحظہ زمیں عرصۂ محشر انہیں ہر روز — جو دل شدہ قامت رفتار ہیں تیرے
سوگند ہے حسرت مجھے اعجازِ سخن کی — یہ سحر ہیں جادو ہیں کہ اشعار ہیں تیرے

میری اُس پیاری چھب سے آنکھ لگی — اس سراپا عجب سے آنکھ لگی
عشق میں خواب کا خیال کسے — نہ لگی آنکھ جب سے آنکھ لگی
جتنے خوش چشم ہیں زمانے میں — رہتی ہے میری سب سے آنکھ لگی
رہتی ہے اس نگاہ کافر کی — رنجش بے سبب سے آنکھ لگی
مجھکو مت دو کہ ہے بلا حسرت — یار معشوق طلب سے آنکھ لگی

ہے خبر آنے کی یاں کون سے دیوانے کی — کچھ ہوا آج جنوں خیز ہے ویرانے کی
تو بھی اے ذوقِ ستم سلسلہ جنباں ہو کبھی — یوں تو ظالم کو مری یاد نہیں آنے کی
صحبتِ غیر سے حسرت وہ ہے نادم سا آج — ہے خبر اس کو مگر میرے خبر پانے کی

ہر آن میں وہ چہرۂ گلرنگ نیا ہی ۔ اس بو قلموں حسن کا کچھ ڈھنگ نیا ہی
یہ بوالعجب عشق اگر فرہا دسا مزدور ۔ پرویز سے خسرو کا ہوسہنگ نیا ہی

ہیں گلشن معنی میں بہت بلبل خوشخواں
حسرت پہ تری طرز کا کچھ رنگ نیا ہی

(۴) یقین

انعام اللہ خاں نام یقین تخلص۔ خلف اظہر الدین سرہندی حضرت میرزا مظہر کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ یہانتک کہ بقول بعض ان کا تمام کلام مرزا ہی کا لکھا ہوا ہی۔ واللہ اعلم۔ افسوس کہ اُنھوں نے زیادہ عمر نپائی اور ۱۵ ہی کی برس کے سن میں کسی نامعلوم قصور پر اپنے والد کے ہاتھ سے مارے گئے۔ مصحفی اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ "پدرش اوراکشتہ در دیگ مدفون ساختہ این سررا کسیکہ میداند میداند" یقین کی شاعری بعینہ مرزا مظہر کی شاعری معلوم ہوتی ہی چنانچہ مصحفی نے انکے کلام کے متعلق بھی مرزا صاحب کے کلام کی طرح یہی رائے قائم کی ہی کہ " در دور ایہام گویاں اول کسیکہ ریختہ را شستہ رفتہ و گفت این جا بود بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسید چنانچہ خود میگوید [۱]
حق کو یقین کے یاد و برباد مت دو وا خر ۔ طرزِ سخن کی اسکے آخر اڑائیاں ہیں
اور تذکرہ کارسن ڈیسی کے ترجمے میں ہی کہ " فن نظم میں اسکو بڑی مہارت اور اسکا ہی جمیع اقسام شعر سے تھی۔ ہر طرح کا شعر کہتا تھا .... بندہ نے بھی اس شخص کی تعریف بہت لوگوں کی زبانی سنی ہی" ذیل میں ہم اسکے کلام کا نمونہ انھیں کے زمانے کی طرز تحریر میں پیش کرتے ہیں جو اُمید ہی کہ ناظرین کے لیے مزید دلچسپی کا

---

[۱] از تذکرۂ مصحفی۔

* مصحفی انکی نسبت اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ "جوانے بود میرزا ملیح شہر بزرگی بلن ارحسن و جاہت بہرہ وافی داشت"

باعث ہوگا۔

سر پر سلطنت ستیں[1] آستان یار بہتر تھا   ہمیں ظل ہما سیں سایۂ دیوار بہتر تھا
ہونے[2] ہجر سیں کچھ وصل میں دو ہر کے بہت نکلے   ہمارے حق میں اس رحت سیں[3] وہ آزار بہتر تھا
مرا دل مر گیا جس دن کہ نظارے سیں باز آیا   یقیں پرہیز اگر کرتا نہ یہ بیمار بہتر تھا

نہ مرتا میں اگر صدقے ترے جانیکے کام آتا   کرسنہ ناز کا تھا کالیاں[4] کھانیکے کام آتا
بتاں خوں کر کہ میرا ملکہ[5] سب آپسمیں کہتے ہیں   یہ کافر جیوتا رہتا تو تجانے کے کام آتا
اڑا دی اُس ہوا نے مشت خاک بیکساں ناحق   غباران کا اگر رہتا تو پہانے کے کام آتا
لیا کمیران یقین سے عشق کا آتشکدہ سارا   کوئی شعلہ جو رہجاتا تو پروانے کے کام آتا

جو سر پاؤں پہ رکھدیجے تو خوش ہوویں بتاں ہم پر   ولیکن ہائے ہو سکتی ہے یہ جرأت کہاں ہم سیں
تمہارے بال و پر سیں باغ کی آتی ہے بو ہمکو   کبھی تو ملنے جایا کیجیے اے بلبلاں ہم سیں
یقیں کچھ دام میں آنیکا اندیشہ نہ تھا ہرگز   وے اتنا کہ ٹک[6] آباد تھا یہ گلستاں ہم سیں

عمر آخر ہے جنوں کر لیوں[7] بہاراں پھر کہاں   ہاتھ مت پکڑو مرا یارو گریباں پھر کہاں
چشم تر پر گر[8] نہیں کرتا ہوا پر رحم کر   دے لے ساقی ہم کو مے یہ ابر و باراں پھر کہاں
اس طرح آزاد کب صیاد چھوڑیگا تمہیں   بلبلو دھومیں مچا لیو یہ گلستاں پھر کہاں
ہے بہشتوں میں یقیں سب کچھ ولے وو درد نہیں   بھر کے دل رو لیجیے یہ چشم گریاں پھر کہاں

اسیران قفس کی ناامیدی پر نظر کیجو   بہار آوے تو اے صیاد مت ہمکو خبر کیجو

موں[9] اپنا نہ دیکھا کر ہو جائیگا دیوانہ   آئینہ کو کہتے ہیں اے شوخ پریخانہ
کیا دھوم مچائی ہے صحرا میں دیوانوں نے   اس فصل مبارک میں آباد ہے ویرانہ
روداد محبت کی مت پوچھ یقیں مجھ سیں   کچھ خوب نہیں سُننا افسوں ہے یہ افسانہ

[1] سین۔ سے [2] ہونے۔ بہمنے [3] دو۔ وہ [4] کالیاں۔ گالیاں۔ دیوان یقین میں کہیں گ پر دو مرکز نہیں ہیں [5] ملکہ۔ کرکہ۔ ملکے۔ کرکے [6] ٹک۔ ٹک [7] کرلیوں۔ کروں [8] گر۔ گر [9] موں۔ منہ ۱۲

زنجیر میں بالوں کے پھنس جانیکو کیا کہیے — کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

ارباب نظر ملاحظہ فرمائیں کہ منقولہ بالا اشعار میں سے بعض کی دلفریبی اندازۂ بیان سے باہر ہے اور ایسے اشعار سے یقین کا دیوان بھرا پڑا ہے اسلیے بنظر اختصار مجبوراً اس قسم کے انتخاب سے قطع نظر کرکے اب ہم ان چند اشعار پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں جو ایہام گوئی کا نمونہ ہیں اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ حضرت میرزا مظہر و شاگردان مظہر سلیس گوئی کے بانی اور موجد ہیں تاہم چونکہ ان کا عہد شعرائے ایہام گو کے زمانے سے بالکل ملا ہوا ہے اسلیے کبھی کبھی اس رنگ میں بھی کچھ کہہ گزرے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ یقین ؎

مجھے پا(ر)مشیت کے چوپائے سیں پڑا جب کا — زرتاب سیں ہوں سرد کی سیں ہتا ہوں رضائی[1]

روپئے کا دیکھنا ہے شربت دینار ہجر — ہر نہار آنا اس کا مجھکو لاکھ ہے

یک آنا ترا نہ آنا ہے — گنج احسان ہیں مجھپہ لاکھ کروڑ

سونے سے سونا ہوئے دل سونا نہ منگ حق سیں یقین

جس کو خدا کا شوق ہے سونا کرے سونا طلب

حسرت شاگرد میرزا مظہر ؎

کب کرے میرے عشق کو آرے — اس کو تو ہم سے عار[3] آتا ہے

ہوئی ہو کل سیں کم کبھی میرے طالع کہیں کیونکر

نجومی فتحیابی اس سیہ کوکب کی گوکب ہے

صورت سے خوبصورت آنے کو روپیہ کہیں — وہ گنج سے کہے ہیں طالب مفلس کے پاس سونا نہیں

سن بہت رنگی تیری ہنسی میں مجھ سیں مت کر — صورت تیری نہ دیکھوں تجھ بار رہا کہا ہوں

---

[1] رضائی کا لفظ مشیت کی رعایت سے لایا ہے یعنی رضا کے لحاظ سے۔ ۱۲

[2] روپئے کا یعنی روپیا کا یا چہرہ محبوب کا۔ روپئے دینار کی رعایت سے لایا ہے۔ ۱۲

[3] عار کو مذکر لکھا ہے۔ ہمارے نزدیک آجتک اس لفظ کی تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے۔ ۱۲

مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے نیشنل کالج بنانیکی ضرورت اور صورت

ہنگامۂ کالج کے مفصل حالات معلوم کرنیکے بعد جسکی مختصر کیفیت کسی دوسری جگہ درج کیجاتی ہے ہر ہوشمند شخص کے دلمیں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ انگریز پرنسپل اور پروفیسر کے مقابلے میں مسلمان ٹرسٹیوں کا اپنے تئیں بالکل بے دست و پا ظاہر کرنا کس سبب سے تھا۔ اور اُسکے رفع کرنیکی کیا صورت ہے۔ کیونکہ صورت معاملات کے اسی رنگ پر قائم رہنے کی حالت میں علی گڈہ کالج کو محمڈن کالج کہنا یقیناً ایک ایسی صریح غلط بیانی ہے جس کو معمولی فہم و فراست کا شخص بھی بلا فکر و تامل معلوم کرسکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ٹرسٹیوں کا اپنے کو قواعد کالج کی رو سے معذور و مجبور بتانا حقیقت حال کے بالکل منافی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کالج کے اندرونی معاملات میں جنکا تعلق زیادہ تر طلبا کی تعلیم و تربیت سے ہے ٹرسٹیوں نے اپنی سادہ لوحی سے پرنسپل کو حد سے زیادہ اختیار دے رکھے ہیں اور اس لیے موجودہ قواعد کی رو سے وہ اس قسم کے معاملات میں پرنسپل پر اپنے احکام جاری نہیں کرسکتے۔ لیکن ساتھ ہی اسکے یہ امر بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ کالج کا موجودہ جھگڑا جس سے بنیاد کالج کی متزلزل ہو جانیکا اندیشہ ہوسکتا ہے کسی طرح اندرونی معاملہ نہیں سمجھا جاسکتا تھا اور ٹرسٹیوں کا اسمیں دخل نہ دینا محض اسوجہ سے تھا کہ یا تو وہ لوگ اپنی ذمہ داری سے آگاہ نہ تھے یا اگر آگاہ تھے تو محض کسی خوف کی بنا پر وہ اپنی قوت کو عمل میں لانا نہیں چاہتے تھے۔ ورنہ یہ بالکل انکے اختیار میں تھا کہ جس وقت پرنسپل نے باوجود لڑکوں کی عاجزی اور سکرٹری کی استدعا کے کالج کے قابل ترین طالب علموں کو نکالدینے کا حکم جاری کیا تھا اور ساتھ ہی اسکے پرائیویٹ طور پر کالج کو برباد کرنیکی بھی دھمکی دی تھی تو بلا اظہار سبب وہ ان غیر ہمدرد انگریزوں کو معطل کرسکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ

لے سوجہ دفعہ ۲۰ قاعدہ ٹرسٹیان

یہی ہوتا کہ قواعد کالج کی رو سے معطل شدہ ملازمین کالج کو چھ چھ مہینوں کی نصف تنخواہ دینا پڑتی اور ٹرسٹی[۵] لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اور ہمارے خیال میں صرف اس خوف سے کہ:-

(۱) اگر موجودہ انگلش اسٹاف موقوف کیا جائیگا تو پھر کوئی انگریز کالج میں تعلیم دینے کیلیے نہ آئیگا۔ اور

(۲) انگریزوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے سے ممکن ہو کہ گورنمنٹ کالج کی طرف سے نظر عنایت پھیر لے اور گورنمنٹ کی کم التفاتی کا نتیجہ شاید یہ بھی ہو کہ ہندوستانی والیان ریاست بھی اپنی امداد روک دیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ٹرسٹیوں کا یہ خوف بالکل بے بنیاد ہو۔ لیکن اتنا ضرور بتائے دیتے ہیں کہ اگر مدرسۃ العلوم کو درحقیقت ایک قومی کالج کی حیثیت سے قائم رکھنا ہے تو بہی خواہان قوم کو لازم ہو کہ بجائے اس قسم کے خطروں سے بچنے کے اپنی ساری ہمت اُن کے دور کرنے میں صرف کریں اور یہ خوب سمجھ لیں کہ دنیا کا کوئی بڑا کام انجام نہیں پاسکتا جب تک کہ اس کے متعلق دقتوں کا مردانہ وار مقابلہ و مدافعہ نہ کیا جائے۔ ٹرسٹیوں کو اس بات کا خوف ہو کہ انگریز پروفیسر کالج میں نہ آ سکیں گے۔ اوّل تو ہم کو اس سے انکار ہو کہ معقول تنخواہ میں بھی کوئی انگریز ملازمت پر آمادہ نہو گا۔ لیکن بفرض محال ایسا ہو بھی تو ہمارے نزدیک مسلمانوں کو انگریزوں کی عدم موجودگی پر بجائے خوف زدہ ہونیکے خوش ہونا چاہیے۔ اور اگر فی الحال اُن سے نجات کی کوئی صورت نہو تو کم از کم ہمارا مقصد آخری تو یقیناً یہی قرار پانا چاہیے کہ مدرسۃ العلوم ایک ایسا قومی کالج ہو جسکے کل پروفیسر اور پرنسپل مسلمان ہوں اور اگر کوئی انگریز ہو بھی تو وہ صرف تعلیم دینے کے واسطے ہو نہ کہ ہماری مصلحت اور پالیسی میں دخل دینے کیلیے۔

ٹ ۵ بموجب دفعہ ۲۲ قانون ٹرسٹیاں

اس موقع پر غالبًا یہ اعتراض کیا جائیگا کہ بحالت موجودہ مسلمان پرنسپل اور پروفیسرون کا دستیاب ہونا دشوار ہو لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اس افسوسناک مجبوری کا سبب سوا اسکے اور کچھ نہیں ہو کہ اس وقت تک مسلمانوں نے اس مسئلے کیطرف توجہ ہی نہیں کی ورنہ غیر ممکن تھا کہ اس وقت ہم میں ایک دو نہیں دس بیس مسلمان تعلیم یافتہ ایسے موجود نہ ہوتے جو اپنے قومی کالج کی خدمت اسی خلوص اور عمدگی کے ساتھ کرنے پر آمادہ ہوتے جس کا نظارہ اس وقت فرگوسن کالج دیانند کالج اور سب سے بڑھ کر کلکتے کے نیشنل کالج میں ہر محب ملک کی مسرت کا باعث ہو رہا ہو۔ خیال کرنیکی بات ہو کہ اگر آج ہم کالج کو نیشنل کالج بنانے پر آمادہ ہو جائیں تو آج ہی ہم کو ایک معقول تعداد ایسے مسلمان پروفیسرونکی ملسکتی ہو جو موجودہ انگریز پروفیسروں سے بہرصورت قابل ترجیح ہوں۔ اور بفرض محال اس وقت ایسا ناممکن بھی ہو تو تین سال کے اندر تو قطعی طور پر سارا انتظام حسب دلخواہ اس طور پر ہو سکتا ہو کہ خاص خاص ضرورتوں کے لیے خاص خاص مسلمان منتخب کر کے بغرض تعلیم یورپ وامریکہ روانہ کر دیے جائیں جو تین سال میں کامل ہو کر واپس آسکتے ہیں اگر ہمیں کالج کو ایک آزاد قومی دار العلوم بنانا ہو تو پرنسپل اور پروفیسروں کے متعلق سر سید مرحوم کی اس بیہودہ شرط کو کہ انمیں سے ایک معین تعداد ہمیشہ یوروپین ہو بالکل اُڑا دینا چاہیے۔ اور اگر ٹرسٹیان اپنی قدامت پرستی کی بنا پر اس اشد ضروری ریفارم کو منظور کرنے میں متامل ہوں تو تمام قوم کو علانیہ طور پر اس امر کا اظہار کر دینا چاہیے کہ ہم کو موجودہ ٹرسٹیوں کی قابلیت اور ہمت پر مطلق بھروسہ نہیں ہو۔ مناسب ہو کہ وہ سب از خود مستعفی ہو جائیں ورنہ قوم ان کو اسپر مجبور کرے۔ اگر موجودہ ٹرسٹی اپنے اپنے فرائض کو بخوبی تمام انجام دے رہے ہیں تو اُن کو استعفا داخل کرنے میں کچھ عذر نہونا چاہیے کیونکہ جدید انتخاب میں وہ یقینًا پھر منتخب ہونگے اس تجویز کا

منشا صرف اسقدر ہی کہ نا قابل ٹرسٹی خارج ہو جائیں اور اُنکی جگہیں ایسے لوگوں کو
ملیں جو موجودہ زمانے کی ضروریات سے باخبر ہوں اور جبں وقت تک کالج
کے تمام عہدے مسلمانوں سے نہ بھر جائیں اُسوقت تک انگریز عہدہ داروں کے
کام کی نگرانی بھی کر سکیں۔

بعض کمزور طبیعت لوگوں کو شاید یہ خواہش عجیب و غریب اور ناممکن العمل معلوم
ہوگی لیکن حقیقت امر یہی ہی کہ جبتک پرنسپل انگریز رہیگا اُس وقت تک کالج کو آزادی کسی
طرح نہیں حاصل ہو سکتی۔ انگریز کیسا ہی نیک طینت اور شریف مزاج کیوں نہو اُس
سے یہ اُمید رکھنا عبث ہی کہ بعض مسلمانوں کی طرح وہ بھی اپنی قومیت کو بھول جائیگا۔
بحیثیت انگریز وہ یقیناً گورنمنٹ کی جانب سے خفیہ پولیس کا کام کریگا۔ اور
مسلمانوں کے ساتھ اُس کی ہمدردی اُسیوقت تک ہوگی جبتک کہ وہ اسکے
قبضے میں رہیں گے۔ ورنہ آزادی کے ذرا سے اظہار پر بھی اس کی ساری ہمدردی
نفرت سے مبدل ہو جائیگی۔ بعض ظاہر بین مسلمان موجودہ پرنسپل کے مقابلے میں
بیک اور ماریسن کو بحسرت و افسوس یاد کرتے ہیں مگر سچ پوچھیے تو ہماری آزادی
کے سلب کرنیکی جیسی کوشش ان لوگوں کے زمانے میں کیگئی اُس کا عشر عشیر
بھی اس وقت نہیں ممکن ہی۔ کیونکہ موجودہ پرنسپل کا پولیٹکل اور سوشل اقتدار
مسٹر بیک کی قوت کا چوتھائی بلکہ آٹھواں حصہ بھی نہیں ہی۔ البتہ فرق ہی تو اسقدر
کہ بیک اپنے باطنی جور کو ظاہری خاطرداری کے ذریعے سے چھپانیکا ڈھب
خود ہی خوب جانتا تھا۔ اور آرچ بولڈ کو مسلمانوں کے بیوقوف بنانیکا یہ طریقہ اب
سکھایا جا رہا ہی۔

مسٹر بیک کی قوت کا ایک ادنی کرشمہ یہ تھا کہ کئی ٹرسٹیوں کو محض ان کیوجہ سے
مستعفی اور ذلیل ہونا پڑا۔ اور یہ بھی ایک مشہور واقعہ ہی کہ کسی ٹرسٹی کو اختلاف رائے

کی بنا پر انھوں نے بطور خود ٹرسٹی شپ سے معزول کرنے کی دھمکی دی تھی۔

اور مسٹر ماریسن کی پولیٹکل فتنہ پردازی کا حال واقعہ ڈیپوٹیشن ایران پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہی۔ لارڈ کرزن کے سفر خلیج فارس سے واپس آنے پر فوراً ہی اس ڈیپوٹیشن کا بھیجا جانا اور باصرار بھیجا جانا ہرگز بیوجہ نتھا جبھی تو مسٹر ماریسن نے ٹرسٹیوں کے انکار پر ڈانٹ کر لکھا تھا کہ "ٹرسٹی رضامند ہوں یا نارضامند ڈیپوٹیشن ضرور جائیگا" چنانچہ بعد میں کالج کے ایک افسر نے بحالت نادانستگی صاف صاف لفظوں میں ایک موقع خاص پر اس ڈیپوٹیشن کی پولیٹکل حیثیت کو خود بھی تسلیم کر لیا جسکی کیفیت ہم صرف بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔ غرضکہ کالج کی بہتری اسی میں ہو کہ آیندہ سے اسکے پروفیسر اور پرنسپل سب مسلمان ہوا کریں ورنہ ہنگامہ زیر بحث کے مانند شور و شر پیدا ہونیکا ہر وقت خطرہ موجود رہیگا۔

اب رہا ٹرسٹیوں کا دوسرا خوف کہ انگریز پروفیسروں کو ناراض کرنے سے گورنمنٹ کی خفگی اور گورنمنٹ کی خفگی سے دیگر ہمدردان کالج کی ناراضی کا خطرہ اور سخت مالی نقصان کا اندیشہ ہی۔ اسکے متعلق لوگوں کے دلوں میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں جنکا دور کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

اوّل یہ کہ ہم گورنمنٹ کی امداد کو ایک احسان عظیم شمار کرتے ہیں۔

دوم یہ کہ ہماری ذراسی بھی آزاد خیالی گورنمنٹ کی نظر میں ناشکرگزاری کے ہم معنے سمجھی جائیگی اور وہ اپنی مدد بند کر دیگی۔

سوم یہ کہ ہر انگریز بجائے خود گورنمنٹ ہوتا ہی اور اس لیے کسی انگریز کا چھیڑنا گویا گورنمنٹ سے دشمنی پیدا کرنا ہی۔

چہارم یہ کہ اگر بفرض محال گورنمنٹ اپنی مدد روک دے تو ہم کسی طرح سے کالج کو چلا نہیں سکتے۔

سو پہلی غلط فہمی کا باعث یہ ہی کہ مسلمان عام طور پر اس امر سے ناواقف ہیں کہ اہل ہند کو گورنمنٹ کی جانب سے جو تعلیمی امداد ملتی ہی وہ دیگر مقبوضات انگلستان کے مقابلے میں تقریباً نفی کے برابر ہی۔ کسی دوسری جگہ پر گورنمنٹ کی تعلیمی پالسی کے متعلق ایک مفصل مضمون درج کیا گیا ہی جسکے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ وہاں حالانکہ برٹش علداری کے دوسرے حصوں میں تعلیم رعایا کیلیے حکومت کی طرف سے فی کس سالانہ خرچ نو روپے اور آٹھ روپے سے کم نہیں ہی ہندوستان مظلوم کے حصے میں فی کس سالانہ صرف آٹھ پائی کا اوسط بیٹھتا ہی۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اس بیان سے ثابت ہی کہ تعلیمی معاملات میں سرکاری امداد کا جو استحقاق ہم کو حاصل ہی اُس کا عشر عشیر بھی اس وقت ہمیں نہیں ملتا۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ قلت امداد کی سخت شکایت کے عوض ہم اُسے ایک احسان عظیم کیوں تصور کریں اور اُسکے معاوضے میں اپنے دیگر حقوق انسانی سے بھی کیوں دست بردار ہو جائیں لیکن ہمارے سادہ دل ٹرسٹی صرف ۱۷۰۰ روپے ماہوار میں مسلمانان ہند کے تمام حقوق کو فروخت کر دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

امر دوم و سوم کے متعلق بھی جہاں تک ہم غور کرتے ہیں ہم کو گورنمنٹ ہند کی ہوشیاری سے یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہی کہ وہ بغیر کسی سخت مجبوری کے علیگڈھ کالج کی امداد بند کرکے تمام مسلمانوں کو اپنا دشمن بنائیگی۔ مشرقی بنگال کی مثال ہمارے سامنے موجود ہی۔ بلند ہمت اور آزاد خیال بنگالیوں نے باوجودیکہ سر فلر کی گورنمنٹ کو تنگ کرنے کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا تھا لیکن لارڈ منٹو نے اُنکے دو معمولی اسکولوں کی امداد بند کر دینے پر سر فلر کے اخراج کو ترجیح دی۔ پس صاف ظاہر ہے کہ جب اہل بنگال کے اسکولوں کی امداد بند نہیں ہوئی تو مسلمانوں کے

کالج کی امداد کس طرح بند ہوسکتی ہی۔ اور جب بنگال میں سر فلر لفٹنٹ گورنر کی بھی مخالفت کا خیال نہ کیا گیا تو علی گڑھ میں صرف چند انگریز پروفیسروں کی مخالفت کا کیا لحاظ ہوسکتا ہی۔

گورنمنٹ ہند ایسی بیوقوف نہیں ہی کہ چند انگریز پروفیسروں کی خاطر سے اپنی ملکی پالیسی بدل دے اور مسلمانوں کو بھی اپنا مخالف بناکر حکومت ہندوستان کے کھودینے کا خود ہی سامان مہیا کر دے۔ لیکن اگر گورنمنٹ اپنی عاقبت اندیشی سے ایسا کرے تو ہم کو بھی اسکے صدمہ سے بچنے کیلیے تیار رہنا چاہیے اور اصل میں پیش بینی کا تو یہی اقتضا ہی کہ گورنمنٹ اپنی امداد جاری رکھے یا نہ رکھے۔ ہم اپنے ضروری اخراجات کیلیے ایسا انتظام کرلیں کہ خفگی حکومت کا یہ خطرہ ہی مٹ جائے۔ اور وہ یوں کہ فی الحال ایک سال کے عرصے میں کم از کم ۵ لاکھ روپے کا ایک نیشنل ریزرو فنڈ پیدا کرلیں جو صرف اسی غرض کیلیے جمع رہی کہ اگر کسی وقت میں گورنمنٹ اپنی "ایڈ" بند کر دے تو کالج کو کسی قسم کا مالی خطرہ نہ پیش آسکے۔ جب تک گورنمنٹ کی مدد جاری رہے، اور ہمکو اُمید ہی کہ ہمیشہ جاری رہیگی، اس وقت تک اس نیشنل فنڈ کی آمدنی ایسے کاموں میں صرف کیجائے تو جو اشد ضروری تو ہوں لیکن اسکی ساتھ ہی اُسکی ایسے ہوں کہ دو ایک سال تک اُنکے رُک جانے سے کسی بڑی قومی مصیبت کے پیدا ہوجانیکا اندیشہ نہو۔ مثلاً اس رقم کی مدد سے ممالک یورپ و امریکہ میں لائق مسلمانوں کو بغرض تکمیل تعلیم روانہ کرنیکے لیے کم از کم چھ وظائف کا انتظام ہوسکتا ہی۔ جنمیں سے چند اس ضرورت سے بھیجے جائیں کہ ہندوستان واپس آکر مختلف علوم کی پروفیسری کرسکیں جسکی ضرورت کو اس وقت ہر شخص محسوس کر رہا ہی۔ اور کچھ اسلیے روانہ کیے جائیں کہ ممالک غیر سے صنعت و حرفت کی تعلیم پاکر مسلمانوں کی تجارت کو سنبھالیں اور ہمارے خیال میں ایسے لوگوں کی پروفیسروں اور عالموں سے بھی زیادہ ضرورت

ہے۔ بعض نادان مسلمان سودیشی تحریک کا مضحکہ اُڑاتے ہیں اور اپنی فیشن پرستی کے زعم میں تمام دیسی چیزوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی تنگ ہندوستان نے اخبار "انڈین پیپل" الہ آباد میں کالج کے موجودہ حالات پر بحث کرتے ہوئے ایک فقرہ یہ بھی لکھا ہے کہ "ہماری خواہش صرف یہ ہے کہ انگریز ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔ ورنہ سدیشی پروڈسٹ کی ہم کو آرزو نہیں ہے" لیکن ہم مسلمانوں کو آگاہ کئے دیتے ہیں کہ اس خدائی تحریک کا روکنا اب کسی بشر کے امکان میں نہیں ہے اور وہ زمانہ قریب ہے جبکہ صرف اسی تحریک کی مدد سے ہندوستان اول اقتصادی آزادی اور پھر اُس کے ذریعے سے ملکی آزادی حاصل کر کے رہیگا۔ کاش کہ جو لوگ چند معمولی نوکریوں کی رعایت پر مشرقی بنگال کی حکومت کو آسمان پر چڑھائے دیتے ہیں وہ بمبئی اور رنگون کے مسلمان تاجروں پر اپنا اثر ڈالتے اور ان کو آگاہ کرتے کہ بجائے اشیائے ممالک غیر کی ایجنسی کے تم لوگ اپنی دولت کو ملکی صنعت کے فروغ میں صرف کر کے اپنی آمدنی کے استقلال کا سامان کر دو ورنہ یاد رہے کہ بدیسی چیزوں کی تجارت کو نقصان پہنچنے پر تمہارے کاربار کو دفعتاً ایسا صدمہ پہنچیگا کہ پھر اُس کی تلافی ناممکن ہو جائیگی۔

خیر یہ حکایت بہت دراز ہے اس لیے اس کو یہیں پر ناتمام چھوڑ کر اب ہم اپنے مجوزہ نیشنل فنڈ کے جمع کرنیکی بھی صورت پیش کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر واقعی کالج کے موجودہ اور گذشتہ طلبا کا جوش و خروش حقیقی ہے تو اس قلیل رقم کا ایک سال میں جمع ہو جانا کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔ ہر سال کالج سے چند ڈیپوٹیشن ملک میں دورہ کر کے ۲۵-۳۰ ہزار روپے جمع کر لاتے ہیں۔ اس سال بجائے چند کے اگر بیس ڈیپوٹیشن نکلیں تو یقین ہے کہ لاکھ دو لاکھ روپیہ ضرور فراہم کر لائیں اسی طرح سے "اولڈ بوائز" بھی اگر اپنا فرض ادا کرنا چاہیں تو بآسانی ایک معقول رقم

مہیا کر سکتے ہیں۔ ٹرسٹیوں سے ہم کو اُمید نہیں کہ زیادہ وصول ہو لیکن جو لوگ محض مالدار ہونیکی وجہ سے ٹرسٹی بنائے گئے ہیں اُن کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ اس وقت فیاضی سے کام لیں۔ ورنہ استعفا داخل کر کے کالج کا پیچھا چھوڑیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "محمڈن پبلک" علی گڑھ کالج کو آزاد بنانیکے لیے بخوف گورنمنٹ چندہ دینے میں تامل کریگی۔ لیکن ہم کو اسکے باور کرنے میں بہت کچھ شبہ ہے۔ درحقیقت ابھی تک اس قسم کے تجربے کا کوئی موقع ہی نہیں آیا ورنہ ہم کو قوی اُمید ہے کہ لیڈروں کی پست و ذلیل بنا دینے والی کوششوں کے باوجود مسلمانوں کی خودداری و حمیت کبھی اس بات کو گوارا نہ کریگی کہ ایک بے بنیاد خوف کی بنا پر وہ اپنے قومی قار کو قائم رکھنے سے باز رہیں اور ہمیشہ کیلیے رسوائی اور غلامی کو اپنے لیے مسلم کرلیں۔

قصہ مختصر یہ کہ علی گڈہ کالج کی اور اُسکے ساتھ تمام مسلمانوں کی درستی رفارم کے بجائے ایک انقلاب عظیم کی محتاج ہے۔ اور بغیر اس انقلاب کے فلاح دائمی کی اُمید رکھنا کسی دانشمند کا کام نہیں ہے۔ کاش کہ مسلمان ہمارے اس مضمون کو پڑھیں اور اس پر غور کریں۔

فقط

مکتوبات امیر مینائی

(۱)

حضرت کوثر

میں ڈیڑھ مہینے سے بیمار دونوں شانوں اور بازوؤں کے درد میں گرفتار ہوں پہلے کم تھا رفتہ رفتہ بڑھ گیا اب حرکت قلم تک میں تکلیف ہوتی ہے لکھنا تکلف ہوتا ہے اور شب کو تو ذرا چین نہیں آتا کسی کروٹ لیٹا نہیں جاتا۔ تکمیدیں کیں ضماد و نطول کیے مجبوری منضج پیے مسہل لیے کچھ مفید نہیں یہی سبب ہے کہ جو فکریں آپکے

اب میں مکنون خاطر فاتر تھیں کسی کا ظہور نہوا ہی حجاب سے کئی تحریروں کا جواب
نہ لکھا یہی خیال رہا کہ ذرا آرام ہو تو کوئی راہ نکالوں شاید تدبیر تقدیر کے موافق پڑ جائے
اب کہ تاخیر بہت ہوئی اور آپکی شکایت بجا سے بہت منفعل کیا تو یہ پرچہ لکھا ملاقات
کو میرا بھی جی چاہتا ہی مگر دیکھا چاہیے میلے میں آپ آئیں تو میں کس حال میں
ہوں ۔ اٹھیں پچیس چھبیس دن میلے کے رہ گئے ہیں اور ابتک مجھکو افاقہ نہیں
دربار جانا ایک ہفتے سے موقوف ہی ورنہ پہلے کوئی تقریب کرتا تو جشن بےنظیر
میں سرکار تک آپکو پہنچاتا ایک طرح کی شناسائی ہوجاتی بنا قائم ہوجاتی تو آگے
اس بنا پر روّے رکھے جاتے ۔ عمارت اُٹھائی جاتی ۔ افسوس کیا ۔ اچھا زمانہ ہاتھ سے
نکلا جاتا ہی ۔ فرض کیجیے کہ آپکو زیرباری ہی ہو تو بھی ملاقات کا تو لطف ہی اور اس
حال میں میں کس زبان سے کہوں کہ آپ زیربار ہوں بایں ہمہ اگر آپ کا جی شرکت
جشن کو چاہتا ہو تو منع نہیں کرتا بلکہ ملاقات جس حال میں ہوگی باعث حظ روحانی
ہی امر واقعی میں نے لکھا ۔ عبدالستار خاں ۴؍ فی نسخہ دیوان مصحفی کو مانگتے ہیں مجکو
اس تجارت میں سراسر نقصان ہی منشی صاحب قبلہ نے جو چند نسخے ۸؍ فی نسخہ
فروخت فرمائے وہ بھی بمجبوری اس لیے کہ یہاں سے وہاں گئے تھے وہاں
سے پلٹ کر یہاں آنا اور طول امل تھا میں نے بھی گوارا کیا اب تین سو نسخے
جو باقی ہیں اس قیمت پر دینے کو جی نہیں چاہتا ۔ آیندہ آپ سے دوستوں کی
جو رائے ہو میں نے منشی ریاض احمد سے بھی اُنکی رائے پوچھی ہی ۔ آپ بھی
اپنی رائے لکھیں اگر نفع قلیل بھی ہو تو مضائقہ نہیں ۔ یہ تو سراسر نقصان ہی بعزیں
پہنچیں مگر اس حالت میں کیا بنانا ہو سکتا ہی خداوند تعالیٰ ذرا صحت دے تو دیکھوں
گا معاف کیجیے گا ۔ نور چشم محمد احمد یا اسی خط میں کچھ لکھیں گے یا جُداگانہ خط بھیجیں
گے اس وقت سبق کو گئے ہیں ۔ میں نے دو سطریں لکھدیں اور اگر کسی بات کا

جواب لکھا ہو تو معاف کیجئے گا۔ فقط امیر عفا عنہ از رام پور افغانان ۲۴ فروری ۱۸۸۱ء

آپ اس خط کے جواب میں جناب منشی مظفر علی صاحب کے اصل امراض و اعراض کا حال مفصل لکھیے گا وہاں سے مجمل لکھا آتا ہے تسلی نہیں ہوتی اور یہ بھی لکھیے گا کہ آپ کے نزدیک منشی صاحب کا آجانا ۹ مارچ تک کہ مہینے کے آغاز کی تاریخ ہے مظنون ہے یا موہوم یعنی آسکنے کے قابل معلوم ہوتے ہیں یا نہیں

(۲)

حضرت کوثر سقاکم اللہ بحوض الکوثر

بعد سلام مسنون اخلاص مشحون کے واضح ہو کہ استادی جناب منشی مظفر علی صاحب قبلہ آنیوالے ہیں غالب ہے کہ بعد سوم کی مجلس سے فارغ ہونے کے تاریخ روانگی کی قرار دیں ممکن تھا کہ میں جناب ممدوح کو عمدہ تمبا کو کیواسطے تکلف ہوتا اور قیمت یہاں دیدیتا مگر جیسا عمدہ مجھے مطلوب ہے ویسا تمباکو منشی صاحب کی معرفت شاید نہ آئے اسواسطے کہ منشی صاحب اپنے تابعین میں کسی سے فرما دیں گے وہ جیسا لا دیگا ویسا لے آئینگے اور مجھے ادباً مجال اسکی بھی نہو گی کہ اس کو برا ظاہر کروں لہذا بنظر کمال عنایت کے آپکو مکلف ہوں کہ عمدہ خوشبو دار دو سیر تمباکو خرید فرما کر باحتیاط ان کی ٹکیاں بند ہوا کر ہوا سے محفوظ کر کے منشی صاحب کو تفویض کیجیے کہ انکے ساتھ چلے آنا باسانی ممکن ہے زیادہ کیا لکھا جاے نور چشم محمد احمد سلمہ اللہ الصمد تسلیم گزار ہیں۔ قیمت ضرور لکھ بھیجیے گا کہ بذریعہ منی آرڈر پہنچ گی۔ امیر احمد عفی عنہ ۹ محرم الحرام ۱۲۹۸ھ

(۳)

گرامی گوہر معنی پرور اعلی اللہ شانکم

پس از سلام سنت الاسلام۔ اسوقت پوسٹ کارڈ محمد احمد کے نام آیا اس نے مجھے خواب غفلت سے چونکایا میں نے وہ محبت نامہ جسمیں حضرت تسنیم کی تاریخیں لکھی

پیشی کے شیشے میں رکھ دیا تھا مگر اُسی شیشے میں رکھنے سے خطوط اس زمانہ میں اتنے ہوگئے
کہ یہ خط بھول گیا اس وقت نکالا اور دیکھا اور بہ شد ضروری تصرفات کرکے روانہ کیا
مرثیہ ڈھونڈھا اور بھیجا باقی ہو نہ شد۔ انشاءاللہ اُس کو بھی ڈھونڈھونگا۔ اور جس وقت مجائے گا
بھیجونگا منشی صاحب قبلہ نے مجھے لکھا ہو کہ روانگی سے پہلے تاریخ روانگی سے خبر
دونگا آپ بھی دریافت فرماتے رہیں۔ دیوان سرکار کے عنقریب بھیجتا ہوں اس
خط سے آپکی پریشانی دریافت ہوئی اور میں بھی بحکم اتحاد پریشان ہوا۔ خداوند تعالےٰ
کوئی صورت جمعیت خاطر کی نکالے۔ امیر فقیر۔

(۴)

غرق عرق تشویر حقیر کسیر فقیر امیر اپنے یاد فرما قدردان سراپا جوہر حضرت کوثر
کیخدمت میں لکھتا ہو کہ میں اپنے احباب سے شرمندہ ہوں کہ کوئی حق محبت کا ادا
نہیں ہوسکتا جبتک صحیح رہتا ہوں سرکاری خدمتوں سے فرصت نہیں ہوتی اور
جب مریض ہوتا ہوں تو سرشتہ ضروریہ میں بھی فتور ہوتا ہو۔ غزلیں آپکی رکھی ہیں بنا نیکی
مہلت نہیں پاتا امید ہو کہ محمول دہلوتہی پر نہو۔ ایک نسخہ گوہر انتخاب کا بدشواری ایک
دوست سے چھین کر محمد احمد آپکو بھیجتے ہیں قبول کیجیے اور اپنے مخلص کو دعائے خیر
سے یاد کیجیے اور اُسکی کوتہ قلمی پر نظر نہ کرکے خود کچھ لکھتے رہیے۔ میں نے اس زمانے
میں بہت فکر کی کہ آپکے اوصاف کا مذکور کرکے سرکار میں بلواؤں مگر بسبب اسکے
کہ کچھ تو بمقتضائے فصل سرکار کو امراض و اعراض میں خفت ہو اور کچھ بسبب اسکے
کہ حکیم محمود خاں دہلوی کی آمد آمد ہی میری فکر مثمر نہوئی۔ خیر یار باقی صحبت باقی پھر
دیکھا جائیگا۔ مجھ کو آپ کسی حالت میں خیراندیشی سے غافل نجانیں۔ اور یہ امر
کچھ مختص آپ کے ساتھ نہیں اپنے سب احباب کیساتھ یہی طریقہ مرعی ہو کہ اپنی
طرف سے تحریک میں کمی نہیں ہوتی اتمام متمم حقیقی کے ہاتھ ہی۔ فقط۔ امیر احمد

یکم جولائی سنہ ۱۸۷۹ء ۔ کمترین محمد احمد کیطرف سے آداب نیاز قبول ہو۔

(۵)

خدمت کوثر کہ لطافت و نظافت زبان و بیان ایشان چشمہ ہائے کوثر و تسنیم را آب ساز د از خاکسار حقیر فقیر امیر بعد سلام اخلاص انضمام قبول گردد کہ پس از مدتے نامہ دلنواز کہ در شکنجش چند تا غزل بود بدلنوازی پرداخت و منت پذیر یاد آوری ساخت باوراک دست دادن تعلق دلخواہ در ریاست کشن پور تحصیل فتحپور بسیار برخود بالیدم اللہم دائم بجمعیت خاطر باشند۔ من ہیچمیرز از کثرت انہماک بمشاغل سرکاری فرصت ندارم ورنہ ہرگز ازیں خدمت اصلاح پہلو تہی نورزیدم سوگند توانم خورد کہ شبہا چشم کمتر بخواب آشنا میشود ایں غزلہا را بعد تہجد دیدہ ام و محض بپاس خاطر گرامی ہیچ در مشغولی آخر شب گوارا کردہ ام چشم کہ اگر سہوے سرزدہ باشد محمول بر کمی التفات نباشد و گاہ گاہ از خیر و عافیت خود دلنواز بہا نمودہ باشند۔ نور چشم محمد احمد تسلیم میرساند۔ بعالیخدمت ولی علی خانصاحب ام مجدہم ما وجب پذیرا باد۔ آثم حقیر فقیر امیر

ہفتم رجب سنہ ۱۲۹۶ ہجری ۔ روز سہ شنبہ۔ فقط

مخزن کی کمزوریاں

آج اتفاق سے مخزن کا پرچہ دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء کا میرے ہاتھ لگ گیا میں نے بڑے شوق سے اُس کو کھولکر دیکھا۔ واقعی اہل پنجاب نے بہت بڑی ترقی کی ہے جسکی میں تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا مگر ساتھ ہی اُسکے اتنا ضرور کہونگا کہ اگر ذرا سی توجہ درستی زبان کی طرف کریں تو یہ کسر بھی دور ہو جائے۔ آغا شاعر نے ایک مضمون نثر میں اور دوسرا نظم میں لکھا ہے۔ ان دونوں میں اکثر غلطیاں نظر آئیں۔ نمونتاً دو چار دکھلاتا ہوں۔ تناسخ یا تبدل پر جو خامہ فرسائی کیگئی ہے جسکی سرخی "ایک قطرہ خون کی سرگذشت" ہے اس مضمون کی ساتویں سطر میں درج ہے کہ "مجھے ایک کھلی ہوئی دنیا میں بھیجدیا گیا"۔ اسمیں گیا۔ نہونا چاہیے

مصرع " مجھے ایک کھلی ہوئی دنیا میں بھیجدیا" لکھنا درست ہی اور اگر خواہ مخواہ گیا ہی کو رکھنا منظور ہی تو یوں ہونا چاہیے کہ "میں ایک کھلی ہوئی دنیا میں بھیجدیا گیا" اسی طرح نظم میں ؎ پھول کا بوجھ اٹھائے نہیں اتنا بھی سکت "۔ اتنی بھی سکت چاہیے اتنا غلط ہی۔ ہندو مسلمانوں کے اتفاق پر مولوی سید محمد فاروق صاحب کی نظم پر آپ لکھتے ہیں۔

؎

ملینگے ہندو مسلمان اگر نہ مشفق من ۔۔۔ رہیگی باقی جو ان دونوں تو نہیں ان بن

اس شعر کا مصرع ثانی یوں ہونا چاہیے ؎ چلی ہی جائیگی دونوں میں گر رہیں ان بن

اسی طرح اس شعر کی بندش نہایت ہی سست ہی۔ ؎

ہونگے صاف کدورت سے دل اگر انکے ۔۔۔ اگر پڑھیں گے نہ یہ اتفاق کی سمرن

اسکو اس طرح ہونا چاہیے۔ ؎

ہونگے صاف کدورت سے دل کبھی ان کے ۔۔۔ اگر جپیں گے نہ یہ اتفاق کی سمرن

کیونکہ سمرن کیلیے جپیں گے نہایت ہی موزوں ہی۔ اسی طرح سترہویں شعر کا یہ مصرع ہی ؏ تمام علم و ہنر کا تھا ایک ان مخزن۔ اس کو اس طرح ہونا چاہیے۔ ؏

ہر ایک علم و ہنر کا تھا جو کبھی مخزن

اقبال کی غزل خوب ہی۔ مگر پانی کے شرارے نے دل سرد کر دیا۔ کیونکہ آگ کا شرارہ سنا ہی۔ بجلی کا شرارہ سنا ہی۔ پانی کا شرارہ آج اسی غزل میں دیکھا۔ شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ خان بہادر کا لمبا چوڑا مضمون ایک عرصے سے چھپ رہا ہی۔ یہ مضمون جسقدر دراز ہی اُتنی ہی زیادہ غلطیوں سے بھی بھرا ہوا ہی۔ جن کو آئندہ دکھاؤنگا۔ فقط

راقم

طرار۔ بندیلکھنڈی

انتخاب بیاض مولوی سید اکبر حسن صاحب ہاپوڑی

لا اعلم

بوئے تو با نسیم بہار آشنا نشد　　　گلہا شگفت و بند قبائے تو وا نشد

ربا عی جامی

خوباں دل و جاں مبتلا می خواہند　　　زخمے کہ زنند مرحبا می خواہند

ایں قوم ایں قوم چشم بد دور ایں قوم　　　خوں میریزند و خوں بہا مے خواہند

میرزا صائب

کہ گفت در قدح ما شراب ناب انداز　　　تو باش ساقی و در شیشہ زہر ناب انداز

دارا شکوہ

غنچہ آیا چہ دید در گلشن　　　تنگ دل آمد و پریشاں رفت

میر تقی میر

ہے آرزو کہ رخصت پرواز ایک بار　　　صحن چمن میں مجھکو بھی اے باغباں ملے

یہ بھی نہ ہو سکے تو بھلا مجھ اسیر کو　　　کنج قفس میں فرصت آہ و فغاں ملے

رباعی طالب آملی

از کوے تو ہرگز شمیمے نرسید　　　یک تحفہ نیاز بلکہ نسیمے نرسید

عمرے بہ گلستان تو بودم اما　　　دستم بہ سر زلف نسیمے نرسید

لا ادری

دل شوق لبت مدام دارد　　　آیا ز لبت چہ کام دارد

لا اعلم

اسیرم خواست گردیدم بلا کم خواست میگردم　　　نمیدانم چہ میخواہد دگر آں بیوفا از من　　فقط

ہندوستان کا مسئلۂ تعلیم اور گورنمنٹ

یہ خبر تمام دلدادگانِ تعلیم کی مسرت کا باعث ہوگی کہ حال میں گورنمنٹ نے تجویز کیا ہے کہ ہندوستان میں ابتدائی تعلیم بے فیس کردی جائے۔ ہمیں یہ معلوم کر کے نہایت رنج ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مقبوضات انگریزی میں منجملہ ۲۹۴۴۱۴۹۰۶ آبادی کے ۲۷۷۰۲۰۴۸۵ آدمی جاہل مطلق ہیں یا یوں کہو کہ ۹۵ فیصدی ناحرف شناس ہیں۔ اس وقت ہمارا یہ جی چاہتا ہے کہ تعلیم بے فیس ہی نہیں بلکہ جبریہ کردی جائے۔ لیکن اس مسئلے کی منظوری سے گورنمنٹ معذور معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ چند سال ہوئے گورنر مدراس نے بمقام سالم فرمایا تھا کہ "حضرات! اس وقت میرے سامنے یہ درخواست پیش ہے کہ گورنمنٹ بے فیس اور جبری تعلیم کا طریقہ جاری کردے جس میں رات کی تعلیم اور عام پسند لکچر بھی مفت دیے جایا کریں۔ خیر اگر اس کا منظور کرنا گورنمنٹ کے حوصلے سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ لوگوں کی جبری تعلیم کی خواہش یہ معنے رکھتی ہے کہ تعلیم بے فیس بھی ضرور ہو جائے ورنہ اکثر لوگ جبر کے وقت کمی استطاعت کا عذر پیش کریں گے۔ اب اگر اس طریقۂ تعلیم کے مصارف کا اندازہ کیجیے تو وہ گورنمنٹ کی وسعت برداشت سے بدرجہا زیادہ ہیں۔" کہنے کو جو چاہے کہہ لیا جائے لیکن ایسے زبردست فرض کے ادراک پر ایک مہذب گورنمنٹ کا اس قدر ضعیف عذر قابل پذیرائی نہیں ہوسکتا۔ اصل واقعات کو دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کبھی صدق نیت و صفائی قلب سے کوشش ہی نہیں کی گئی۔ سنہ ۱۹۰۶-۰۷ء میں کل ۱۲۵۳۴۲۳۲۸۷ روپے کی آمدنی سے گورنمنٹ نے تعلیم پر صرف ۱۲۸۵۷۵۱۸ روپے یعنی ۱٫۰۲ فیصدی صرف کیا۔ لیکن جب ہم اور مدوں پر بے دریغ روپیہ صرف ہوتے دیکھتے ہیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ تعلیم کے بارے میں اتنی جزرسی چہ معنے دارد

وہی مثل ہوئی کہ اشرفیاں لٹیں اور کوئلوں پر مہر۔ سنہ ۰۷-۱۹۰۶ء میں ہندوستان کی کل آمدنی قریب ایک ارب ستائیس کروڑ کے ہوئی اس میں سے گورنمنٹ نے بیس کروڑ سے زاید اخراجات فوجی میں صرف کردیا پچیس کروڑ کے قریب اہل سول کی تنخواہ وغیرہ میں اور ستائیس کروڑ سے زائد ہوم چارجز (اخراجات ولایت) میں غرض ساری آمدنی سے ۶۴ فیصدی ان ہی تین مدوں میں غائب ہوگیا۔ اور پھر بھی گورنمنٹ جبری اور مفت تعلیم دینے کی گنجایش ابھی نہیں رکھتی۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ جب سابق وائسرائے کے زمانے میں سال بسال توفیر پر توفیر دکھائی جاتی تھی۔ اس وقت اس مسئلے پر کیوں نہ توجہ کیگئی؟ بجٹ تو ہر سال نہایت ہی فلاح خیز اور دلفریب دکھایا گیا لیکن توسیع تعلیم کی باب میں ایجوکیشنل پالیسی پر گورنمنٹ کو فصیح و بلیغ رائے زنی کے سوا کچھ بھی نہ آیا؟ اور یہ جو یونیورسٹیز ایکٹ پاس ہوا ہے۔ اس کا منشا توسیع تعلیم کے بالکل منافی ہے۔

غیر سلطنتوں کا تو ذکر کیا انگریزوں ہی کی خود مختار نوآبادیوں اور ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کے فرق کو دیکھ کر ہمارا کلیجہ پھٹتا ہے۔ نوآبادیوں میں یہ کوشش ہوتی ہے کہ تعلیم وسیع ہو یہاں یہ فکر ہے کہ محدود ہو۔ آسٹریلیا اور کناڈا ہی کی تعلیمی حالت کا موازنہ ہندوستان سے کر لیجیے۔ دولت مشترکہ آسٹریلیا میں نیو ساؤتھ ویلز۔ وکٹوریا کوئینس لینڈ۔ ساؤتھ آسٹریلیا۔ وسٹرن آسٹریلیا اور تسمانیا کے علاقے شامل ہیں۔ ہر علاقہ میں تعلیم رعایا کا انتظام خود مختاری کے ساتھ ہوتا ہے جس کی مختصر کیفیت حسب ذیل ہے:-

نیو ساؤتھ ویلز میں چھ برس سے چودہ برس کے سن تک تعلیم جبریہ دی جاتی ہے جو بچے فیس دینے کی گنجائش نہیں رکھتے۔ اُن کو بے فیس تعلیم دی جاتی ہے۔ وکٹوریا میں چھ برس سے تیرہ برس تک تعلیم جبری ہے۔ اور ابتدائی تعلیم بالکل بے فیس ہے۔

کوئنس لینڈ میں تعلیم بے فیس دیجاتی ہے اور اب تعلیم کو جبری کرنیکا قانون بھی پاس ہوگیا ہے
وسٹرن آسٹریلیا میں تعلیم جبری ہے۔ اور تسمانیہ میں بھی جبری تعلیم کا طریقہ جاری ہوگیا ہے
اسکے علاوہ کناڈا کی نوآبادی کے ہر صوبے میں تعلیم میں کم و بیش جبر ضرور ہے اور طریقہ
تعلیم بے فیس کے اصول پر مبنی ہے۔ اور نواور نیوزیلینڈ جیسے نوآبادیہائے برطانیہ
میں ذرا بھی وقعت نہیں حاصل ہے وہاں بھی تعلیم جبری اور مفت ہوتی ہے۔ اب
ہندوستان اور ممالک مذکورہ کے تعلیمی مصارف کا موازنہ اور دونوں کے ناحرف
شناسوں کا مقابلہ کیجیے اور دیکھیے کہ زمین پر کون ہے اور آسمان پر کون ہے۔

علاقہ یا ملک	تعداد ناحرف شناسان	تعلیم پر گورنمنٹ کا	گورنمنٹ کا خرچ فی کس
	فیصدی	کل خرچ	روپے آنہ پائی
نیو ساؤتھ ویلز	دس اور دس سال والوں میں سے	۱۱۵۶۷۴۹۰ روپے	۸ - ۹ - ۴
وکٹوریا		۱۰۰۰۶۸۰۵ "	۹ - ۶ - ۳
کوئنس لینڈ	۲۲٫۰۸ ہر عمر والوں میں سے	۴۲۹۱۰۸۰ "	۸ - ۸ - ۵
ساؤتھ آسٹریلیا	۱۰٫۵۴ "	تعلیم کیلیے سرکار سے جاگیر وقف ہے۔	
وسٹرن آسٹریلیا	۵ (یونیورسٹی یا زیادہ سال سے)	۲۲۴۳۲۸۰ روپے	۱۱ - ۲ - ۱۱
تسمانیہ	۲۰٫۲۶ (ہر عمر والوں میں سے)	۱۰۱۰۹۸۵ "	۵ - ۱۳ - ۹
ہندوستان	۹۴٫۶۵ "	۱۲۸۵۰۵۱۸ "	۰ - ۰ - ۸

کناڈا میں تمام ذرائع کی آمدنی ملاکر تعلیم کا خرچ تازہ ترین حسابات کی رو سے ۳۶۰۰۵۶۵۱ روپے
کے قریب ہوتا ہے جو فی کس چھ روپے تیرہ آنے چھ پائی پڑا۔ اور ہندوستان میں
آمدنی کے تمام ذرائع و نیز عطایائے سرکاری کو شامل کرکے سنہ ۱۹۰۳-۴ء میں تعلیم پر کل
۲۰۲۴۳۲۴۴ روپے خرچ ہوا جو بحساب مردم شماری ملک فی کس دو آنے سات
پائی پڑا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہی کہ ان نوآبادیوں میں باین قلت محاصل جبری اور کم وبیش مفت تعلیم دینے کا انتظام کیونکر ہوتا ہی۔ اور فی کس پانچ روپے سے بارہ روپے تک صرف کرنے کو کہاں سے آتا ہی۔ اور ہندوستان کی گورنمنٹ باین ہمہ افراط محاصل جو فی کس پورا ایک آنہ بھی نہیں صرف کرسکتی اسکی کیا وجہ ہی۔

اس کا جواب نہایت سہل ہی وہ یہ کہ اُن نوآبادیوں میں اپنی تعلیم کا انتظام بالکل اپنے ہی ہاتھ میں ہی۔ دوسرے یہ کہ یہاں کی گورنمنٹ اپنی موہوم تجاویز کو دیکھے کہ ہماری تعلیم پر متوجہ ہو۔ خدا ہندوستان کو سلامت رکھے نہ روپے کی کمی ہی اور نہ اسکے صرف کی خیالی راہوں کی کبھی سرحد پر کوئی نیا صوبہ قائم کردیا کبھی خلاف جمہور کسی صوبے پر چھُری پھیر دی۔ کبھی کوئی وحشتناک خواب دیکھ کر صدقہ دیا ردّ بلا کیا غرضکہ جب ان ضروری اخراجات سے کچھ پس انداز ہو تو اہل ہند کی تعلیم پر صرف کیا جائے۔

حکمت عملی کے مسائل سے قطع نظر کرکے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہندوستان ہوم چارجز اخراجات ولایت ؁ سے کس قدر تباہ ہوا جا رہا ہی۔ فوجی اخراجات کا رونا الگ رکھا جاتا ہی جو سلطنت کیلیے ہرگز اسقدر ضروری نہیں جسقدر کہ تعلیم ہی۔ پس جبتک ان فضول مدّوں میں ہندوستان کی دولت کا اسراف ہوگا گورنمنٹ تعلیم کے مسئلے کو کبھی حل نہ کرسکیگی۔ پھر اگر اہل ہند اور نوآبادیوں کے انداز پر سلف گورنمنٹ کا مطالبہ کرتے ہیں تو گورنمنٹ کو اُس کے منظور کرنے کی صریح وجہ نہیں نظر آتی۔

تعلیم کی توسیع میں صرف روپے کی ضرورت نہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہی کہ گورنمنٹ کو اس کا شوق ہو حالانکہ یہی مسئلہ سب سے زیادہ کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوا ہی۔ مگر پھر برطانیہ اور خودمختار نوآبادیوں میں یہ بات کیوں نہیں روا رکھی جاتی

تعجب ہو کہ خود مختار ملک میں یہ امر قابل نفرت سمجھا جائے اور بے اختیار ملک میں وہ کسی طرح سے ناگوار نہو!

ایک اور لطف کی بات ملاحظہ ہو کہ جب اہل ہند اپنی کرم فرما گورنمنٹ سے سلف گورنمنٹ کی طلب ظاہر کرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہو کہ "تم لوگ اس قابل تو ہو ہی نہیں، دیکھو ابھی کس قدر لوگ جاہل پڑے ہوئے ہیں؟" اور جب اس جواب پر ادہر سے یہ عرض ہوتا ہو کہ "تو پھر ہمیں تعلیم دیجائے" تو صاف کہدیا جاتا ہو کہ "تعلیم کیلیے روپیہ نہیں ہو" ایسی خفیف پالیسی ایک مہذب گورنمنٹ کے شایان شان نہیں ہو۔ لوگوں کو اب ایجیٹیشن کی قدر معلوم ہو گئی ہو۔ تاوقتیکہ تعلیم جبری اور مفت نہ کر دی جائیگی ایجیٹیشن وہ اپنا قائم رکھیں گے۔ وہ زمانہ دور نہیں ہو جب لوگ بے دھڑک کہیں گے کہ "جب ہم سے ٹکہ ٹکہ کے دام لیے جاتے ہیں تو ہمیں تعلیم کیوں نہیں دی جاتی"۔ اب وقت آ گیا ہو کہ جبری تعلیم کے جاری کرنیکی آزمائش کی جائے۔ حال میں لارڈ منٹو بہادر کیطرف سے جو سرکلر گورنمنٹوں کے نام شائع ہوا ہو وہ ایک برمحل اور عظیم الشان کارروائی ہوئی ہو۔ بڑے شہروں میں بھی بے فیس تعلیم جاری کرنے کی تدبیر پر جلد ہونا چاہئیں۔ ہم لارڈ منٹو کے ان مساعی جمیلہ کے نتیجے کے بہت اشتیاق کے ساتھ منتظر ہیں اور اُمید ہو کہ خاطر خواہ کامیابی ہوگی۔

یہ عمارت جس کی بنا اسوقت پڑی ہو۔ اگر اسکی تعمیر آہستہ آہستہ بھی مگر استقلال کے ساتھ جاری رہی تو ایک روز تمام اہل ہند اس کی چھت کے سایے میں آجائینگے۔

آنریبل مسٹر گوکھلے کا لکچر ہندو مسلمانوں کے اتفاق پر

۱۹؍ فروری کی شام کو ۵ ۱/۲ بجے آنریبل مسٹر گوکھلے نے انڈین مسلم لیگ کی درخواست پر لاہور کے ٹاؤن ہال میں ہندو مسلمانوں کے اتفاق پر لکچر دیا۔ ٹاؤن ہال کی وسیع عمارت

ہر طرف مشتاق ہندو مسلمان سامعین سے بھری ہوئی تھی۔ مسٹر موصوف کی فصیح و بلیغ تقریر کا لب لباب یہ ہے۔)

صاحبو! میں مسلمان برادران وطن کا ممنون ہوں کہ آج اُنھوں نے ہندو مسلمانوں کے اتفاق کے اہم اور ضروری مسئلہ پر مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔ میں اس مسئلہ خاص کے متعلق صوبجات متحدہ کے بعض مقامات پر بھی وہاں کے مسلمانوں کی فرمایش کی تقریر کر چکا ہوں اور میں خوش ہوں کہ اس وقت پھر مجھے اس کی نسبت اظہار رائے کا موقع ملا۔ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ہندوستان کے اندر جتنے معاملات اس وقت معرض بحث میں ہیں اُن میں ہندو مسلمانوں کے اتفاق کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے اور اس کے حل کرنے کے لیے بہت بڑی قوت فیصلہ اعلیٰ درجہ کا تحمل اور ذہن رسا درکار ہے کیونکہ ہندوستان کی آئندہ بہبودی کا دار و مدار اسی سوال کے حل ہونے پر ہے اگر ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی یہی صورت رہی جو اسوقت ہے تو ہندوستان کی بہتری کی ساری اُمیدیں خاک میں ملجائیں گی۔ اور اگر ہندوستان کی یہ دو بڑی قومیں اس سوال کے حل کر لینے میں کامیاب ہوگئیں تو اُن کی فلاح و بہبودی یقینی ہے۔ ہندو مسلمانوں کے اتفاق میں دونوں کا فائدہ ہے۔ مگر قبل اسکے کہ دونوں متفق و متحد ہوں دونوں کو اس پر ٹھنڈے دل سے غور کر لینا چاہیے۔ مجھے گذشتہ زمانیکے ناگوار واقعات کے یاد دلانے کی حاجت نہیں ہے اور میں بلا خوف تردید اس امر پر زور دیسکتا ہوں کہ اس وقت ہندو مسلمانوں کے تعلقات بالکل ناگوار اور یہ دونوں قومیں ایک دوسرے سے کشیدہ خاطر ہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات ان کے باہمی مراسم دوستانہ ہو جاتے ہیں۔ مگر عمومًا ان کے مابین مخالفت و عناد کے آثار نمایاں رہتے ہیں۔ اور خیر خواہانِ وطن کیلیے یہ باتیں سخت دل شکن ہیں کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جبتک یہ حالت قائم رہیگی ہندوستان کو اصلی ترقی کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔

موجودہ حالات کو بنظر انصاف ملاحظہ کیجیے تو آپ کو فوراً معلوم ہو جائیگا کہ بعض فوائد ایسے ہیں جو صرف ہندوؤں کی ساتھ مخصوص ہیں اور مسلمان ان سے قطعاً محروم ہیں۔ یہ فوائد تین طرح کے ہیں (۱) کثرت آبادی (۲) تعلیم (۳) دولت۔ اوّل آبادی کو لیجیے۔ ہندوستان بھر میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے صرف چوتھائی ہی۔ بعض مقامات پر ہندو مسلمانوں کی تعداد مساوی ہی جیسے پنجاب میں اور بعض حصص میں مسلمان ہندوؤں سے زیادہ ہیں۔ جیسے صوبہ مشرقی بنگال و آسام میں جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی کی نسبت ۲ و ۳ ہی۔ مگر باقی حصص ہند میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم ہی۔ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں مسلمان ہندوؤں کا ساتواں حصہ ہیں۔ مدراس میں پندرہواں بمبئی میں پانچواں۔ ممالک متوسط میں پچیسواں اور مغربی بنگال میں ساتواں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہی کہ مسلمان تعداد میں ہندوؤں سے کس قدر کم ہیں اور آبادی کے لحاظ سے ہندوؤں کو مسلمانوں پر کس قدر تفوق حاصل ہی۔ اب تعلیم کے مسئلے کو لیجیے۔ ہندوستان تعلیم کے لحاظ سے بہت پستی کی حالت میں ہی۔ یہ معلوم کر کے شرم آتی ہی کہ ہندوستان کے اندر بالاوسط فی دس مواضع ایک مدرسہ ہی۔ اس صورت میں خاطر خواہ ترقی تعلیم کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ جیسی کچھ حالت ہی اس میں ہندو مسلمانوں سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا فرق آپ اس سے باسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ ہر تین سو ہندوؤں میں ایک اور ہر چھ سو مسلمانوں میں ایک پڑھ سکتا ہی۔ انگریزی تعلیم کا یہ عالم ہی کہ ہندوؤں میں ۱/۴ اور مسلمانوں میں ۱/۸ انگریزی تعلیم یافتہ ہیں۔ اب دولت کی طرف آئیے۔ ہندو مسلمانوں کی دولت کا جدا جدا اندازہ لگانا سخت دشوار بلکہ محال ہی اور ہمارے پاس دونوں کے بالمقابل مالی حالت کے اندازہ کی کوئی سبیل نہیں ہی مگر اس میں ذرا بھی شک نہیں ہی کہ ہندو مسلمانوں کی نسبت زیادہ تر مرفہ الحال اور

فارغ البال ہیں۔
یہ تو وہ فوائد تھے جن سے ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمان محروم ہیں۔ مگر چند ایسے بھی فوائد ہیں جو صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور ہندو اُن سے کسی طرح متمتع نہیں ہو سکتے۔ اوّل تو یہ کہ بخلاف ہندوؤں کے مسلمانوں کا باہر بھی ٹھکانا ہے اور انھیں بیرونی امداد کی بھی اُمید ہے۔ ایک زمانہ میں جبکہ چین اور جاپان بُدھ مذہب کے پیرو تھے۔ اُس وقت ہندوستان کا تعلق ان ممالک سے بھی تھا۔ مگر اب وہ بات نہیں رہی۔ اور ہندوؤں کے واسطے ہندوستان سے باہر کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ لیکن مسلمان ہندوستان سے باہر تک بھی نظر اُمید دوڑا سکتے ہیں اور یہ ایسا فائدہ ہے جو انہیں تک محدود اور انہیں کیلیے مخصوص ہے۔ دوسرا فائدہ جو مسلمانوں کو من حیثیت القوم حاصل ہے یہ ہے کہ اُن کے دلوں میں مذہباً عوام الناس کی خدمت گذاری اور مساوات کا خیال ایسے طور پر جاگزیں ہوتا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی عظمت کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ لیاقت اور قوت کو کام میں لائے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس وصف خاص میں دنیا کی کوئی جماعت اسلام سے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہندو اس فائدہ سے اس لیے محروم ہیں کہ وہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہیں اور ذات پات کی قیدوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور یہ ایک فرق ہے جو مسلمانوں کو ہندوؤں پر فوقیت دیتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے فوائد مخصوصہ میں نے بیان کر دیے ہیں۔ اب میں اُن فوائد کا ذکر کروں گا جو دونوں کو مشترکہ طور پر حاصل ہیں اور جنکی نسبت یہ فیصلہ کرنا سخت دشوار ہے کہ ان سے ہندو زیادہ متمتع ہو سکتے ہیں یا مسلمان۔ ہندوؤں کو شروع ہی سے مذہبی لٹریچر اور فلاسفی میں خاص شغف رہا ہے اور ان کے بزرگوں کو اس میں خاص شہرت حاصل رہی ہے اُنھوں نے فلسفہ مذہب اور مذہبی لٹریچر کے ذریعہ سے انسانی ترقی میں بہت اضافہ کیا۔

لیکن میری رائے میں اس میں مسلمانوں کا بھی کچھ کم حصہ نہیں ہو۔ اس طرح گویا دنیا کی ذہنی و دماغی ترقی میں حصہ لینے کا امتیاز دونوں کو حاصل ہو۔ لیکن مسلمانوں کی عظمت کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جاتا ہو جب ہم یہ معلوم کرتے ہیں کہ تاریخ عالم میں وہ بطور ایک فاتح قوم کے درج ہیں۔

مشرق میں چین اور مغرب میں اندلس تک اسلام کا جھنڈا لہرا چکا ہو۔ انصاف یہ ہو کہ فاتح ہونے کا فخر ایسا ہو جس سے ہندو سرفراز نہیں ہیں۔

یہ تو ان کے محاسن تھے اب ذرا ان کے معائب بھی سُنیے جو تعداد میں محاسن سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ مثلاً عورتوں کے ساتھ دونوں کا سلوک اچھا نہیں ہے اور جو درجہ قدرت نے عورتوں کو بخشا ہو اس سے عورتوں کو محروم کرنیکے لیے دونوں یکساں کوشش کرتے ہیں۔

دونوں میں ایک یہ عیب بھی ہو کہ ان کے اعلیٰ طبقوں کو ادنیٰ طبقوں کی بہبودی کا خیال نہیں ہو۔ مدنیت کی روح دونوں میں نہیں ہو۔ ملکی محبت کا جوش دونوں میں کم ہو۔ یہ خیال دونوں میں سے کسی کو نہیں ہو کہ ہم انسان ہیں اور انسانیت کے حقوق ہمیں حاصل ہیں۔ یعنی انگریزی قوم کی طرح ان میں خودداری کا مادہ بالکل نہیں ہو۔ ان تمام حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہو کہ ان دونوں گروہوں کو ایک دوسرے کی امداد کی سخت ضرورت ہو اور اس کے لیے دونوں کو متفق اور متحد ہو جانا چاہیے۔ اب سوال یہ ہو کہ ان دونوں گروہوں کے اتفاق کی راہ میں کون سی چیز حائل ہو۔ صاحبو! وہ چیز دونوں کے مخالفانہ تاریخی روایات ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو جہاں انھوں نے ہندوؤں کو فتح کیا وہیں اپنے مذہبی جوش کی وجہ سے جبراً لوگوں کو مسلمان بھی کیا

یہ سلسلہ کئی صدیوں تک جاری رہا۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ ایک مسلمان بادشاہ نے سمجھا کہ جبتک سلطنت عقل و انصاف پر مبنی نہو عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ بادشاہ اکبر اعظم تھا۔ اس نے یہ بات محسوس کرلی کہ فتح کیلیے بہادری اور ترقی مذہب کے لیے جوش کی حاجت ہی۔ اور استحکام سلطنت کیواسطے عقل و انصاف درکار ہیں۔ جہانگیر اور شاہجہاں اکبر کے نقش قدم پر چلے۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ میں یہاں تعصب کا لفظ استعمال نہیں کرسکتا۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ مذہبی جوش پھر تازہ ہوگیا۔ اور اُس نے ایک خوفناک پولٹیکل صورت قبول کی۔ اور ناجائز مذہبی جوش سلطنت کے کاموں میں مخل ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی سلطنت کی ہندو رعایا بڑے زور سے مخالف ہوگئی خصوصًا پنجاب میں سکھوں اور مہاراشٹر مین مرہٹوں نے سر اُٹھاکر حکومت کی بنیاد کو متزلزل کردیا اور اسلامی سلطنت ہند کو ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ پھر سنبھل نہ سکی۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ایک کش مکش شروع ہوگئی۔ یہ بتانا مشکل ہی کہ اگر یہ دونوں قومیں اپنے حال پر چھوڑ دی جاتیں تو غلبہ کس کو ہوتا۔ ہندو حکومت کا جوا کندھوں سے اُتار کر بالکل آزاد ہوجاتے۔ یا مسلمان اپنی سلطنت کو دوبارہ مستحکم کرنے میں کامیاب ہوتے لیکن عین اس نازک موقع پر ایک تیسری طاقت آدھمکی جس نے دونوں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھایا۔ اب سوال یہ ہی کہ ان دونوں گروہوں کے اتفاق کی راہ میں کون سی چیز حائل ہی۔ صاحبو! وہ چیز دونوں کے مخالفانہ تاریخی واقعات ہیں۔ صاحبو! روایات کو صفحہ تاریخ سے کوئی مٹا نہیں سکتا۔ اور جبکہ انگریزوں نے اس کا فیصلہ ہی نہیں ہونے دیا کہ تفوق کی کوشش میں غلبہ کسے ہوتا تو ان روایات کی یاد عرصے تک تازہ رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہی۔

یعنی رہنما رہے ہیں کہ اگر ہندو مسلمان ترقی کرنا چاہتے ہیں تو انھیں

میدان ترقی میں دوش بدوش چلنا چاہیے اور جبتک وہ ایک دوسرے سے الگ
رہیں گے ہرگز ترقی نہیں کر سکیں گے۔ دونوں نہ صرف ایک دوسرے کو بلکہ اپنے
آپ کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ مغربی تعلیم نے نئے نئے خیالات ہمارے دماغوں
میں پیدا کر دیے ہیں۔ اور انسانی عزت کا اعلیٰ معیار ہمارے پیش نظر کر دیا ہے اور ہم
سمجھنے لگے ہیں کہ رعایا گورنمنٹ کی خدمت کیلیے نہیں ہوتی بلکہ گورنمنٹ رعایا کی
خدمتگذاری کیلیے پیدا ہوا کرتی ہے۔ ہندو مسلمان دونوں ایک قانون قدرت کے
ماتحت ہیں اور دونوں کی زندگیاں ایک ہی طرح کے حالات میں بسر ہوتی ہیں۔ دونوں
یکساں طور پر انقلاب قبول کرتے ہیں۔ محکوم ہونے کی ذلت دونوں کے سر
ہے۔ جنوبی افریقہ میں کسی ہندوستانی کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان۔ اُس راستہ
سے گذرنے کی اجازت نہیں جس پر گورے رنگ کے باشندے چلتے ہیں۔ کوئی
ہندوستانی عام اس سے کہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ریل کے اوّل درجے میں سفر
نہیں کر سکتا اور نہ اوّل درجے کے ہوٹل میں قیام کر سکتا ہے۔ اس قومی ذلت میں
دونوں شریک ہیں کیونکہ اس کا تعلق کسی خاص فرقے کیساتھ نہیں بلکہ ملک کے
ساتھ ہے۔ پس ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب آنا اور اتحاد و اتفاق
کے ساتھ ملکی بہبودی کی کوشش کا مزہ چکھنا کیسی ضروری بات ہے۔ بعض مسلمان
بھائی کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا فائدہ اس میں ہے کہ وہ ہمیشہ حکام کا ساتھ دیں
اُمید ہے کہ اس نمونے کا کوئی مسلمان اس جلسہ میں نہ ہوگا افسوس ہے کہ اس خیال کے
لوگ معاملے کی تہ تک نہیں پہنچتے اور سطحی واقعات سے نتیجہ نکال لیتے ہیں جو ظاہر ہے کہ
درست نہیں ہو سکتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ غدر کے بعد گورنمنٹ ہندوؤں پر
مہربان اور مسلمانوں سے کھٹکتی تھی اور آج معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس سے
آپ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ان واقعات کو پھر پلٹا کھاتے کیا دیر لگتی ہے جبتک

ہندو مسلمان متفق نہ ہوں گے انگریز انہیں ترقی نہ کرنے دینگے۔ کیا مسلمانوں کی یہ مردانگی ہو کہ پولیٹیکل جنگ تو ہندو کریں اور اس سے فائدہ اُٹھائیں مسلمان۔ کیا یہی انصاف ہو کہ ملکی پالیٹکس میں ہندو تنہا چھوڑ دیے جائیں۔ جبکہ لڑائی کا سبب اور اس کا فائدہ دونوں کیلیے یکساں ہو۔ ملک کے اندر اور باہر دونوں کی پولیٹیکل مشکلات یکساں ہیں جنوبی افریقہ میں جب کوئی ہندوستانی ذلیل کیا جاتا ہو تو وہ محض ایک ہندوستانی کی حیثیت سے نہ کہ کسی مذہبی لحاظ سے۔ پس ایسی حالت میں مسلمانوں کا ہندؤں کو مدد دینا اُن کا کتنا بڑا اخلاقی فرض ہو۔ ہندو مسلمانوں کی ترقی کا مسئلہ اصل میں اُس وقت طے ہوگا۔ جبکہ دونوں میں خودداری کی روح پیدا ہو جائیگی اور دونوں من حیثیت الانسان اپنے رُتبے کو سمجھنے لگیں گے۔

مسلمانوں کے مسئلے میں پہلی بحث یہ پڑتی ہو کہ اگر حکومت کے موجودہ اختیارات زائل ہو گئے تو وہ قلت کیوجہ سے بیس کروڑ ہندوؤں کے مقابلہ میں بمنزلۂ نفی کے ہو جائیں گے اس سلیے وہ کثیر التعداد ہندوؤں پر ان معدودۂ چند حکام کو خواہ مخواہ ترجیح دیتے ہیں۔ بایں خیال کہ اس وقت ہمیں کچھ ملتا تو ہو۔ میری رائے میں ہندوؤں کی بیس کرور کی تعداد تقسیم در تقسیم ہو کر اور ذات پات کے جھگڑوں میں متفرق ہو کر اُن چھ کروڑ مسلمانوں کے برابر بھی زور نہیں رکھتی جو بلحاظ قومیت سب کے سب یکذات ہیں۔ ہمارا آپس کا جھگڑا کوئی مذہبی تو ہو نہیں۔ یہ تو قومی جھگڑا ہو۔ اس سلیے ہمارا خیال ہو کہ آئندہ کا انتظام مذہبی انداز پر نہیں بلکہ قومی انداز پر ہوگا اُس وقت یہ چھ سات کروڑ مسلمان جماعت کا سب سے زیادہ وقیع حصہ ہوں گے اور اگر مجھے اجازت ہو تو میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ یہ قوم ہندی جماعت میں سب سے زیادہ زبردست ہوگی۔ اس کے بعد مسلمانوں کے مسئلے میں "پین اسلامک تحریک" کی بحث آتی ہو۔ اس تحریک کی اعلیٰ صورت کو دیکھکر کوئی راستی پسند شخص ایسا نہ ہوگا

جیسے اس سے ہمدردی ہو۔ کون چاہتا ہو کہ مسلمان ایسی پستی کی حالت میں رہیں۔ میرے خیال میں اگر مسلمان اپنی شوکت ماضیہ کو پھر حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ اسوقت ذرا دشوار ہو۔ مسلمان عیسائیان یورپ کے مقابلے پر کمزور پڑیں گے۔ اگر یہ تسلیم ہو تو مسلمانوں کو اس مقصد کے حصول کیغرض سے اپنی تقویت کی کوئی اور شکل پیدا کرنا چاہیے۔ ٹرکی میں 'ینگ پارٹی' اس کی مثال قائم کر رہی ہو۔ اہل مصر کی صدا ہے کہ مصر مصریوں کا ہو۔ اہل ایران بھی بیدار ہوکر ایران پر ایرانیوں کا حق ثابت کرتے ہیں۔ اب مسلمانان ہند کو چاہیے کہ یہ بھی ہندوستان کو اپنا ملک تسلیم کریں اور اُسی وقت اُن کو انتہائی ترقی نصیب ہوگی۔ واقعی امر یہ ہو کہ مسلمانوں کا یہ خوف بیجا نہیں ہو۔ لیکن اگر فریقین سے یہ خواہش ہو کہ ایک ہی مقصد کی تحصیل کیلیے ہمدست ہوکر سعی کیجائے تو میرا خیال ہو کہ اس میں کوئی مشکل نہیں پیدا ہو سکتی اسی لیے میں کہتا ہوں کہ کانگرس کے پلیٹ فارم پر دونوں فریقوں کو نظر آنا چاہیے۔ پس حضرات مسلمین! آپ لوگ اتفاق پر آمادہ ہو جائیں اور فریقین کے لیڈر بغرض مصالحت یکجا ہوکر تبادلۂ خیالات سے فائدہ اُٹھائیں۔ بلحاظ قومیت دونوں کیلیے مشترک میدان پڑا ہوا ہو۔ اور ہر دو فریق کو چاہیے کہ حصول مقصد کیلیے دوسرے کوشش کرے۔ اب مجھے اپنے ہندو بھائیوں سے یہ اپیل کرنا ہو کہ تم لوگ مسلمانوں سے زیادہ ان کے ساتھ درگذر کا اظہار کرو۔ اور تمھارے اوپر ملکی خدمت کا جو فرض ہو اُس کو تسلیم کرو۔ مسلمان تعلیم میں کم ہیں تو ہندوؤں کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کیلیے اپنے کو وقف کردیں۔ اس بارے میں پرائیوٹ طور پر بھی کوشش کی جائے تو بڑا تغیر پیدا ہو سکتا ہو۔ مثلاً اگر کوئی ہندو ڈاکٹر مسلمانوں کے معالجے کیلیے اپنے کو وقف کرئے تو دیکھیے کہ دس برس میں کس قدر خاطر خواہ نتیجے پیدا ہونگے اسی طرح مسلمان بھی اپنے کو کم ذات ہندوؤں کی تعلیم کے لیے وقف کر کے

خدمت ملکی انجام دیسکتے ہیں۔

خیال کرنے کی بات ہو کہ ہندوؤں کی ایک ربع تعداد سخت ذلت میں پڑی ہوئی ہو جس کو ہم لوگ نجس اور اپنے نام کیلیے باعث ننگ خیال کرتے ہیں۔ اور عیسائیوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا لیا ہو۔ اگر ہم لوگ خود انکی دلجوئی کا خیال رکھتے تو ہمارے گروہ سے اتنی بڑی تعداد نہ نکلجاتی اور اب بھی توجہ کیجائے تو آیندہ کیلیے ہم اس نقصان سے محفوظ ہو جائیں

جب ۳۰ کرور ہندوستانی ۱½ لاکھ انگریزوں سے جو ہمارے ملک میں محض اجنبی ہیں عزت نہیں کراسکتے تو پھر کیا شکایت ہو اگر غیر ملکوں میں ہماری عزت نہ ہو میرے خیال میں جنوبی افریقہ کی بے عزتی کا مسئلہ جنوبی افریقہ میں نہیں۔ بلکہ ہندوستان کے اندر طے ہونا چاہیے۔ جب یہ ہوگا تو دونوں قوموں کے اتفاق میں کوئی چیز حائل نہ ہوسکیگی۔ ہمارے سامنے ملکی ترقی کا سوال ہو نہ کہ مذہبی ترقی کا۔ مغرب میں ہر قسم کی ترقی کا مرکز ملکی ترقی ہی ہو۔ ہم سب ملکی ترقی کا خیال رکھیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہمارے جو فرائض ہیں اُن کا لحاظ کریں۔ فقط

عزیز مرزا محمد ہادی صاحب لکھنوی

ادھر دیکھ نیچی نظر کرنے والے
یہی تیر ہیں دل میں گھر کرنے والے

طلسمات دنیا میں کیا تونے دیکھا
بتا جا ہمیں اے سفر کرنے والے

ترے محشرستان آفات میں عشق
بسر کرتے ہیں یوں بسر کرنے والے

یہی بلبلے باقی ہیں دو ایک قطرے
مری خشک آنکھوں کو تر کرنے والے

نشانِ قدم ہمیں غیروں کے بھی ہیں
اُٹھ اے سجدہ رہگذر کرنے والے

کسی بات پر مسکراتے چلے ہیں
میری خاک سے گذر کرنے والے

عزیز آج مایوس ہوکر چلے ہیں
مداوائے دردِ جگر کرنے والے

تنقید

(۱) پین اسلامزم اور مسٹر گوکھلے

مسئلہ اتفاق مسلمانان و ہنود پر مسٹر گوکھلے کے لاہور ایڈریس کا ترجمہ کسی دوسری جگہ درج کیا جاتا ہے جس کا بغور مطالعہ ہر ہی خواہ ملک کا پہلا فرض ہے۔ معزز مقرر نے جو باتیں لاہور میں بیان کیں وہ اس سے قبل لکھنؤ میں اور پھر علی گڈھ میں بھی پیش کر چکے تھے۔ البتہ لکھنؤ اور علی گڈھ میں آپ نے پین اسلامک تحریک کو راہ اتحاد کی مشکلوں میں سے سب سے بڑی مشکل قرار دیا تھا۔ لیکن لاہور میں اس عقیدے میں کسی قدر ترمیم کردی ہے۔ ہم کو مسٹر گوکھلے کی یہ رائے سراسر غلط فہمی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ پین اسلامک تحریک سے اہل ہند کے مقصد آخری یعنی سلف گورنمنٹ کی تائید ہوتی ہے نہ کہ تردید۔ مسٹر گوکھلے کی اس غلط فہمی کا سب سے بڑا سبب تو تحریک مذکور کے خلاف دروغ نویس انگریزی اخباروں اور مصنفوں کی تحریریں ہیں جو دانستہ اس تحریک کو ایک نہایت خوفناک اور مکروہ شکل میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس سے اُتر کر ہندوستان کے مسلمان اخباروں[1] کا طرز عمل ہے جو پین اسلامک تحریک کے موید ہونیکے ساتھ ہی لازمی طور پر آزادی ہندوستان کے سخت مخالف ہوتے ہیں جس سے یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے اور اسلیے وہ پولیٹیکل ضروریات کے لحاظ سے ہندوستان میں اتحاد بین الاقوام کی اہمیت کے بھی قائل نہیں ہوتے۔

انگریزی اخباروں کی رائے کے مطابق مسٹر گوکھلے کے خیال میں شاید اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں عیسائیوں سے خصوصاً اور دیگر اقوام سے عموماً

---

[1] مثلاً اخبار وطن لاہور مصر و مراکو میں اہل یورپ کے ظلم پر ہمیشہ اعتراض کرتا ہے لیکن ہندوستان میں مسٹر چیدر وناتھ بنرجی کے خلاف پولس کی بیقاعدہ کارروائی پر خوش ہو کر از دیاد سزا کی سفارش ہی کی

جنگ کرکے ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم کیجائے جس میں تمام موجودہ اسلامی سلطنتیں بھی مِل جائیں۔ چنانچہ اسی بنا پر مسٹر گوکھلے نے عیسائی سلطنتوں کے مقابلے میں اسلام کی مجموعی طاقت کی بھی کامیابی کو ایک امر دشوار قرار دیا۔ اور مسلمانان ہند کو نصیحت فرمائی کہ اس خیال خام کو دل سے دور کرکے ہندوستان کو اپنا وطن سمجھیں اور ہر حصۂ دنیا کے مسلمانوں کی نسبت یہ خواہش رکھیں کہ وہ اپنے اپنے ملک میں آزادی اور قوت حاصل کریں ہم مسٹر گوکھلے کو اطمینان دلانا چاہتے ہیں کہ درحقیقت پین اسلامک تحریک کا وہی منشا ہی جو ان کے نزدیک ہونا چاہیے۔ جیسا کہ شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی سکرٹری پین اسلامک سوسائٹی لنڈن نے عید الضحیٰ ڈنر کے موقع پر بیان کیا کہ "سوسائٹی کا ایک مدعا یہ ہی کہ مختلف ممالک کے مسلمانوں کی سوشل، مارل، ایجوکیشنل، نیز پولیٹیکل حالت کو اپنی مختلف حکومتوں کے سایہ اور حمایت میں بہتر و درست کرے۔ کسی جمہی جمائی حکومت کی مخالفت کا سوسائٹی کے ممبروں کے دلمیں خیال تک نہیں۔ البتہ اُن سے یہ نہیں دیکھا جائیگا کہ کسی مسلمان حکومت کے رقبے میں سے ایک ایکڑ زمین بھی کسی غیر مسلم طاقت کے قبضے میں چلی جائے۔ اُن کی خواہش یہ ہی کہ امن کے ساتھ مسلمان اپنی اپنی حکومتوں کے سایہ حمایت میں، جن میں کہ وہ بالفعل موجود ہیں، بڑہیں اور ترقی کریں۔ پین اسلامک تحریک کو نیست و نابود کرنے کیلیے عیسائی سلطنتوں سے اپیل کا جواب یہ ہی کہ اتحاد اسلامی کی اسپرٹ نیست و نابود ہو ہی نہیں سکتی۔ مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں کے ساتھ سوسائیٹی کے تعلقات کی نسبت یہ ہی کہ اُس کے ممبر تمام مسلمان فرمانرواؤں کے ساتھ ادب و عقیدت کے خیالات رکھتے ہیں اور رکھیں گے، جیسا کہ قدرتاً بحیثیت پیرو اسلام ہونے کے، جس کا ایک بڑا مقصد دنیا میں رشتۂ اخوت قائم کرنا تھا، اُنکا فرض ہی۔"

غرض کہ اس تحریک کا اصلی مقصد یہ ہو کہ ٹرکی میں ترک۔ ایران میں ایرانی، افغانستان میں افغان۔ مصر میں مصری، مراکو میں مورس، ہندوستان میں ہندی مسلمان بہرصورت ترقی کریں۔ اور حصول آزادی و اقتدار میں حتی الامکان ایک دوسرے کی اعانت کو اپنے اوپر لازم سمجھیں۔ اور جب یہ مقدمہ ثابت ہو گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اہل انگلستان سے تقاضائے سلف گورنمنٹ میں برادران ہنود کا ساتھ نہ دیں کیونکہ صاف ظاہر ہو کہ جب ملک کی دولت اور قوت ملک ہی کے اندر ملک ہی کے فائدے کیلیے کام میں آئیگی تو صریح ملکی فوائد کے علاوہ مسلمانوں کو ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وہ ایک طرح پر دیگر ممالک اسلامی کی اعانت کے فرض سے بھی سبکدوش ہو سکیں گے یعنی فی الحال جو ہندوستان کی دولت و قوت علانیہ طور پر ممالک اسلام کی تخریب میں صرف کی جاتی ہو اس کا سدباب ہو جائیگا۔ اور یہ ایک کھلا ہوا راز ہو کہ اس وقت ممالک اسلامی کا انگلستان سے زیادہ اور کوئی دشمن نہیں ہو۔ مصری ان کے قبضۂ غاصبانہ سے بیزار ہیں مراکو انہیں کی اجازت اور اشارے سے فرانس کے پنجۂ ستم میں گرفتار ہو۔ سواحل عرب اور خاص ٹرکی میں انہیں کی خواہش سے آتش فساد مشتعل رہی ہو اور ایران کی تجویز تقسیم میں یہی روس کے مددگار ہیں۔ اور یہ امر بھی روز روشن کی طرح عیاں ہو کہ انگلستان کا یہ سارا اقتدار زیادہ تر حکومت ہندوستان کی وجہ سے ہو۔ اگر آج ہندوستان کو حکومت خود اختیاری حاصل ہو جائے تو انگریزوں کی جبروت میں یقیناً بہت کچھ کمی واقع ہو جائے اور تمام ممالک اسلامی کے فنا ہونیکا خطرہ مٹ جائے۔ اور جبکہ یہ امر بھی مسلم ہو کہ ہندوستان کو سلف گورنمنٹ نہیں مل سکتی جبتک کہ مسلمان اور ہندو باہم اس باب میں متفق نہ ہو جائیں تو ارباب بینش پر یہ امر مخفی نہیں رہ سکتا کہ پین اسلامک تحریک سوا آج یا سلف گورنمنٹ

ہندکی تجویز کے منافی نہیں بلکہ موافق ہو۔ دشواری صرف اسقدر ہی کہ ہندوستان کے نادان مسلمان ابھی تک اس مسئلے کو بخوبی سمجھے نہیں ہیں اور بعض جو سمجھے بھی ہیں وہ اپنے ذاتی یا خفیف مقامی فوائد کو دنیائے اسلام کے فائدے پر ترجیح دیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو ہدایت کرے۔

(۲) جدید اُردو رسالے

ہندوستان کے نئے اُردو رسالوں میں رسالہ آزاد لاہور۔ ہمالہ لاہور۔ پنجاب جزل سیالکوٹ۔ بھارت ماتا لاہور۔ معیار لکھنؤ قابل ذکر ہیں۔ اور قابل اطمینان امر یہ ہی کہ معیار کے سوا باقی سب رسالے پالٹیکس سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض تو اسیکے لیے وقف ہیں۔ خصوصاً

(الف) بھارت ماتا لاہور

اپنے پولیٹکل خیالات اور عقائد کے اظہار میں سب سے زیادہ بیباک ہی۔ اور اس حیثیت سے ہم نہایت خوشی کیساتھ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ زبان اس رسالے کی اچھی نہیں ہی ورنہ ہم اسکے بعض مضامین کا اقتباس درج کرتے۔ ایڈیٹر صاحب کو اس نقص کی اصلاح ضرور اور جلد کرنا چاہیے۔ حجم ۲ جزو قیمت صرف عہ سالانہ۔

(ب) پنجاب جزل سیالکوٹ

غلام قادر صاحب فصیح کے اہتمام سے ماہ مارچ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے اس کا بھی حجم ۴ جزو اور قیمت عہ سالانہ ہی۔ پہلے مضمون "ہندو مسلمان" کے ضمن میں ایڈیٹر صاحب اپنی پالیسی کا اظہار اس طور پر کرتے ہیں کہ "ہماری پالیسی ہندو مسلمان اور دیگر اقوام ہند میں اتحاد اور اتفاق بڑھانا ہی۔ کیونکہ زیادہ تر اسی پر ہندوستان کی بہتری اور بہبودی منحصر ہی۔ ہندوستان کے لیڈر بیس بائیس سال متواتر پولیٹکل

جد وجہد کے بعد آخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جبتک ہندو مسلمان پولیٹیکل معاملات میں یک زبان اور یک دل نہو جائیں تب تک ہندوستان کی بہتری کی کوئی اُمید نہیں ہوسکتی -

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے کانگریس سے پہلو تہی کرنے میں غلطی کھائی مگر اس غلطی کی اُنھوں نے ایسی سزا پائی ہو کہ وہ کبھی اس کو فراموش نہیں کرسکینگے اور دستِ افسوس مل مل کر یاد کیا کرینگے - وہ سزا یہ ہو کہ پچیس سال پہلے جو ہندوؤں کی نسبت رائے قائم کیجاتی تھی وہ اب مسلمانوں کی نسبت قائم ہورہی ہو - اور جو مسلمانوں کی نسبت ظاہر کیجاتی تھی وہ اب ہندوؤں کی نسبت قائم ہورہی ہو - ہندوؤں کی نسبت یہ رائے تھی کہ وہ نسبتاً زیادہ خوشامدی زیادہ خودغرض اور زیادہ تنگ دل ہیں - اور مسلمان نسبتاً زیادہ منچلے زیادہ فراخ حوصلہ اور زیادہ وسیع دل ہیں - مگر ہندوؤں کی بائیس سالہ پولیٹیکل جد وجہد اور مسلمانوں کی کنارہ کشی کا یہ نتیجہ ہوا ہو کہ معاملہ بالکل دگرگوں ہوگیا ہو - ہندوؤں میں اخلاق فاضلہ پیدا ہوچلے ہیں - اور مسلمانوں میں اغلاق رذیلہ - ہندو یک زبان یک دل اور ایک قوم بنتے چلے جاتے ہیں اور مسلمان نہ یک زبان رہے ہیں نہ یک دل اور نہ ایک قوم - کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ بڑی بھاری کمزوری ہو - کہ وہ جس طرف توجہ کرتے ہیں حد اعتدال سے نکلجاتے ہیں - ابتدا میں داری انگریزی میں رعونت ظاہر کی تو وہ - اور اب جو خوشامد شروع کی تو یہ - رعونت کی یہ سزا پائی کہ ہر ایک بات میں اپنے ہندو بھائیوں سے پیچھے رہ گئے ہیں اور خوشامد کی سزا یہ پائی کہ قومیت جاتی رہی جمیعت اُٹھ گئی - غیرت ملیا میٹ ہوگئی - یہ بڑی بھاری سزائیں ہیں جو مسلمانوں کو اپنی غلطی کیوجہ سے بھگتنی پڑی ہیں مگر افسوس ہو کہ باوجود ایسی سزا پانے کے پھر وہ ٹیڑھی چال چل رہے ہیں - آل انڈیا محمڈن ڈیپوٹیشن اور آل انڈیا مسلم لیگ بالکل غلط چال میں

ہندو بیس سال مانگ مانگ تھک گئے تو مسلمانوں نے اب مانگنا شروع کیا ہی جس طریقہ کا ہندوؤں نے بیس سال تجربہ کیا اس پر مسلمانوں نے چلنے کی ابتدا کی ہی بیس سال مسلمان پہلے ضائع کر چکے ہیں بیس سال اور ضائع کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں ۔ گذشتہ بیس سالوں کو اب رو رہے ہیں بیس سال بعد پھر ان کا ماتم کرینگے ۔ اُنکی عمر بس رونے اور ماتم کرنے ہی میں گذر جائیگی “

ہم کو بھی مندرجہ خیالات سے پورا اتفاق ہی ۔

(ج) معیار لکھنؤ

حکیم سید علی محسن خان صاحب آر لکھنوی کے اہتمام سے لکھنؤ نخاس جدید سے ماہوار شائع ہوتا ہی ۔ سالانہ قیمت عہ ہی ۔ اس رسالے میں جتنی غزلیں شائع ہوتی ہیں اُنکی زبان مستند اور مذاق بھی صحیح ہوتا ہی جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہی کہ لکھنؤ کی شاعری کا انداز ضلع جگت کے عیوب سے پاک ہو کر سادگی اور اثر کے صفات کو حاصل کرتا جاتا ہی ۔ ملاحظہ ہو

غم نہیں گر اتنے صدموں کے مقابل ایک ہے	ناطق	میں سراپا دل ہوں کیا پروا اگر دل ایک ہے
پھر پلٹ کر دیکھ لے صدقہ نگاہِ ناز کا	محشر	جانے والے اس طرف بھی نیم بسمل ایک ہے
دشمنِ جاں دردِ فرقت جانستاں نازِ وصال	ارم	ہجر ہو یا وصل ہو دونوں کا حاصل ایک ہی
ایک سرگشتہ ہی گردابِ محیطِ عشق میں	صفی	خندہ زن خمیازہ کش بالائے ساحل ایک ہی
بسملِ تیغِ کشتگانِ غمزہ دیکھا چاہیے	"	ہاتھ لاکھوں گوشۂ دامانِ قاتل ایک ہے
اک اشارہ اس کا کافی ہی مگر ہو تو سہی	عزیز	مشکلوں کا سہل کرنا بھی تو مشکل ایک ہے
بجز تحیر کچھ نہیں صورتکدہ میں حسن کے	صفی	جس طرف جاتا ہوں آئینہ مقابل ایک ہی
اضطرابِ شوق کی ہم وحشیوں کے حد نہیں	"	گرمیِ رفتار تا پایانِ منزل ایک ہے
تجھسے واعظ کیا کہوں کیفیتِ بزمِ شراب	ارم	وہ بھی اپنے رنگ کی دنیا میں محفل ایک ہی

اک ہلال عید سے ہوتی ہے عالم کو خوشی	ناطق	غم ہو جا نبازوں کو کیوں گر تیغ قاتل ایک ہے
بزم حسن اور حسن اختلاف اتنا مذاق عشق کا	صفی	ہم تن تنہا صفی محفل کی محفل ایک ہے

مصرع طرح کے ہمراہ چند قافیے بھی لکھدیے جاتے ہیں اور انھیں قافیوں پر طبع آزمائی کی جاتی ہے۔ لیکن ہم اس پابندی قوافی کی دشواری کو پسند نہیں کرتے۔

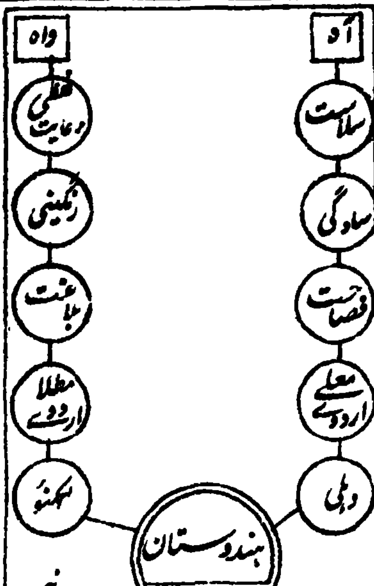
(د) غنچۂ جاوید بمبئی (قیمت سالانہ ۲)

بھی اپنی وضع کا اچھا گلدستہ ہے۔ ماہ گذشتہ کے اُردوئے معلے میں کیٹس کی نظم کا ترجمہ "بلبل" اسی سے نقل کیا گیا تھا۔ حصۂ نظم میں بھی اکثر اچھی اچھی غزلیں شائع ہوتی ہیں ملاحظہ ہو

جُدا یہ کہ کے دل ناصبور میں نے کیا	جلال	کہ ایک فساد تھا پہلو سے دور میں نے کیا
بُرا نہ مانو اگر ذکر حور میں نے کیا	جلیل	غرور تم نے کیا تھا قصور میں نے کیا
تمھیں کچھ اور سوا تم کے کون کہتا تھا	״	جناب میں نے بنایا حضور میں نے کیا
وہ قتل عام کو نکلے ہیں ایک تماشا ہے	״	ہر ایک سوچ میں ہے کیا قصور میں نے کیا
اب اس کو پردہ دری سمجھو یا کچھ اور کہو	״	تمھارے حُسن کا چرچا ضرور میں نے کیا
وہ غمزدہ ہوں کہ فوراً ٹپک پڑے آنسو	احد	اگر نظارۂ بزم سرور میں نے کیا
کسی کا شکوہ عشق عدو پہ یہ کہنا	برتر	نہیں کیا بھی تو اب ہاں ضرور میں نے کیا
نقاب پردۂ گستاخیٔ وصال بنی	״	وہ جب خفا ہوئے عذر سرور میں نے کیا
جنوں زدہ ہوں میں دیوانہ ہوں مجھے تسلیم	شمشاد	مگر کہو کہ تجھے ناصبور میں نے کیا
خجل ہوں حشر میں ناکردہ جرم سے برتر	برتر	قصور رحمت رب غفور میں نے کیا

(۳) اختلاف اللسان

یعنی دہلی اور لکھنؤ کی زبان کے الفاظ اور محاوروں کا فرق مولفہ منشی وجاہت حسین صاحب صدیقی جھنجھانوی۔ حجم ۴۰ صفحے۔ قیمت ۱۰/ ۔ کتاب مؤلف سے لاہور رفاہ عام اسٹیم پریس کے پتے سے ملیگی۔



اس کتاب کے آغاز میں مولف نے ۱۱ صفحوں کا ایک دلچسپ دیباچہ لکھا ہے جس میں لکھنؤ اور دہلی کے مذاق شاعری کا فرق دلپسند طور پر ظاہر کیا گیا ہے اور سرورق پر بھی شجرِ اُردو کی تصویر میں لکھنؤ اور دہلی کے کلام کی خصوصیتیں یعنی واہ اور آہ کی کیفیت بہت خوبی کیساتھ نمایاں کیگئی ہے۔ چنانچہ ہم بھی اس موقع پر اس کو ملاحظۂ ناظرین کیلیے نقل کرتے ہیں۔

کتاب کا مضمون نہایت دلچسپ ہے اور الفاظ و محاورات دہلی و لکھنؤ کے جمع کرنے میں مؤلف کی محنت اور کوشش بھی قابل داد ہے لیکن افسوس ہے کہ لکھنؤ کے محاوروں کے متعلق مولف نے کافی تحقیق و تدقیق سے کام نہیں لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسمیں سے نصف سے زیادہ الفاظ اور محاورے یا تو لکھنؤ میں بولے ہی نہیں جاتے یا اگر کبھی بولے جاتے تھے تو اب بکلّم متروک ہوگئے ہیں۔ اور اس نقص کا سبب غالبًا یہ ہے کہ حضرت وجاہت نے مروجہ زبان لکھنؤ سے اطلاع ہم نہیں پہنچائی اور اپنی تلاش کو صرف بحر و قلق و امانت وغیرہ کے کلام یا حضرت جلال کی لغت تک (جو درحقیقت رشک کے زمانے کی تالیف ہے) محدود رکھا ہے۔ ذیل میں ہم بطور نمونہ چند الفاظ اور محاوروں کی نسبت مولف کی غلط تحقیق کی کیفیت دکھانا چاہتے ہیں۔

(۱) وہ محاورے جو لکھنؤ میں مستعمل نہیں ہیں حالانکہ حضرت وجاہت ان کو خصوصیت کے ساتھ لکھنؤ سے منسوب کرتے ہیں۔

(۱) ادھیلا۔ "لکھنؤ میں پیسے کے نصف حصے کو کہتے ہیں اہل دہلی دھیلا بولتے ہیں"۔

(۲) ادھیلی "نصف روپیہ۔ لکھنؤ میں بولا جاتا ہے۔ دہلی والے دھیلی کہتے ہیں"۔

ادھیلا ادھیلی لکھنؤ کی زبان نہیں ہے۔ وہاں بھی دھیلا اور دھیلی بولتے ہیں بلکہ دھیلی علیحدہ اٹھنی کی بجائے مستعمل بھی نہیں ہے۔ روپیہ دھیلی البتہ سننے میں آتا ہے۔

(۳) بادبہنا" لکھنؤ میں ہوا چلنے کو کہتے ہیں"۔ ہمنے کسی کو بادبہنا بولتے نہیں سُنا۔

(۴) بروا" لڑکا چھوکرا معصوم"۔ یہ لفظ بھی اس معنے میں کبھی سننے میں نہیں آیا۔

(۵) ٹکی لگانا۔ یعنی گھورنا

(۶) تانسنا۔ چشم نمائی کرنا۔

(۷) حلوا نکلجانا۔ کنایہ ہے بیحال ہو جانیسے بسبب محنت و مشقت

ان میں سے کوئی لفظ لکھنؤ میں مستعمل نہیں ہے۔ قدیم زبان ہو تو ہو

(۸) گرگا" اہل لکھنؤ بدکار و بدوضع کو گرگا کہتے ہیں"۔ یہ بیان غلط ہے

(۹) گوندی" یہ لفظ پنجاب اور لکھنؤ میں اسی طرح بولا جاتا ہے اہل دہلی گوندنی کہتے ہیں"۔ ممکن ہے کہ پنجاب میں گوندی کہتے ہوں لیکن اہل لکھنؤ تو گوندنی کہتے ہیں۔

(۱۰) گھنگھور لڑائی۔ محاربہ عظیم

(۱۱) گھمسن پٹی۔ زدوکوب

(۱۲) گھوسے میں ڈالنا۔ الجھاؤ میں ڈالنا۔

(۱۳) لنگوٹیا یار جس سے عہد طفلی سے یارانہ ہو

ان میں ایک بھی لکھنؤ کا محاورہ نہیں ہے۔ گھن گرج۔ اور لنگوٹیا یار البتہ مستعمل ہیں

(۲) زبان قدیم جواب متروک ہے

(۱) سُنکر۔ لکھنؤ میں میوہ فروش کو کہتے ہیں۔ امانت ؎

گھر سے تو میوہ فروشونکو اگر دیتا صدا غیر سنکر کی طرح آواز سنکر بولتے

(۲) قہاقا۔ بجائے قہقہہ ؎ برق مسکرایا جو نظر آئے دہن غنچہ نکے + کبک کی چال جو دیکھی تو قہاقا مارا

(۳) کاندھی دے جانا۔ پہلو تہی کرنا۔ ٹال جانا

(۴) ٹھہرانا۔ کسی کو طنز کی بات کہنا۔

یہ دونوں محاورے اب لکھنؤ میں نہیں بولے جاتے

(۳) وہ محاورے جو دراصل لکھنؤ کی زبان میں نہیں ہیں بلکہ محض رعایت لفظی کے خیال سے بعض جگہ شعرا انکو باندھ گئے ہیں

(۱) دھاگا دینا۔ یعنی فریب دینا دھوکا دینا۔ رشک ؎

ہے بند و بست حُسنِ خطِ زلفِ عارضی
دھاگا نہ دیجیے ہمیں دام و کمند سے

دَم دھاگا۔ یا دم جھانسا البتہ مستعمل ہے۔ رشک نے محض لفظی رعایت کے خیال سے دھاگا نہ دیجیے لکھا ہے۔

شگوفہ دکھانا۔ بلا میں پھنسانا۔ بحر لکھنوی۔ ؎

تخمِ الفت نے شگوفہ یہ دکھایا مجھکو
دشت پرخار کے کانٹوں میں لٹایا مجھکو

لوہا برسنا۔ کنایہ ہے بہت تلوار چلنے سے۔ (بحر) ؎

بھویں بالوں سے ہیں شمشیر ابری
کہیں عشاق میں لوہا نہ برسے

(۴) تاریخ کلکتہ

مؤلفہ مولوی بدر الزمان صاحب بدر تخلص سابق اسسٹنٹ سنٹرل جوبلی انسٹیٹیوشن کلکتہ جسمیں زبان سلیس شہر کلکتہ کی دلچسپ تاریخ اور حدود ہند میں انگریزوں کے ابتدائی اسفار کا تذکرہ قابل تعریف تلاش و تحقیق کے بعد درج کیا گیا ہے۔ حجم ۱۰۴ صفحے قیمت ۱۲ مؤلف سے ملنے ۴۲ مولوی اسمٰعیل اسٹریٹ کلکتہ کے پتہ سے ملیگی "۔ اسنے نواب شائستہ خاں گورنر بنگال کے حال میں لکھا ہے کہ ۱۶۸۶ء میں اعانت باغیان بہار کے شبہے میں انگریزوں کی تجارت یک لخت موقوف کردی اور اُن کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا کہ کچھ دنوں کیلیے بنگال سے انگریزوں کا تعلق بالکل منقطع ہوگیا۔ پس انگریزوں خصوصاً مسٹر فلر کا شائستہ خاں سے ناراض ہونا اور ہنگامہ تقسیم بنگال میں بیجا طور پر اُسے نہایت ظلم مجسم قرار دینا بے وجہ تھا لیکن بقول مؤلف " شائستہ خاں کے ہموطن اُسے کمال عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مرحوم کو ملک کا سچا بہی خواہ اور جان نثار تصور کرتے ہیں۔ اسکی نوازش خسروانہ عنایات کریمانہ اور الطاف بیکراں زبان زد خلائق تھے۔ انگریزوں کی نظروں میں اس گورنر کے اطوار اور برتاؤ ظالمانہ اور وحشیانہ دکھائی دیتے ہیں۔ مگر اسکے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ فرقۂ انگلشیہ بسا اوقات گورنر مذکور سے بیموقع چھیڑ چھاڑ کرتا اور جا و بیجا اسکے اشتعال کو بھڑکاتا رہا علاوہ بریں مغربی سوداگروں کے برتاؤ شہر میں عموماً سفلہ اور گستاخانہ ہوتے رہے "۔

زہرہ

(المعروف بہ مشیر نسوان مصنفہ مسز ہمایوں میرزا بیرسٹر ایٹ لا، حیدرآباد دکن)

جو کتاب اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اور جس پر ہم ریویو کرنا چاہتے ہیں وہ ایک ایسی قابل عزت خاتون کے زور قلم کا نتیجہ ہے جس نے گھر کی چار دیواری کے اندر محض اپنے عزیزوں کی توجہ سے کچھ سیکھا اور پڑھا ہے اور آج استفادے کے درجے سے نکل کر اپنی ہم قوم بہنوں کے افادے پر کمر ہمت باندھی ہے؛ اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد

یہ معزز خاتون ایک ایرانی الاصل بزرگ، ڈاکٹر میرزا صفدر علی مرحوم سرجن گوشہ محل آرٹلری حیدرآباد دکن کی بیٹی اور مسٹر سید ہمایوں مرزا بیرسٹر ایٹ لا کی زوجہ محترمہ ہیں۔

زہرہ، جس کا دوسرا نام مشیر نسوان ہے، مسز ہمایوں میرزا کی پہلی تصنیف ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ ایک مسلمان خاتون کے زور قلم کا نتیجہ ہے، بہت کچھ قابل تحسین ہے۔ مسز ہمایوں کی روشن خیالی انکی کتاب کے دیباچہ سے ظاہر ہوتی ہے جس میں وہ چند ابتدائی سطروں کے بعد تحریر فرماتی ہیں:-

"گو بعض نیکدل لوگ عورتوں کی تعلیم کی فکر میں بھی ہیں، لیکن ایک تو اُن کی تعداد کم ہے، دوسرے جس قدر وہ باتیں بیان کرتے ہیں اُس قدر عمل کر کے نہیں دکھاتے"

ایک چار دیواری کے اندر بیٹھنے والی خاتون کا یہ ریمارک مردوں کی نسبت جو معنے رکھتا ہے، اُسکو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو سمجھ سکتے ہیں! اور جو نہیں سمجھتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، خدا ان کی حالت پر رحم کرے۔ لائق مصنفہ کا یہ لکھنا کہ "بعض نیکدل لوگ عورتوں کی تعلیم کی فکر میں بھی ہیں" خدا جانے کیا اثر رکھتا ہے کہ سچے نیکدل

لوگو پر تازیانے کا کام کرتا ہی! اور "بھی" کا جانگداز لفظ دل میں برچھی کیطرح چبھتا ہی. افسوس ہے اُن لوگوں پر جو کہتے سب کچھ ہیں" مگر عمل کرکے نہیں دکھاتے"

واقعی بات یہ ہی کہ تعلیم نسواں کا مسئلہ جسقدر اہم ہی اُسی قدر اس کی جانب سے بے پروائی و بے التفاتی کیجا رہی ہی. نیا گروہ کہیں کہیں سے "عورتوں کو پڑھاؤ" کی صدا بلند کرتا ہی، مگر جب پوچھا جاتا ہی کہ "کیا پڑھاؤ، اور کیونکر پڑھاؤ؟" تو اکثر یہی سوال صدائے بازگشت کی طرح پھر سُنائی دیتا ہی. مگر بعض اوقات ایسی ایسی عجیب و غریب نغمہ سرائیاں کی جاتی ہیں جو بظاہر تو نہایت دلفریب اور پر اثر معلوم ہوتی ہیں. لیکن مرغان چمن کے چہچہوں سے زیادہ بامعنی نہیں ہوتیں. اور بقول مسز ہمایوں کے "عورتوں کا فرقہ بجائے ترقی کے تنزل کر رہا ہی" جسکی حالت اُسوقت تک درست نہیں ہو سکتی جبتک کہ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی آزادی کیساتھ پبلک اسکولوں میں تعلیم نہ دیجائے. یہی وجہ ہی کہ آج ایک پردہ نشین خاتون بھی اس بات کو محسوس کر رہی ہی کہ:-

"بے تعلیمی کے سبب اُن خوبیوں میں سے ابھی کوئی حصہ اُن کو نہیں ملا ہی جو نئی تہذیب و شائستگی سے اُن کو حاصل ہونا چاہیے تھا. بلکہ بوجہ جہالت کے نئی روشنی اور نئے خیالات نے اُنپر بُرا اثر ڈالا ہی"

جو اعتراض مصنفہ کے مذکورۂ بالا جملے سے عائد ہوتا ہی اُس کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟ وہی جنھوں نے رفتار زمانہ سے مخالفت کی، اور یہ نہ سمجھے کہ اس قوت کا مقابلہ کرنا طاقت بشری سے خارج ہی. مغربی تہذیب کو ہندوستان میں قدم رکھے ہوئے سو برس سے زیادہ ہو گئے ہیں! اگرچہ ہم نے ہر طرح کشش و کوشش کی کہ لکیر کے فقیر بنے رہیں، اور زمانے کی مخالفت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں، لیکن بعد خرابی بصرہ کرنا ہی پڑا جو کرنا چاہیے تھا! اور نتیجہ یہ ہوا کہ آج دوسری قومیں ہم سے کوسوں نہیں بلکہ منزلوں آگے ہیں. انگریزی تعلیم کا حاصل کرنا گناہ کبیرہ سمجھا گیا، مگر جب دیکھا کہ

روشیاں بغیر انگریزی دانی کے میسر نہیں آتیں تو اس کی اباحت کے فتوے جاری ہوگئے
بیس برس سے طلب حقوق کیلیے نیشنل کانگرس کی بنیاد قائم ہی مگر مسلمان آجتک اُس کی
شرکت کو بدعت ہی خیال کرتے رہے۔ آخر جب ہزار سالہ بنیاد دیکھتی متزلزل اور
ہندؤوں سے پوری مخالفت ہوچکی، اور سرکاری رحم کے آرزومند پبلک سروس سے
تقریباً بالکل خارج ہوچکے تو اُس وقت آل انڈیا محمڈن ایسوسی ایشن کی سوجھی جو ابھی تک
دودھ کے اُبال سے زیادہ باوقعت نہیں کہی جا سکتی۔

اسی طرح ایک ہمدرد قوم بزرگ نے حیدرآباد میں اب سے پندرہ برس پہلے
جب تعلیم نسوان پر توجہ دلائی اور بے بس عورتوں کی حمایت میں اپنی کانپتی ہوئی
آواز کو بلند کیا، تو اُس پر کیا کیا آفتیں نہیں ڈھائی گئیں، یہانتک کہ اُس کی زبان کو
قفل لگا دیا گیا اور اُس کا قلم توڑ دیا گیا۔ مگر الحق یعلو ولا یعلیٰ! اس وقت ہم دیکھتے
اور خوشی سے دیکھتے ہیں، کہ جو مبارک الفاظ اُس پیرمرد کی زبان و قلم سے نکلے تھے
آج وہ خود عورتوں کی زبان و قلم سے نکل رہے ہیں! اور جس بے بس فرقے کی حمایت
میں اُس نے سعی مخلصانہ شروع کی تھی وہ فرقہ خود اپنے حقوق کو سمجھنے اور اپنی حالت
کو محسوس کرنے لگا ہی۔

اسکے بعد مصنفہ لکھتی ہی "تعلیم نسوان جب ابتدائی حالت میں چھوڑ دی جاتی ہی،
ایک خطرناک اثر رکھتی ہی۔ کیونکہ خیالات کی اصلاح کے بغیر حرف آشنا ہو جانا اخلاق
کیلیے مفید نہیں ہی"

یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ آیا خیالات کی اصلاح گھر کی چاردیواری کے
اندر مقید رہ کے اور ذلیل ماماؤں کی صحبت میں بیٹھ کے ہو سکتی ہی، یا اُس کے لیے
عمدہ سوسائٹی اور اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہی؟ اور اگر ضرورت ہی تو کیا اعلیٰ تعلیم اور عمدہ
سوسائٹی اسی چاردیواری کی جنت کے اندر ہو سکتی ہی؟

دیباچہ میں ایک اور مثال مصنفہ کی عالی خیالی اور بلند حوصلگی کی ملتی ہی۔ لکھتی ہیں کہ

"میری رائے میں عورتوں کو اپنے تمام کام مردوں ہی پر چھوڑ دینے چاہئیں، بلکہ خود بھی اپنی تعلیم کی فکر میں مشغول ہوں، اور ایسے ذرائع بہم پہنچائیں جو حصول تعلیم میں مدد دینے والے ہوں"

آگے چلکے لکھتی ہیں:- "افسوس ہی کہ ہم لوگوں کی بدقسمتی سے اُردو زبان میں اخلاقی تعلیم اور عام معلومات کا ذخیرہ اسقدر کم ہی کہ وہ عام طور پر اُن لڑکیوں کے ہاتھوں میں نہیں پہنچتا ہی جو اپنا کچھ وقت مطالعے میں صرف کرنا چاہتی ہیں"

ان دونوں فقروں میں جو طنز مردوں پر کیگئی ہی، اور اُن کی پست خیالی اور دون فطرتی پر جو اعتراض وارد ہوتا ہی، اس پر بجز سر جھکا لینے کے اُنگلی رکھنے کی گنجایش نہیں۔ درحقیقت اُردو میں درسی کتب کی کمی اس درجہ پر ہی کہ اُن کا وجود و عدم برابر ہی۔ ہمارے اہلِ قلم کا فرض اولی ہی کہ وہ ضروری درسی کتابوں کے مہیا کرنے پر متوجہ ہوں۔

اگرچہ ہماری رائے میں لڑکوں اور لڑکیوں کے عام نصاب و معیار تعلیم میں کوئی فرق و امتیاز نہ ہونا چاہیے، پھر بھی عام خیالات کے بموجب بھی تو لڑکیوں کیلیے بجز مولانا نذیر احمد کی کتابوں کے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اور جو چند کتابیں علاوہ ان کے اس سبجکٹ پر لکھی گئی ہیں جن میں سے ایک لاثانی اُستانی، اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، وہ نہ تو لڑکوں کے کام کی ہیں، اور نہ لڑکیوں کے۔ تاہم چونکہ مراۃ العروس وغیرہ کے بعد لاثانی اُستانی اور مشیر نسواں ہی اس سلسلے میں زیادہ قابل لحاظ ہیں، لہذا ہم دونوں پر مقابلۃً ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

لاثانی اُستانی کی اجمالی تقسیم تین مباحث پر ہی، تاریخ و جغرافیہ، اخلاق و انتظام خانہ داری، مبادی علوم فلسفی۔ کتاب کی بنیاد بالکل اُسی خاکے پر رکھی گئی ہی جو

مولانا نذیر احمد نے مراۃ العروس و بنات النعش میں کھینچا ہے۔ مگر جو رنگ اس سادہ خاکے میں بھرے گئے ہیں وہ ایسے بھدے اور بھونڈے ہیں کہ اصل تصویر بالکل بگڑ گئی ہے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہی تصویر ہے۔

فاضل دہلوی نے حسن آرا کیلیے اصغری کے گھر مکتب خانہ کھولا ہے' علامہ ناظم نے شمسی بیگم کا گھر تجویز کیا ہے۔ نقاش ثانی نے رخصت کا مضمون بدل کے باندھا ہے تاہم سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ اُس نے بیگم بھوپال کو بجنسہ مراۃ العروس سے لیا اور حضرت عائشہ صدیقہ کو بجائے ملکہ وکٹوریہ کے اختیار کیا۔ وہاں قصّے کے درمیان ان کی قابلیتوں کا ذکر بسبیل حکایت آگیا ہے' انھوں نے افتخار الملک کی زبانی ایسے موقع پر ڈہرایا جب وہ بیوی کو بیٹی کے مکتب بھیجنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ نصوح کی کہانی تو کھلا ہوا اقتباس ہے' اور خاتمہ کتاب میں اصغری کی الوداعی تقریر پر شمسی بیگم کی زبانی کس قدر تصرف کیساتھ تصرف کیا ہے۔

تاریخی حصے میں آنحضرت کے حالات لکھنے میں انجمن حمایت اسلام کی کتابوں کی تقلید کیگئی ہے' اور چند اور واقعات اسلامی تاریخ کی معمولی کتب سے اخذ کرکے اضافہ کیے گئے ہیں۔ جغرافی حصے کے متعلق اسقدر غلو کیا گیا ہے کہ بالکل دور از کار ہوگیا ہے۔ جن لڑکیوں کو باقاعدہ تعلیم نہیں دیگئی ہے' اور وہ گھر میں کچھ تھوڑا بہت پڑھکے حرف شناس ہوگئی ہیں (اس لیے کہ اس قسم کی کتابیں ایسی ہی عورتوں کے لیے موضوع ہیں) انکے سامنے نامانوس اور وحشت انگیز اصطلاحوں اور ناموں کی اتنی بڑی فہرست پیش کردی گئی ہے کہ جس کو دیکھ کے وہ پڑھنے کے بجائے پڑھنے کے نام سے بھاگنے لگیں۔

علی ہذا جو ابواب عالم اجسام' ہوا کے عجائبات وغیرہ کے عنوان سے لکھے گئے ہیں' اُنکے پڑھنے کیلیے تو وہ مرد بھی آمادہ نہیں جو انگریزی تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تضیع اوقات سے مصنف کا کیا منشا ہو؟ کیا واقعی یہ کتاب عورتوں کے فائدے کیلیے لکھی ہو یا محض اپنی قابلیت کا اظہار مقصود تھا؟ ورنہ جو کتابیں عورتوں کی خانگی تعلیم کے لیے تصنیف کی جائیں اُن میں ایسے خشک اور ٹھوس مضامین کو مطلق دخل نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ ایسی اخلاقی اور علمی باتیں ہونی چاہئیں جنکے پڑھنے سے موجودہ نسل کم ازکم اس قابل ہو جائے کہ اگر آئندہ نسل کو بنا نہ سکے تو بگاڑے بھی نہیں۔

اس کتاب کا تیسرا فیکٹر جو اخلاق اور خانہ داری پر متضمن ہو وہ بیشک عورتوں کے حق میں کارآمد ہوسکتا تھا، مگر افسوس کہ ان دو بابوں میں بھی مصنف نے خیال بزرگ پرستی کو نہیں چھوڑا اور ان کو بھی منقولات سے بھر دیا۔

حضرت ابوبکر کا خطبہ، اکل حلال کی ایک حکایت، خوف عقبیٰ، بیت المال میں احتیاط، صدقہ وسخاوت، رعایا کی خبرگیری، عیش وعشرت دنیاوی سے نفرت، انصاف صبروقناعت، ایسے عنوان ہیں جنکو ہمیشہ ہمارے واعظ مسجدوں میں بیان کرتے چلے آئے ہیں، اور اب بھی صدہا ان کے بیان کرنیوالے موجود ہیں۔ لیکن سُننے والوں پر جو اثر ان کا ہوتا ہو یا ہوا ہو وہ ظاہر ہی۔ ان میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جسکو جاننے کی ہماری عورتوں کو ضرورت ہو یا جس سے خیالات کی اصلاح ہوسکے۔ اور اگر ہو بھی تو ہم بھی سُننا چاہتے ہیں کہ وہ کونسی عورت ہو جس کو مصنف رعایا کی خبرگیری اور بیت المال میں احتیاط کرنے کی نصیحت فرما رہے ہیں۔

انتظام خانہ داری کا باب بھی جسمیں اسپر زور دیا گیا ہو کہ بہو ساس کا لونڈیاپا کیا کرے اسی میں گھر کی ساری اصلاح ہو، اگرچہ قابل تحسین نہیں مگر "ایں ہم غنیمت است" کا مصداق ضرور ہو۔ فی الجملہ تمام کتاب عمدہ منتخبات کا مجموعہ ہو مگر جس مقصد کیلیے لکھی گئی ہے اُس کو پورا نہیں کرتی۔

اب ہم مشیر نسواں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اگرچہ صرف ابواب کی سُرخیوں ہی سے کتاب کی خوبی کا اندازہ ہو سکتا تھا مگر اس سے ریویو نگاری کا فرض ادا نہیں ہوتا، لہٰذا جس کام کو ہاتھ لگایا ہے اُسے پورا کرنا ضروری ہے۔

کتاب کی ہیروان زہرہ، اور پرنسپل اشخاص رقیہ اور ناصر ہیں۔ جنکی پہلی شادی رقیہ کے، اور دوسری زہرہ کے ساتھ ہوئی ہے۔ شمسی بیگم زہرہ کی ماں اور میر ارشاد علی باپ ہیں جو سررشتہ تعلیم کے متوسط الحال ملازم ہیں۔ رقیہ کے والد میر فیض علی، میر ارشاد علی کے بڑے بھائی اور دولتمند وکیل ہیں، حشمت بیگم انکی زوجہ ہیں۔ ناصر فیض علی کے ماموں زاد بھائی کا یتیم لڑکا ہے جس کی پرورش فیض علی نے کی ہے اور اُسے بی۔اے تک تعلیم دلائی ہے۔ سعید بانو ایک نومسلم یورپین لیڈی اور زہرہ کی اُستانی ہے۔ خالد زہرہ کا چھوٹا بھائی، اور منصور رقیہ کے بطن سے ناصر کا لڑکا ہے۔

کتاب کا سین میر ارشاد علی کے گھر سے شروع ہوتا ہے۔ مکان کا ڈسکرپشن نہایت خوبی سے کیا گیا ہے جس سے مکینوں کی حسن معاشرت کا پتہ چلتا ہے۔ شمسی بیگم بیمار ہے، اور کمسن زہرہ نہایت دلدہی سے اُسکی تیماردار ہے۔ اس طرح "فرزندانہ محبت" کی، جو اس باب کا عنوان ہے، تصویر کھینچی ہے۔ اس ضمن میں خالد اور زہرہ کی تقریر نہایت دلچسپ ہے چچی کے ہاں سے دعوت آئی ہے، اماں بیماری کے باعث نہیں جا سکتی اور زہرہ ماں کو چھوڑ کے جانا نہیں چاہتی۔ خالد اس کا سبب پوچھتا ہے اور دونوں میں یہ گفتگو ہوتی ہے:-

زہرہ "وہاں جانا تو صرف تفریح ہے اور یہاں رہ کے اماں جان کی خدمت کرنا فرض ہے، اور فرض تفریح پر مقدم ہے"

خالد "لیکن فرض سے جی گھبراتا اور تفریح سے جی خوش ہوتا ہے"

زہرہ "نہیں بلکہ فرض ادا کرنے سے خوشی ہوتی ہے! کھیل کود سے خوشی نہیں ہوتی"

بلکہ دل کے اطمینان سے ہوتی ہے' اور جب اماں جان کا مزاج اچھا نہیں تو دل کو اطمینان کیونکر ہو سکتا ہے۔"

دوسرا باب علم جغرافیہ کی ضرورت پر ہے۔ چند ابتدائی مراتب مثلاً زمین کی شکل، دنیا کی جغرافی تقسیم اور رقبہ' اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کے نام بھی بتا دیے ہیں۔ مگر نہ ایسے کہ وحشت انگیز ہوں!

تیسرے باب میں انتظام خانہ داری کی بحث ہے۔ رقیہ چچا کے گھر مہمان آئی ہے۔ اس ضمن میں اُسکی فضول شوقی کو دکھایا ہے' جس کا ایک فقرہ سودیشی کے مخالفین کیلیے تازیانہ ہے کہ "وہ ہندوستان کی بنی ہوئی اشیا بہت کم پسند کرتی ہے' اور ولایتی اشیا کی خواہ وہ کیسی ہی ناپائیدار ہوں بہت دلدادہ ہے"۔ پھر زہرہ کی ہنرمندی کے ذکر میں اکانمی کے مسئلہ کو نہایت خوبی سے سمجھایا ہے' اور بتایا ہے کہ اپنے کام خود کرنے کا عادی ہونے میں کفایت اور آرام دونوں حاصل ہوتے ہیں۔

چوتھے باب کا عنوان ہے "چمن کا شوق باعث افزائش صحت ہے"۔ جس میں بعض ضروری باتیں پھولوں کی حفاظت کے متعلق بھی بیان کر دیگئی ہیں۔ یہیں سے زہرہ اور ناصر کے قلبی تعلق کی بنیاد پڑتی ہے۔

پانچواں باب اس بحث پر متضمن ہے کہ "نسبت میں کن اصول کو مدنظر رکھنا چاہیے" اس بحث میں سے ہم سعیدہ بانو کی تقریر کا خلاصہ نقل کرتے ہیں جو نہایت کارآمد ہے:

"میری رائے میں ایک شریف لڑکی کو یہ باتیں اپنے خاوند میں دیکھنی چاہئیں:
(اس سے قبل کی تقریر میں قرارداد نسبت میں لڑکی کی مداخلت تسلیم کی گئی ہے)

"اول شرافت۔ اگرچہ ہمارے پاک مذہب اسلام میں خاندان کوئی چیز نہیں ہے' جتنے مسلمان ہیں سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں ...... شرافت خاندان کی عزت اس سبب سے کی جاتی ہے کہ شریفوں کے اوضاع و اطوار و اخلاق عمدہ ہوتے

ہیں، اور چونکہ بچو نپر سوسائٹی یعنی صحبت کا اثر بہت زیادہ پڑتا ہو اور وہ اپنے بڑوں اور گھر والوں کی عادت اختیار کر لیتے ہیں، اس سبب سے یہ فرض کیا جاتا ہے کہ ایک شریف خاندان کا لڑکا شریف الطبع، نیک مزاج ہوگا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ اُسکی تربیت و تعلیم عمدہ ہوگی"

"دوم علمی لیاقت ۔ بغیر علم کے انسان کی کوجلا نہیں ہوتی، وہ توہمات باطل سے آزاد نہیں ہوتا، دنیا کے حالات سے واقفیت نہیں ہوتی، یہاں تک کہ خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا ۔ کہ بے علم نتواں خدارا شناخت ۔ جاہل آدمی اگر کوئی کام کرنا چاہے تو اُس کو اعلیٰ درجہ پر نہیں کر سکتا، اور صاحب علم معمولی کام بھی سلیقے اور درستی سے کرتا ہو ۔ علاوہ ازیں ایک تعلیم یافتہ شخص دوسرے کے حقوق اور اپنے فرائض کو جانتا اور اُن کو ادا کرنے کی کوشش کرتا ہو"

"سوم دولت ۔ دنیا کے کام دولت سے چلتے ہیں ۔ مفلس آدمی خواہ معزز ہو لیکن محتاج ہوگا ۔ اور اُسکے ساتھ کوئی شخص آرام سے زندگی بسر نہیں کر سکتا ۔ اسمیں شک نہیں کہ بعض دولتمندوں کے ساتھ بھی آرام سے زندگی بسر نہیں ہوتی، لیکن اسکے وجوہ دوسرے ہیں ۔ مثلاً کوئی شخص دولتمند ہو مگر بدمزاج یا آوارہ یا خسیس ہو تو اس کی ان خصلتوں سے تکلیف پہنچے گی ۔ اس صورت میں دولت کا کیا قصور ہے؟ دولتمندوں سے یہی مراد نہیں ہے کہ کروڑپتی ہو، بلکہ اپنی قوت بازو سے اس قدر کما سکتا ہو، یا اُس کے پاس اسقدر سرمایہ موجود ہو کہ شریفانہ زندگی آرام سے بسر کرے"

"چہارم خوش مزاجی ۔ بدمزاج آدمی کے ساتھ زندگی تلخ رہتی ہو، اور خوش مزاجی مصیبتوں اور تکلیفوں کو بھی کم کر دیتی ہو"

"پنجم چال چلن ۔ مرد کا چال چلن دیکھنا بہت ضرور ہو، جو لوگ اپنے پیچھے واہیات دُم چھلے لگا رکھتے ہیں، یا جو لوگ عیش پرستی میں دولت صرف کرتے ہیں، وہ بی بی کو

خوش نہیں رکھ سکتے"۔

"ششم عمر۔ حکماء کے نزدیک مرد کی عمر عورت سے کسی قدر بڑی ہونی چاہیے۔ مرد کا بہت زیادہ بڑا ہونا بہ چند وجوہ مناسب نہیں ہے"۔

"ہفتم صحت جسمانی۔ اگر صحت درست ہے تو محنت و جفاکشی کھلتی نہیں ہے۔ علاوہ اسکے اولاد بھی تندرست و قوی پیدا ہوتی ہے"۔

"ہشتم صورت۔ اچھی صورت پسندیدہ چیز ہے، مگر مردوں کی خوبی اُن کے عمدہ اخلاق اور دولت ہیں، مرد کریہ منظر نہ ہو تو کافی ہے"۔

اس انتخاب سے مصنفہ کی آزاد خیالی کا پتہ چلتا ہے، اور مقام حیرت ہے کہ جہاں مردوں کیلیے اپنی مرضی سے انتخاب زوجہ مکروہ سمجھا جاتا ہے وہاں ایک خاتون کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو آئندہ اصلاحوں کی فال نیک ہیں۔

چھٹے باب میں یہ بحث ہے کہ "قریب رشتہ داروں میں مناکحت سے آئندہ نسل کمزور پیدا ہوتی ہے" اس باب میں میر فیض علی کی فضول خرچی، حشمت بیگم کے پھوڑاپے اور رقیہ کی جہالت و بدمزاجی کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

ساتویں باب کا خلاصہ یہ ہے کہ جہیز ایسا دینا چاہیے جو شادی کے بعد روزمرہ ضروریات میں برتا جا سکے۔ فضول اور رسمی چیزوں میں روپیہ نہ برباد کرنا چاہیے۔

آٹھویں باب کی سرخی ہے "اشاعت تعلیم اور یتیموں کی پرورش ایک عبادت ہے"۔ اس کو یوں ادا کیا ہے کہ میر بشارت حسین شمسی بیگم کے بھائی ہیں، دلی میں رہتے ہیں، نہایت مالدار ہیں۔ آخری وقت ہے اس لیے بہن کو طلب کیا ہے کہ میں نے اپنی املاک جو لاکھ ... کی ہے تقسیم کر دی ہے۔ اس طرح کہ ایک ربع تمھارا، ایک ربع بھائی کی اولاد کا، اور نصف میں یتیم خانے اور طلبا کے وظائف۔ یہ مضمون عورتوں کے لیے نہایت مفید ہے جو خلقتاً نیک دل اور مخیر ہوتی ہیں، اور جنکو خیرات کا صحیح مصرف جاننے

بہت ضرورت ہو تاکہ اپنی اس جبلی خوبی کے بیجا استعمال سے بچیں اور اپنی خیرات کا مفید مصرف نکالیں۔

نویں سے گیارہویں باب تک قصہ کی بھرتی ہو بسلسل مضمون کے لیے اسقدر بتا دینا ضروری ہو کہ میر ارشاد علی مع متعلقین لی گئے ہیں، راستے میں ریل تباہ ہو گئی ہو اور صرف زہرہ زندہ بچی ہو اور میر بشارت حسین کے پاس پہنچ گئی ہو۔ اور میر ناصر اور رقیہ کا باہم عقد ہو گیا ہو۔

بارہویں باب میں بیٹی کی شادی کے بعد میر فیض علی کی وضعداری دکھائی ہو جس سے اُن لوگوں کو سبق لینا چاہیے جو جھوٹی نام و نمود کے لیے اپنے تئیں تباہ کر لیتے ہیں۔ تیرھویں اور چودھویں اور پندرھویں باب میں زندگی کی قدر، عمدہ شاعری، اور اُصول حفظان صحت کی بحث ہو۔ اور سولھویں باب میں رقیہ کی بد مزاجی کا خاکا کھینچا ہو۔

سترھویں باب میں ہمارے گھروں کی عام طرز زندگی اور میاں بی بی کے تعلقات کی اجمالی کیفیت اس طرح دکھائی ہو ؎

" رقیہ کے گرد انائیں، مامائیں، مغلانیاں جمع رہتی تھیں، اور وہ فضول قصے کہانیاں کہکر وقت گذارا کرتی تھیں، اور یہ پرفن اور مکار عورتیں بعض وقت ناصر کی غیبت بھی کرتیں، اور اس کی طرف سے رقیہ کے دل میں رنج پیدا کرتی تھیں، اور ناصر کی بے التفاتی کو اُس کی آوارگی یا عدم محبت پر محمول کیا کرتی تھیں۔ یہ عورتیں محلے کے دوسرے گھرانوں کی مثالیں بیان کرتیں اور کہتیں کہ فلاں شخص رات دن اپنی بیوی کے پاس رہتا، اُسکے کہنے پر چلتا، ہر امر میں اُس سے مشورہ کرتا ہو۔ لیکن انکو یہ نہیں معلوم تھا کہ اسکی بیوی ایسی قابلیت رکھتی ہو کہ میاں کو بڑے بڑے کاموں میں مشورہ دے، یا کوئی عورت اگر جاہل یا بیوقوف ہو۔ مگر اُس کا میاں اُس سے موافقت رکھتا ہے

لیکن غریب کہنے والی کو اس کی اطلاع نہ تھی کہ وہ میاں صاحب خود بھی جاہل اور بیوقوف ہیں، اور انکی عقل و علم کا دائرہ بیوی سے زیادہ وسیع نہیں ہو۔"

اس سے آگے کی عبارت میں شوہر کے تعلیم یافتہ اور بیوی کے جاہل ہونے سے جو دقتیں پیش آتی ہیں اُن کو یوں بیان کیا ہو:-

"بیچارے ناصر کی حالت ہی دوسری تھی، وہ خود دانشمند اور عالم تھا، لیکن اُسکی بیوی جاہل اور بیوقوف ملی تھی، وہ اپنی بیوی سے بیشک محبت کرتا تھا لیکن یہ اُسکے اختیار میں نہ تھا کہ وہ اُنھیں باتوں اور خیالات میں دلچسپی کا اظہار کرے جو اس کی بیوی سے ظاہر ہوتے تھے۔"

یہاں سے پھر سین بدلتا ہو اور میر بشارت حسین کے فیض صحبت سے جو علمی اور اخلاقی ترقی زہرہ نے کی ہو وہ دکھائی جاتی ہو۔ اٹھارھویں اُنیسویں باب میں قناعت اور دولت کے مسائل اور عمدہ بحثیں کی گئی ہیں۔ قناعت کے متعلق ماموں بھانجی کی حسب ذیل تقریر قابل لحاظ ہو:-

میر صاحب: "جیسا کھانا اور جیسا کپڑا تم کو استعمال کرنا چاہیے تم نہیں کرتیں۔"

زہرہ: "ماموں جان کھانے سے یہی مطلب ہو نا کہ انسان کی حیات قائم رہے، اور کپڑے سے تن پوشی ہو۔ یہ دونوں باتیں مجھکو حاصل ہیں۔"

میر صاحب: "یہ درویشوں کا مسلک ہو۔"

زہرہ: "دنیا میں سب درویش ہیں، ورنہ کوئی بھی نہیں۔ جو دنیا کی چیزوں کو حسب ضرورت صرف کرتا ہو وہ درویش ہو، اور جو بے ضرورت صرف کرتا ہے درویش نہیں حریص ہو۔ میری احتیاج کے موافق وہ کافی ہو جو میں استعمال کرتی ہوں۔"

میر صاحب: "یہ تمھارا وطن ہے یہاں تمھارے بہت سے رشتہ دار رہتے ہیں .... تم کو اُن سے ملنے جانا ہوگا شاید وہ بھی یہاں آئیں ان کپڑوں سے تمکو

جاتے شرم نہ آئیگی، تم اپنے واسطے چند جوڑے عمدہ اور قیمتی بنوالو۔ ایک ماما خاص اپنی خدمت کیلیے رکھ لو اور اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔"

زہرہ " بیشک یہ میرا ہی گھر ہے ..... مجھے ان لوگوں سے ملنے میں کیوں شرم آئیگی۔ اگر وہ لوگ مجھے اس لیے ملیں گے کہ وہ میرے رشتہ دار ہیں تو اُن کو میرے لباس سے کیا غرض ہی؟ میں اُنکی طرح قیمتی کپڑے نہیں پہنتی تو کم از کم اُس تکلیف سے بھی تو بری ہوں جو اُن کو ہر وقت اپنے لباس کی احتیاط میں اُٹھانی پڑتی ہی۔ خدا نے مجھے ماما کا محتاج نہیں بنایا، اور جب میں اپنے سارے کام خود کر سکتی ہوں۔ تو مجھے کیا حاجت ہی کہ ماما کی منت کش بنوں۔"

دو تین صفحے اُلٹنے کے بعد یہ چبھتے ہوئے فقرے نظر آتے ہیں:

میر صاحب " میں نے سُنا ہی کہ تم زمین پر سوتی ہو آخر اس سے کیا فائدہ؟"

زہرہ " آپ بھی تو پلنگ چھوڑ کے زمین ہی پر آرام فرماتے ہیں۔ میں سوئی تو کیا حرج ہوا؟"

میر صاحب " تم میری تقلید کیوں کرتی ہو۔ خدا جانے میں کیوں سوتا ہوں۔"

زہرہ۔ نماز پڑھ کے میں اکثر کتاب دیکھا کرتی ہوں۔ ایک آدھ دفعہ نیند آگئی تو پڑھتے پڑھتے سوگئی ہونگی۔ اس میں قباحت ہی کیا ہی؟ اور مجھے تو زمین پر سونا اور پلنگ پر سونا برابر معلوم ہوتا ہی۔ راحت نیند میں ہی نہ پلنگ میں۔ میں چونکہ دن کو نہیں سوتی اور کام میں مصروف رہتی ہوں رات کو بڑے آرام سے سوتی ہوں۔ اگر راحت پلنگ اور تکیوں میں ہوتی تو خدا کی وہ بے انتہا مخلوق جو ان اشیا سے محروم ہے آرام نہ پاتی۔ حالانکہ وہ امیروں سے زیادہ بیفکری سے پاؤں پھیلا کے سوتے ہیں۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے دو نتیجے حاصل ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ناصح کی جدائی

نے اُس پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا اور عشق نے علم کی مدد سے اُس پر تصوف کا رنگ چڑھا دیا تھا، اور وہ ایک فلسفی خیال عورت بنگئی تھی۔ برخلاف اسکے اگر وہ جاہل ہوتی تو عشق کی یہ جانسوز چنگاری خدا جانے کیا غضب ڈھاتی۔ اس نتیجے کو قصے کے تسلسل سے تعلق ہی۔ دوسرا اخلاقی نتیجہ جو نکلتا ہی وہ یہ بتاتا ہی کہ اصلی قناعت کفایت شعاری، خودنمائی سے نفرت، محنت کی عادت اور منکسر مزاجی ہی۔

قناعت کی بحث اسقدر وسیع ہی کہ ایک جداگانہ مضمون چاہتی ہی۔ اس لفظ کا اصلی مفہوم سمجھنے میں جو غلط فہمی ہماری قوم سے ہوئی وہ بہت بڑا سبب ہماری تباہی و بربادی کا ہی۔ ہمنے قناعت کے یہ معنے سمجھ رکھے ہیں کہ احدی بنے ہوئے بیٹھے رہیں، اور ”خدا خود میر سامان است ارباب توکل را“ کا وظیفہ پڑھا کریں۔ لیکن حقیقت میں یہ قناعت نہیں ہی۔ اصلی قناعت وہی ہی جس کی جھلک کتاب زیر ریویو کے زیر بحث باب میں دکھائی گئی ہے۔ اور میں اپنی طرف سے قناعت کی تعریف میں اسقدر اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کوشش کا نتیجہ خلاف اُمید نکلے تو اُس سے دل شکستہ نہ ہونا، اور کوشش بدستور جاری رکھنا قناعت ہی :

بیسواں باب ”نمائش کی غایت“ بھی دلچسپ ہی۔ اور ہم کو یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ مصنفہ نے یہاں بھی دیسی صنعت و حرفت کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی ہی اور قوم کو اس طرف توجہ دلائی ہی۔ اسکے بعد کے ابواب قصے سے تعلق رکھتے ہیں۔ چوبیسویں باب میں نامور عورتوں کے حالات مذکور ہیں۔

پچیسویں باب میں ناصر کے احباب اُسکی بیوی کی ناقابلیت و جہالت کی وجہ سے اس کو دوسری شادی کی صلاح دیتے ہیں۔ جسکے ضمن میں کثرت ازدواج کی بحث بھی آگئی ہی۔ جس کے یہ دو فقرے زیادہ قابل لحاظ ہیں۔

ناصر ”کیا تم کثیر الازدواجی کو جائز و روا سمجھتے ہو؟“

لطیف": کثیر الازدواجی اس خیال سے کہ لوگ اپنے آرام کی خاطر دوسری بیگناہوں کو تکلیف میں ڈالتے ہیں ناجائز و ناروا ہے لیکن اشد ضرورت کی صورت میں نکاح ثانی کرنا عقلاً و نقلاً جائز ہے ..... اس اجازت کے استعمال کیلیے خاص خاص موقعے اور محل ہیں۔ افسوس کہ لوگ عموماً صحیح استعمال اس اجازت کا نہیں کرتے خانہ داری کی راحت و آرام کے واسطے انسان شادی کرتا ہے اور اگر یہ مطلب حاصل نہ ہو تو شادی بیکار ہے"

ہم کو اس رائے سے اتفاق نہیں۔ شرع نے بیشک چار نکاحوں کی اجازت دی ہے، مگر جو شرط عدالت احکام ربانی میں اسکے لیے لگا دی گئی ہے اُسکی بجاآوری قریب بہ محال ہے۔ اور عملاً شاید ہی کسی سے اُس کی پابجائی کی ہو۔ البتہ جو خرابیاں کثرت ازدواج سے پیش آتی ہیں، اُنکے نتائج روزانہ نظر آتے ہیں۔ رہی وہ اشد ضرورت جسکے پیش آنیکی صورت میں مصنفہ تعدد ازدواج کو ضروری قرار دیتی ہیں وہ اولاً تو پیش ہی نہیں آسکتی اگر انتخاب زوجین کے مسئلے میں اُس طرح کی ترمیم ہو جائے جو اسی کتاب کے پانچویں باب میں اشارتاً بتائی گئی ہے۔ اور اگر بریں ہم وہ اشد ضرورت پیش ہی آسکے تو دوہری مصیبت میں گرفتار ہونے سے ایک مصیبت کا جھیلنا زیادہ تر قرین عقل و مصلحت ہے۔ اور اگر یہ بھی گوارا نہو تو اس حماقت سے وہ ذلت و ندامت بدرجہا بہتر ہے، جس کو ہم ذلت و ندامت سمجھتے ہیں مگر شرع نہیں سمجھتی۔

چھبیسویں باب میں ناصر کا دہلی کی نمائش میں جانا اور ایجوکیشنل کانفرنس میں زہرہ کا لکچر سننا، اور ستائیسویں باب میں زہرہ کے ساتھ ناصر کی دوسری شادی کا ذکر ہے۔

مصنفہ کے تمام خیالات کا لب لباب یہی لکچر ہے۔ اس لکچر میں تمام باتیں تقریباً وہی بیان ہوئی ہیں جنکو ہم اپنے ریویو میں دکھا چکے ہیں۔ مگر لطف یہ ہے کہ جو

بات ایک جگہ کہی جاتی دوسری جگہ دوسری بات اُسی کے خلاف ہوتی ہی۔ مثلاً اس لکچر میں کہیں تو عورتوں کو مردوں کی ترقی کا سنگ بنیاد بتایا ہے، اور کہا گیا ہے کہ:-

"عورتوں پر انسان کی راحت، ترقی، بہبودی، تعلیم و تربیت، تندرستی کا دارومدار ہی"

اوران وجوہ سے اُن کو اعلیٰ تعلیم کا زیادہ محتاج بتایا ہے، اور کہیں کہا جاتا ہی کہ مردوں کے علوم جاننے کی عورتوں کو ضرورت نہیں۔ معلوم نہیں کہ پھر عورتیں مردوں کی ترقی کا بنیادی پتھر کیونکر بن سکتی ہیں۔ جبکہ وہ ان کی ضروریات زندگی ہی سے ناواقف ہونگی۔

ایک جگہ ہو کہ "اگر پردہ ترقی نسواں کا مخالف ہوتا اور بے پردگی حامی ہوتی تو لازم تھا کہ دیگر عام اقوام کی عورتیں مسلمانوں کی عورتوں سے زیادہ ترقی یافتہ، زیادہ قابل، زیادہ روشن خیال، اور عالی دماغ ہوتیں"

یہ خیال بالکل واقعات کے خلاف ہی۔ اس وقت یورپ کی تمام عورتیں نسبتاً ہر امر میں مردوں کی برابر ہیں۔ اور اگر کچھ کمی ہو تو اُسی مناسبت سے ہی، جتنا تفاوت دونوں کے زمانہ جدوجہد کی عمر میں ہی۔ اگر ہندوستان کی بیچ قوموں کی نسبت یہ کہا جائے کہ اُن عورتوں نے کیوں ترقی نہیں کی تو یہ اعتراض محض ناسمجھی کا ہوگا اس وجہ سے کہ اُن کا موازنہ اُسی طبقے کے مردوں سے کرنا چاہیے جس سے ان کا تعلق ہی تو صاف نظر آئیگا کہ وہ اپنے مردوں کی برابر ہیں۔

ہم مصنفہ کو اس لغزش کا الزام نہیں دیتے، کیونکہ جو خیالات بچپن سے اُنکے ذہن نشین ہیں وہ دفعتہً کیونکر دور ہو سکتے ہیں۔ علاوہ بریں مصنفہ کو فرید وجدی کے استدلال نے دھوکے میں ڈالدیا ہی جس پر اُنھوں نے اس لکچر کی بنیاد رکھی ہی

اگر وہ عورت کے دماغ وعضلات کی اُس نئی تحقیقات سے باخبر ہوتیں کہ عورت کے دماغ کا وزن متناسب مرد کے دماغ سے زیادہ ہے، تو مصنفہ کے دماغ کی طبعی رفتار سے یہ قوی اُمید کیجا سکتی تھی کہ وہ یقیناً عورت کیلیے اُن تمام برتریوں کی خواستگار ہوتیں جنکے مرد مدعی ہیں۔ ہاں ہمیں شک نہیں کہ طول طویل تعطل نے عورت کے قواے دماغی اور جسمانی کو کمزور ضرور کر دیا ہے، اور یہ کوئی اس کا فطری عیب نہیں ہے لہذا دماغی وجسمانی ورزش سے اُس کی اصلی قابلیت پھر زندہ ہوسکتی ہے۔ اور جہاں ان کا تجربہ کیا گیا ہے۔ وہاں اسکے یقینی نتائج پیدا ہوئے ہیں۔ اور تمام متمدن دنیا کی علمی رپورٹ اسکی شاہد ہے۔

اٹھائیسویں سے اکتیسویں باب تک زہرہ کا ناصر کے گھر آنا اور اسکے لائق ہاتھوں سے ناصر کے گھر کی اصلاح حال کا ذکر ہے جن کا خود مصنفہ کے الفاظ میں یہ ماحصل ہے:-

"اب زہرہ ناصر کیلیے نہ صرف انتظام خانہ داری میں مددگار رہی بلکہ ہم مذاق اور تعلیم یافتہ ہونے کے سبب سے ناصر کے علمی مشاغل میں بھی معین ومعاون رہتی ہے۔ وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے قدردان ہیں جس سے آپس میں سچی محبت قائم ہے اس لیے دونوں کی زندگی خوشی وخرمی واتحاد سے گذر رہی ہے۔"

آخر میں ہم دو باتیں اور کہنی چاہتے ہیں۔ اولاً تو یہ کہ جو کتابیں تعلیم وافادہ کی غرض سے لکھی جائیں وہ ہرگز ناول کے پیراے میں نہ ہونی چاہئیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ناول بُری چیز ہے، مگر ہماری بدمذاقی اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ ہم مفید سے مفید ناول کو پڑھ کے بھی فائدہ نہیں حاصل کرسکتے بلکہ بجاے اس کے وہ ہمپر مضر اثر ڈالتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم بے سروپا قصے سُننے اور پڑھنے کے عادی ہیں اور ہمارا ذہن کبھی اس جانب منتقل نہیں ہوتا کہ ہم ناول کے کیرکٹروں سے

سبق حاصل کریں۔ بلکہ ہم ان کو بطور افسانے کے پڑھتے ہیں اور اخیر میں اگر عاشق و معشوق کا وصال یا اور کوئی دل خوش کن نتیجہ نکلا تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ "جیسے اُنکے دن پھرے ویسے ہی خدا ہمارے تمھارے دن پھیرے"! اور اگر ٹراجڈی ہی تو مصنف کو دس بیس گالیاں سُنا دیتے ہیں۔ اور یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ مصنف کا منشا صرف داستان گوئی نہیں ہی بلکہ وہ خاص خاص سوسائٹیوں کی عادات و اطوار یا خاص خاص مسائل کی خوبیاں اور برائیاں قصے کے پیرائے میں دکھاتا ہے۔

علاوہ بریں ایک اور وجہ اختلاف کی یہ ہی کہ ناول میں مکالمے کی وجہ سے سلسلہ مضامین میں اسقدر فصل واقع ہو جاتا ہی کہ متعلم اور وہ بھی ایک عورت جس کو باقاعدہ تعلیم نہیں دی گئی ہی اور جسکی قوت فکریہ کو ایسی جلا نہیں ہوئی ہی کہ وہ چند منتشر واقعات سے کوئی نتیجہ نکال سکے ہرگز ایسے غیر مسلسل مضامین کو ذہن نشین کرکے اُن سے نتائج اخذ نہیں کر سکتی۔

ثانیاً یہ کہ جہاں یہ کتاب بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہی وہاں اس کی زبان جیسی سادہ اور سلیس ہونی چاہئے تھی ویسی نہیں ہی۔ اکثر مقامات پر فارسیت کا عنصر غالب ہی۔ ادائے مطالب میں اور نیز الفاظ میں غیر ضروری تکرار بہت کثرت سے ہے تاہم ایک ایسی خاتون کی تصنیف ہونے کی حیثیت سے جسکی مادری زبان اردو نہو بہت کچھ قابل تحسین و آفرین ہی۔ اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ آئندہ اگر مسز اولیا میرزا کوئی تصنیف کرینگی تو ہمارے مخلصانہ مشورے کو ملحوظ رکھیں گی۔

نیاز مند

ضامن کنتوری

حکومت دستوری ایران

جبذا یوم سعادت مرحبا یوم الوصال

باغ ہا گل مے کند امروز بعد از چند سال

تمام اہالی یورپ راعقیدہ بریں است کہ ملت اسلام ہرگز ترقی نخواہند کرد چنانچہ بارہا در بارہ ملت و دولت اسلام مقالہا مے نویسند اُمید واریم انشاء اللہ تعالےٰ بایں زودی عقیدہ فاسد انہا نسبت ملت اسلام باطل گردد ۔ اصل مقصود در بارہ شورای ملی ایران است یعنی حکومت دستوری کہ آیا برائے دولت و ملت ایران باعث ترقی است حکومت دستوری یعنی مجلس کہ جمیع طبقات و اصناف کوچک ہم دراں حق دارند مانند طبقات بزرگ کہ در اُمور ملک و ملت و دولت رائے دہند ازین رو میتواں گفت کہ فرد فرد ملت شریک سلطنت اند این است معنی مجلس ملی و این است اُصول مشورہ اسلامی چنانچہ حضرت باری تعالیٰ در قرآن شریف میفرماید وامرھم شوریٰ بینھم در حکومت دستوری شاہ و گدا بحیثیت ملت و عالم و جاہل از روئے حقوق قومیت یکسان است از برکت شورائے ملی بود کہ نگذاشتند دولت علیہ ایران از دول خارجہ قرض بگیرد چنانچہ در اخبارات نگاشتہ بودند و این اوّل فائدہ بود از شورائے ملی کہ راضی نہ شدند کہ ملت ایران زیر بار قرض اجانب رود ۔ پیش از شورائے ملی دولت میکرد آنچہ کہ میخواست و ملت بیچارہ نمی توانست کہ باز دارد دولت را و نہ دولت از ملت در کارہائے ملکی مشورہ می کرد و نہ مدد میخواست و لے حال در شورائے ملی ہر شخص میداند کہ دولت از آن او است پس تا جان در بدن دارد در ترقی ملک و ملت و دولت خود میکوشد و از دست درازی اجانب آن را محفوظ میدارد ۔ چنانچہ نظیرش در ممالک متمدنہ

موجو است که ہیچ دولت نمیتواند دست درازی در ملک ایشان بکند و این سبب از
ہمیں مجلس شوریٰ ملی است. در چند اخبار نوشته بودند که مجلس شورائی ملی ایران از
کوشش ملت قائم شده یعنی ملت پادشاه را مجبور کردند تا این مجلس قائم شد. این
مقاله ہرگز درست نیست زیرا که از روزیکه شاہنشاه مغفور بر تخت سلطنت قرار
گرفت ہمیشہ خیال مقدس ایشان در ترقی ملک و رفاہیت ملت بود نیز از آن وقت
ہم در خیال قائم کردن مجلس شورائی ملی بودند چوں در آں زماں موانع بسیار در پیش بود
ممکن نشد تا حال در تاریخ ایران دیده نشده پادشاہے مانند شاہنشاه مغفور ہمیں
قدر از صفات آں مرحوم بس که تا پا بر اورنگ شہریاری گذاشت عہد اتحاد و دوستی
با اعلیٰ حضرت سلطان عثمانی بستند و این اتحاد موجب بسے ترقی ہا است برائے
اسلامیان خدا وند رحمت کند شاہنشاه مغفور را که واقعاً حق بزرگی برگردن
ملت ایرانیه دارد. ملاحظه بفرمایند. بر سر ہمیں حکومت دستوری بود که در انگلستان
بعد از خونریزیہاے بسیار آں وقت چارلس اول پادشاه آنها مجبور شد
تا مجلس شوریٰ قائم نمود ہمچنیں در فرانس مگر در ایران بدون آنکه صداے کسی
بلند شود این مجلس محترم قائم شد در شوراے ملی ایران ۱۲۵ نفر چه از وکلای ملی
و چه خاندان شاہی موجود ہستند تمام آنها مردمان با تربیت و با علم و سیاسی
و محب وطن ہستند جناب مخبر السلطنه رئیس کل مجلس مقرر شده است تا حال
آنچه به تحقیق پیوسته مجلس شورای ملی چند کارہاے عمده براے ملک و ملت
خود کرده اند. ہمانا اول ایجاد بنک قومی است که واقعاً مے تواں گفت ایجاد
تازه حیات ملت است. سرمایه کل این بنک ۱۰۰ کرور تومان است که
معادل معین کرده اند. والحال مبلغ ۲۰ کروڑ تومان جمع آوری کرده اند ہنوز ہم
مشغول جمع کردن ہستند. دوم از قراریکه در اخبارات فارسی دیدم معلوم میشود

کہ مجلس شورائی ملی درخیال ساختن قطار راہ آہن یعنی ریلوے از ساحل خلیج فارس تا ساحل دریائے خضر کہ آن راکسپنسی میگویند سے باشند۔ البتہ باین رو یقتوان گفت تجارت ایران ترقی کامل خواہد نمود۔ سوم مشغول اصلاح فوج بری و بحری کہ امروز ترقی مملکت تقویت دولت و آبادی ملت بواسطہ ہمیں قوہ حربیہ می باشد ہستند امیدوار ہستم کہ شورائے ملی ایران بیش ازیں خدمت بہ ملک و ملت و دولت خود بنمایند از درگاہ حضرت باری تعالی مسئلت مینمایم کہ توفیقات کامل بایشان عطا بفرماید۔ والسلام

محمد اسمعیل ایرانی۔ طالبعلم مدرستہ العلوم علیگڈہ

غزل جناب حکیم عبدالہادی خانصاحب وفا رامپوری

کیا پوچھتے ہو عالم افسوس میں کیا ہوں
میں درد ہوں اور پہلوئے محشر سے اٹھا ہوں

میں نعمت تقدیر میں پامال ہما ہوں
پامال دلآویزی نقش کف پا ہوں

جس حال میں ہوں وقف تماشائے ادا ہوں
جس رنگ میں ہوں ناتی رنگ وفا ہوں

میں حاصل ہنگامہ صد برق فنا ہوں
بربادی امید سے آباد ہوا ہوں

امید اٹھاتی ہے مگر اٹھ نہیں سکتا
تقدیر نے توڑا جسے وہ دست دعا ہوں

پستی اقبال ہی معراج بلندی
میں کون ہوں اور کس کی نگاہوں سے گرا ہوں

فرقت نے نکالے ہیں یہاں وصل کے پہلو
اس لاگ پہ جیتا ہوں کہ میں تم پہ فدا ہوں

بیکاری ہنگامہ شوخی کی خبر کیا
میں شیفتۂ سادگی نقش حیا ہوں

پہلے ہی سے محو کشش ناز قلم تھا
سو بار جو بگڑا ہوں تو اک بار بنا ہوں

آخر کبھی ملتا ہے پتا گوشۂ عدم میں
جو کچھ ہوں وفا ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہوں

حصۂ نظم

حضرت سید الشعرا مولانا شاد مدظلہٗ

نہ دوست اور نہ کسی کا کوئی عدو نکلے
اگر یہ نقش مٹا دیں تو تو ہی تو نکلے

عجب نہیں کوئی میخانہ راہ میں ملجائے
جو گھر سے نکلے تو انسان باوضو نکلے

مٹا نہ کوچۂ قاتل کا دھیان حشر تلک
جو نکلے قبر سے بھی ہم تو قبلہ رو نکلے

وہ ہاتھ اگر نہ مددگار ہوں تو ائے شانے
کبھی نہ پیچ سے اُن گیسوؤں کے تو نکلے

یہیں کی خاک میں اے بادہ کش ملا دے خاک
تجھے قسم ہی جواب میکدہ سے تو نکلے

اسی نے دیکھے دلا سے تو ڈھائی ہی آفت
دل اپنے سینہ سے نکلے تو آرزو نکلے

میں تھک گیا بہت اُسکی تلاش میں اے موت
بدن سے روح بس اب بہر جستجو نکلے

بپا تھا شورِ قیامت تڑپ سے بسمل کی
بھلے کو آپ قریبِ رگِ گلو نکلے

وہ سب تو خاک ہوئے آسرا تھا جن کا شاد
کس آسرے پہ ضعیفی میں آرزو نکلے

دیگر

بہ دلجمعی جئے جبتک جئے جینا اُسی کا ہے
پیے جو سیر ہو کر رات دن پینا اُسی کا ہے

نگہ کی برچھیاں جو سہہ سکے سینا اُسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اُسی کا ہے

تصور اُس رخِ ساقی کا رکھ مدِنظر نادان
لگے منہ جو آئینے کو آئینہ اُسی کا ہے

یہ بزمِ مے ہے یہاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھالے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

قدم اپنا ذرا بہمت عالی پہ رکھتا جا ۔ جسے کہتا ہی زاہد عرش یہ زینا اُسی کا ہی

بسر ہو میکدہ میں پنجشنبہ بیٹھکر جس کا ۔ جو مینوشی میں کرڈے صبح آدینا اُسی کا ہی

فضائے دہر میں یہ سیر گہ جس نے بنا دی ہے ۔ تماشائے جہاں میں دیدۂ بینا اُسی کا ہی

کدورت سے دل اپنا پاک رکھو شاد پیری ہی

کہ جس کو منہ دکھانا ہی یہ آئینا اُسی کا ہی

اس غزل کے قافیوں کی تازگی مضامین کی جدت اور بیان کی صفائی خاص طور پر ملاحظہ طلب ہی۔ (ایڈیٹر)

غزل جناب نسیم بھرتپوری

تمنا یوں تو جیتے جی نہ میرے دل سے نکلیگی ۔ گلے مل کر کسی دن خنجرِ قاتل سے نکلیگی

اگر دشنام وہ دیں گے خبر کیا آہ سے لونگا ۔ وہ اُنکے منہ سے نکلیگی یہ میرے دل سے نکلیگی

عدو سے آجکل ہی میں دل اُنکا پھرنیوالا ہی ۔ نہ کیوں مقبول ہوگی وہ دعا جو دل سے نکلیگی

پلاکر اُس کو خون اپنا بجھا دی پیاس برسوں کی ۔ دعا ہر دم زبانِ خنجرِ قاتل سے نکلیگی

شبِ غم کو پھٹکنے بھی نہ دیتا میں کبھی گھر میں ۔ خبر کیا تھی کہ آکر یہ بلا مشکل سے نکلیگی

مری مشکل جو حل ہوگی تیری تلوار سی ہوگی ۔ رہِ جنت جو نکلیگی تری محفل سے نکلیگی

تمہاری تیغ سے آنکھیں لگی ہیں مرنیوالوں کی ۔ یہ لیلی کب مری جاں پردۂ محمل سے نکلیگی

نہ دلچسپی کہیں ایسی نہ آسایش کہیں ایسی ۔ یہاں تکلیف کیا ہی کیوں تمنا دل سے نکلیگی

مژہ کی پھانس کا دل سے نکلنا کیا کچھ آسان ہی ۔ بڑی مشکل سے نکلیگی بڑی مشکل سے نکلیگی

تمہاری تیغ میرے دل میں بیٹھے غیر ممکن ہی ۔ یہ فوراً آرزوئے غیر بن کر دل سے نکلے گی

دلِ بے مدعا میں رہتی ہی اگر حسرت تو رہنے دو ۔ یہ خود گھبرا کے اُس اُجڑی ہوئی منزل سے نکلیگی

عدو کی جان سے میری تمنا بھی ہو وابستہ — اُدھر وہ تن سے نکلیگی اُدھر یہ دل سے نکلیگی

نسیم ایسی زمیں میں تم نے لکھی ہے غزل ایسی
کہ خود تحسین زبان ہجو د وسائل سے نکلیگی

غزل جناب کوثر خیرآبادی

یاس و حسرت کے سوا اب کون غمخواروں میں ہے — ایک دل وہ بھی تمھارے ہی طرفداروں میں ہے

خانقہ میں ہم سے رندوں کا کوئی پرساں نہیں — ہے کرم پیرِ مغاں کا قدر میخواروں میں ہے

مرگِ دشمن سے دلِ ناشاد کیوں کر شاد ہو — غم تو یہ ہے وہ وفا دشمن عزاداروں میں ہے

چبھ رہی ہیں دل میں پلکیں یار کی ہنگامِ نزع — پھول کملایا ہوا اُلجھا ہوا خاروں میں ہے

مرغِ دل شوقِ شہادت میں تڑپ کر مر گیا — جب کہا اُس نے کوئی باقی گرفتاروں میں ہے

خوں چکاں نکلا دلِ پر آرزو سے تیرِ ناز — موج زن خونِ تمنا تیرے سوفاروں میں ہے

خوف ہے کھلنے سے رنگِ آرزو پیدا نہو — غنچۂ دل بھی مرا اُس شوخ کے ہاروں میں ہے

دونوں ابرو اک طرف ہیں تیغ و خنجر اک طرف — بحث میرے خونِ ناحق کی انہیں چاروں میں ہے

کثرتِ عصیاں ہوئی ہے باعثِ بخشش مجھے — حشر میں سمجھا کہاں کوئی سیہ کاروں میں ہے

پڑ رہے ہیں تیرِ مژگاں اک دلِ صد چاک پر — وائے بےرحمی اکیلا پھول سو خاروں میں ہے

آتشِ رخسار سے کیونکر جلے خالِ سیاہ — کیا جلائے آگ ابراہیم انگاروں میں ہے

چاہتا ہے یہ کہ خونِ بیگنہ ثابت نہو — ہے یہ عیاری کہ وہ قاتل عزاداروں میں ہے

آبرو رہ جائے اُس کی حشر میں رسوا نہو
یا شفیع المذنبیں کوثر گنہگاروں میں ہے

ازغزل حسرت موہانی

ترے حسن سے فزوں ہے تری ناز آفرینی — کہ یہ جان آرزو ہے بہ کمالِ دل نشینی

دلِ حسرت آشنا کو ہیں اُمید و یاس یکساں — کہ وصال ہے خیالی نہ فراق ہے یقینی

فقط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہنگامۂ مدرستہ العلوم علی گڑہ

یعنی انگریز پرنسپل اور پروفیسروں کے ظلم اور بعض کمزور ٹرسٹیوں کی بزدلی کا افسانہ

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم — کہ با من ہر چہ کرد آن آشنا کرد

حال میں مدرستہ العلوم علی گڑہ کے طالب علموں پر تادیب اُستادانہ کے پردہ میں جو کچھ زیادتیاں انگریز استادوں کے ہاتھوں ظہور میں آئی ہیں انکی کیفیت ضمن بیان میں آگے چلکر واضح ہوگی۔ ابتداء میں ہم صرف اتنا لکھنا چاہتے ہیں کہ ان سب واقعات کی نسبت ہم کو انگریزوں سے کہیں زیادہ شکایت اپنے ہمقوم ٹرسٹیان کالج سے ہی جو بجائے اس کے کہ بحیثیت حاکمانہ اپنے ماتحت ملازمین کالج کی دراز دستیوں کو روکتے اپنی جبلی کمزوری کی بنا پر مخدوم سے خادم بنگئے۔ اور انگریزوں کی تنبیہ و سرزنش کی جگہ اُلٹے اُنکی اعانت و وکالت میں مصروف ہوگئے اور اس افسوسناک کوشش میں اسقدر غلو سے کام لیا کر دروغ بیانی اور غلط نویسی کو بھی بعذر مصلحت جائز قرار دے لیا۔ وائے بر حال ایشاں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہی کہ ٹرسٹیوں اور خصوصًا نواب محسن الملک بہادر کی اس حیرتناک کمزوری کا سبب کیا ہی اور آئندہ اسکے دور کرنے کی کیا صورت ہی؟ اس کا جواب کسی دوسری جگہ تفصیل کے ساتھ دیا گیا ہی[1]۔ اس موقع پر ہم صرف اسقدر دکھانا چاہتے ہیں کہ ہنگامہ زیر بحث میں طالب علموں کا کوئی فعل قابل ملامت نہیں ہی

---

[1] صفحہ ۱۵۔ اردوئے معلیٰ زیر عنوان "مدرستہ العلوم علیگڑہ کے نیشنل کالج ہونیکی ضرورت اور صورت۔"

اور سیکرٹری کالج کی رپورٹ حرف بحرف پرنسپل کی غلط بیانیوں کی نقل ہو اور اس لیے حقیقت حال سے اُس کو وہی نسبت ہو جو رات کو دن سے ہوا کرتی ہو۔ مثلاً

ظاہری بنائے شورش

ہی کو لے لیجیے کہ اسکی نسبت پبلک کو عموماً اور طلبا کے والدین کو خصوصاً دھوکا دینے کی نیت سے نواب محسن الملک نے ناجائز اختصار کیساتھ یہ گلفشانی فرمائی ہو کہ "غلام حسین پنجابی جو فورتھ ایر میں تعلیم پاتا تھا نمائش گاہ علی گڑھ میں سیر کیلیے گیا اور وہاں اس سے اور کسی پولس کانسٹبل سے کچھ جھگڑا ہوا۔ جسکے متعلق صاحب سپرنٹنڈنٹ پولس نے پرنسپل صاحب کالج کو اس مضمون کی اطلاع بھیجی کہ اگر کالج کے افسر طالبعلم مذکور کو سزا نہ دینگے تو باضابطہ مقدمہ عدالت فوجداری میں اُس پر دائر کیا جائیگا۔ پرنسپل صاحب نے یہ مناسب نہ سمجھ کر کہ اس قسم کا مقدمہ عدالت میں دائر ہو بطور خود سزائے ذیل دینا تجویز کیا۔

اوّل یہ کہ وہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سے معافی مانگے۔

دوم یہ کہ وہ بیس روپیہ بطور جرمانہ کے ادا کرے، جو کسی کار خیر میں صرف کیا جائیگا۔

سوم یہ کہ وہ بورڈنگ ہوس سے ایک میعاد مقررہ تک باہر نہ جایا کرے اور اپنی موجودگی کی اطلاع وقتاً فوقتاً دیتا رہے"۔ اس بیان میں دو فریب ہیں۔ فریب اوّل یہ کہ "کچھ جھگڑا ہوا" کے اجمال سے غرض یہ ہو کہ لوگوں کو اصل واقعے اور غلام حسین صاحب کی بیقصوری سے اطلاع نہو اور وہ اُنکے ساتھ ابتدا ہی سے ہمدردی رکھنے سے باز رہیں۔ فریب دوم یہ کہ تجویز پرنسپل کے حصہ سوم کی نسبت محض طالب علم کو الزام دینے کیلیے دیدہ و دانستہ اس ذکر کو حذف کر دیا ہو کہ طالبعلموں کی جانب سے سختی حکم کی شکایت پر پرنسپل نے بورڈنگ سے باہر جانیکے متعلق صرف اسقدر قید باقی رکھی تھی کہ اسکے

لیے سب پراکٹر سے اجازت لینا ضروری ہو۔

صحیح واقعہ یوں ہو کہ ایک جاہل کانسٹبل نے نہایت غیر مہذب اور درشت الفاظ میں مسٹر غلام حسین کو اشیائے نمائش کے قریب جانے سے اس لغو عذر پر روکنا چاہا کہ وہاں صرف "صاحب لوگ" جا سکتے ہیں۔ یہ بیان کئی وجوہ سے ناقابل یقین تھا اول اس لیے کہ اشیائے نمائش کے دیکھنے میں یورپین اور انڈین کا امتیاز بالکل بےمعنی تھا دوم اس لحاظ سے کہ عام طور پر طلبائے کالج اور دیگر شرفائے شہر کیلیے پہلے کبھی اس قسم کی ممانعت سُننے میں نہ آئی تھی۔ بنا بریں مسٹر غلام حسین نے کانسٹبل کی اس ناروا حرکت کو اپنے حق میں توہین خیال کیا اور ہمارے نزدیک صحیح خیال کیا کیونکہ اشیائے نمایش کی میزوں اور الماریوں سے کچھ فاصلے پر جو ڈوری بندھی ہوتی ہو وہ صرف اُن گنواروں یا کم درجے کے لوگوں کو روکنے کیلیے ہوتی ہو جن کی ذات سے یہ خطرہ کیا جاتا ہو کہ وہ اپنی بدتمیزی سے چیزوں کو خراب کر دینگے یا ممکن ہو کہ غائب بھی کر دیں۔ یقیناً اسی خیال سے کانسٹبل کی ممانعت پر توجہ نہ کیگئی اور جب وہ بر سر وحشت ہوا تو مسٹر غلام حسین اسکو دھکا دیکر اندر چلے گئے اور اُن کے ہمراہ اور بھی چند طالب علم داخل ہو گئے اسی کشمکش میں شاید کسی دوسرے طالبعلم کی بید کی شام جسے وہ بغل میں دبائے ہوئے تھا بحالت نادانستگی کانسٹبل کے چہرہ پر لگ گئی۔ جس پر اُس نے یہ فیل مچایا کہ اپنے چہرے پر کی ایک پھنسی کو خود چھیڑ کر خون نکالا اور ضرب شدید کی صورت پیدا کرکے سپرنٹنڈنٹ پولس کے روبرو حاضر ہوا۔ چنانچہ بالکل اُسی کے بیان کے مطابق سپرنٹنڈنٹ مذکور نے پرنسپل کو اس واقعے کی اطلاع دی اور اُنہوں نے اپنے ایک سفید رو ہمقوم کی خوشنودی مزاج کیلیے ایک جاہل کانسٹبل کے بیان کو بہت سے شریف اور راست گفتار طالبعلموں کے قول سے زیادہ

قابل اعتبار قرار دیا۔ اور اب طالب علموں کی روایت سے بالکل قطع نظر کرکے اپنی رپورٹ میں مسٹر غلام حسین کو حملہ بیجا کا مجرم قرار دیتے ہیں ۵

گرہمیں مکتب است وایں ملا   کار طفلاں تمام خواہد شد

طالبعلموں کی بردباری کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ باوجود سخت اور ناواجب ہونیکے محض بخیال رفع شر اُنھوں نے پرنسپل کا حکم مان لیا اور صرف جرمانہ ہی نہیں ادا کر دیا بلکہ پرنسپل کے ڈرانے دھمکانے سے غلام حسین صاحب نے سپرنٹنڈنٹ پولس کو معافی کا خط بھی لکھدیا جسکی درحقیقت کوئی ضرورت نتھی اسکے بعد کچھ تو اس لیے کہ اس ضمن میں لڑکوں کی بیباکی اور صاف گوئی پرنسپل کو ناگوار ہوئی اور کچھ یوں کہ نواب محسن الملک نے لکھنؤ سے واپس آکر اپنے انگریز پرنسپل کو خوش کرنیکے لیے یہ کہاکہ" لڑکوں نے ایسی گستاخی کی اور آپ نے کسی کو نکالا نہیں" پرنسپل صاحب دوبارہ غلام حسین کو کالج سے خارج کرنے پر آمادہ ہوگئے اور آخر اُن کو اپنے حکم کے حصۂ سوم کی خلاف ورزی کا بہانہ ملگیا۔ چنانچہ نواب صاحب بہادر تحریر فرماتے ہیں کہ" تیسرے حکم کی پابندی طالب علم مذکور نے نہیں کی اور خود پرنسپل صاحب نے اُسے ۱۵ فروری کی شام کو بچشم خود بورڈنگ ہاؤس سے باہر دیکھا۔ اس قصور میں اُنھوں نے اُسے بورڈنگ ہاؤس چھوڑنیکا حکم دیا اور یہ شرط لگائی کہ اگر ۱۶ فروری کی صبح تک بورڈنگ سے چپ چاپ چلا جائیگا تو وہ بی۔ اے کے امتحان میں شریک ہوسکیگا ورنہ کالج سے اُس کا نام خارج کردیا جائیگا۔ غلام حسین کے مقدمہ کے سبب سے طلبا میں برہمی پہلے ہی سے پھیلی ہوئی تھی، مگر ۱۵ فروری کے حکم پر یکایک نامناسب طور پر طالب علموں میں جوش پیدا

۵ نواب صاحب کا یہ قول افواہی طور پر لوگوں میں مشہور ہی۔ ہم نے اس افواہ کے درج کردینے میں اسلیے تامل نہیں کیا کہ خود نواب صاحب نے اپنے مضمون میں مختلف افواہوں پر بھروسہ کیا ہو اور اُنکو علانیہ درج بھی کردیا ہی

ہوا اور وہ یونین کلب کے سامنے جمع ہوئے اور شور وغل مچایا۔ اس پر براون صاحب
پروست اور ٹول صاحب پروفیسر آئے اور اُنھوں نے طلبا کو اپنے اپنے
کمرہ پر چلے جانیکی ہدایت کی مگر اُنھوں نے نہ مانا اور اُن سے گستاخی کے ساتھ
پیش آئے وہ مجبور ہو کر چلے گئے۔ اسکے بعد پرنسپل صاحب آئے اور اُن کو
بہت طرح سمجھایا۔ مگر بجائے اسکے کہ طلبا اُنکی نصیحت سُنتے اور اُن کا حکم مانتے
ان کے ساتھ بھی بے ادبی سے پیش آئے اور وہ بھی لاچار ہو کر چلے گئے۔

اس بیان میں بھی کئی مغالطے ہیں۔ پہلا مغالطہ تو جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں یہی ہے
کہ پرنسپل کی اجازت کا ذکر نہیں کیا اور یہ بھی نہیں ظاہر کیا گیا کہ مسٹر غلام حسین کالج
کے باہر صرف سوسائٹی باغ تک گئے تھے جو قانونی طلبا کے بورڈنگ ہونیکی حیثیت
سے کالج ہی میں شامل سمجھا جاتا ہے اور وہاں تک جانے میں بھی وہ سب پراکٹر کے ہمراہ
تھے۔ اور اسلیے کسی طرح سے اُنپر خلاف ورزی حکم پرنسپل کا الزام عائد نہیں ہو سکتا
دوسرا مغالطہ یہ کہ لڑکوں کی گستاخی سے پہلے انگریز پروفیسروں کی درشت کلامی کا
مطلق ذکر نہیں کیا گیا تاکہ لوگ سراسر لڑکوں ہی کو قصوروار سمجھ لیں۔ اس میں کوئی شک
نہیں کہ لڑکوں نے یورپین پروفیسرونکے ساتھ سخت کلامی کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں
رکھا۔ مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ طالب علموں نے اُن کو اپنے پرائیویٹ جلسے
میں آنے سے باصرار منع کر دیا تھا لیکن اُنھوں نے اس کی پروانکی اور زبردستی
اگر بجائے نرمی کے گرمی سے کام لیا حتی کہ اُن کو بدمعاش کہکر دفتروں میں منتشر
کر دینے کی دھمکی دی۔ تو ہم کو اس امر کے اظہار میں مطلق تکلف نہیں ہوتا کہ جو کچھ
ہوا اسکے ذمہ دار خود انگریز پروفیسر ہیں نہ کہ طالبعلم۔ بیشک جو پروفیسر اپنے طالبعلموں
کو بدمعاش کہے اور اُن کو نشانہ بندوق بنانیکا وحشیانہ ارادہ رکھے اسکے ساتھ
کسی قسم کی رعایت کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ طلبا حمیت انسانی سے عاری ہیں

تاہم لڑکوں نے بہت بڑے ضبط اور صبر سے کام لیا اور اپنے اظہار ناراضی کو صرف زبانی گفتگو تک محدود رکھا۔ پرنسپل کی رپورٹ میں لڑکوں کی جانب سے پروفیسروں پر جو اینٹ پتھر برسانے کا الزام لگایا گیا ہی اس کی تردید میں طالب علموں نے خوب لکھا ہی کہ "ہم اسکی تردید میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ جلسہ گریجویٹ لان میں ہو رہا تھا جہاں نہ اینٹ ہی نہ پتھر بلکہ سبزہ زار ہی جسمیں ہر دوسرے تیسرے روز پانی دیا جاتا ہی اور رولر پھیرا جاتا ہی" انگریزوں کے ایسے برتاؤ سے لڑکے قدرتاً نہایت کبیدہ خاطر ہوئے پھر اس پر طرہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن سے ان لوگوں نے اس معاملہ پر پولٹیکل رنگ چڑھانے کی کوشش کی چنانچہ پرنسپل اور پروفیسٹ کے بنگلوں پر مسلح پولس کا زبردست پہرہ مقرر کیا گیا۔ اور کہا جاتا ہی کہ کلکٹر و سپرنٹنڈنٹ پولس کیساتھ خفیہ میٹنگیں کر کے لفٹنٹ گورنر کو خفیہ حروف میں تار روانہ کیے گئے اور سنا گیا ہی کہ خزانہ سرکاری پر بھی محافظوں کی تعداد دونی کر دیگئی۔ ہمارے خیال میں انگریزوں نے یہ کارروائیاں جس غرض سے کی تھیں اُن میں انھیں پوری کامیابی حاصل ہوئی یعنی یہ کہ اس سے کالج کے انتہا سے زیادہ وفادار اور اطاعت گزار ٹرسٹی اسدرجہ مرعوب ہوئے کہ باستثنائے بعض سب نے گویا اس بات کی قسم کھالی کہ لڑکوں کی کچھ نہ سنیں گے اور جس طرح سے ممکن ہوگا انگریزوں کی تائید کرینگے۔ چنانچہ ان لوگوں کے آگے طلبا ہر چند روئے گائے لیکن سوا نواب وقار الملک بہادر اور حکیم اجمل خاں صاحب کے کسی نے ان سے ہمدردی نہ کی اور پرنسپل نے جو کچھ چاہا بالکل اُسی کیموافق فیصلہ کر کے اپنی دانست میں حق عبودیت ادا کر دیا۔ وہ فیصلہ یہ تھا کہ (۱) غلام حسین کو پرنسپل صاحب کے حکم کی تعمیل کرنا چاہیے (۲) طلبا کو چاہیے کہ ۱۰ فروری کے ۲ بجے تک معافی مانگ لیں جس کی نسبت طالبعلموں کا بیان ہی کہ "یہ حکم ہم کو

اسٹر بھی ہال میں سُنایا گیا جو ہم نے بادب سُنا۔ ہم ششدر تھے کہ معافی نامہ کس بات کا داخل کریں اور اُس میں کیا لکھیں اور ہم نے بالآخر یہ طے کیا کہ یا تو غلام حسین ہی کالج میں رہیں یا ہم سب کالج چھوڑ دیں کیونکہ غلام حسین کو جو سزا ہوئی وہ ہرگز اُسکے مستحق نہ تھے اور کوئی تحقیقات جانبین کی نہیں کی گئی بلکہ فیصلہ یکطرفہ کیا گیا۔

۱۸ ر فروری ۱۹۰۷ء حکیم اجمل خاں صاحب اور چند دوسرے ٹرسٹیوں نے طلبا سے کہا کہ تم اپنے ۱۵ قائم مقام منتخب کرو اور ہم لوگ اُن سے گفتگو کریں" طلبا نے یہ عذر کیا کہ اُن قائم مقاموں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس پر حکیم صاحب اور دیگر حضرات نے ذمہ لیا کہ ہرگز ان میں سے ایک کو بھی کسی طور پر نقصان نہ پہنچیگا۔ چنانچہ ۱۵ طلبا منتخب ہوئے نواب محسن الملک بہادر نے بھی چند طلبا کو طلب کیا اور کہا "کہ تم معافی نامہ داخل کرو اور یقین رکھو کہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا میں تمھارا ذمہ دار ہوں اگر تم میں سے ایک بھی نکالا جائیگا تو میں خود استعفا دیدوں گا"

ٹرسٹیوں کا فیصلہ چونکہ انصاف کے ساتھ نہیں کیا گیا تھا اس لیے قابل منظوری نہ تھا لیکن اول اس خیال سے کہ بغیر معافی مانگے ہوئے امتحان کی فیس روانہ نہوگی جسکو پرنسپل نے شاید اسی غرض سے ۱۸ فروری تک روک رکھا تھا حالانکہ اسکے الہ آباد پہنچنے کی آخری تاریخ ۲۰ ر فروری تھی۔ دوسرے اس خوف سے کہ پرنسپل کی شرارت سے کہیں کالج کو نقصان نہ پہنچے کیونکہ معاملے کو پولٹیکل رنگ دینے کے علاوہ ان کا یہ قول بھی عام طور پر مشہور ہو گیا تھا "کہ میں اس کالج کو کُل برباد کر سکتا ہوں۔ اور اگر لڑکے نہ مانیں گے تو کالج گورنمنٹ کے سپرد کر دوں گا"

تعیسرے اس وجہ سے کہ ٹرسٹیوں کے بعد کسی سے ہمدردی کی اُمید باقی نہیں رہی تھی۔ طالب علم آخر کار اس فیصلے کو قبول کرنے پر مجبور ہو گئے اور معافی مانگنے کی بھی ذلت صرف اس لحاظ سے گوارا کی کہ جھگڑا کسی طرح ختم ہو۔ چنانچہ خود نواب محسن الملک بہادر لکھتے ہیں کہ" بظاہر اسباب ۱۹ فروری کو طلبا نے معافی مانگ لی۔ غلام حسین کالج سے چلا گیا اور تمام شورش اس اُمید پر ختم ہو گئی کہ سوائے غلام حسین کے اور کسی کو سزا نہ دیجائیگی اور باقی تمام طلبا کا قصور معاف کر دیا جائیگا' لیکن ۲۱ فروری کو پرنسپل صاحب نے طلبا کی ۱۵ فروری کی رات کے گستاخانہ برتاؤ کی پاداش میں جو اُنھوں نے چند ممبران اسٹاف کے ساتھ کیا تھا' سات لڑکے اور منتخب کرکے اُن کو حکم دیا کہ وہ بورڈنگ ہاؤس سے چپ چاپ چلے جائیں' ورنہ غلام حسین کی طرح کالج سے اُن کا نام بھی کاٹ دیا جائیگا۔ اس خلاف توقع سزا پر لڑکوں کی شورش دوبالا ہوئی اور جو حالت پہلے تھی وہی قائم ہو گئی"۔

ہمارے خیال میں اس موقع پر ٹرسٹیوں کو کسی طرح اسٹاف کا ساتھ نہ دینا چاہیے تھا لیکن انگریز پرستی کے ذلیل جذبے سے مغلوب ہو کر اُنھوں نے اپنے قول و قرار کو بالکل فراموش کر دیا حتیٰ کہ آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں صاحب نے اپنی قوم فروشی کا مزید ثبوت اس تقریر سے دیا کہ" احمق طلبا' ہمیں اس بات پر ڈراتے ہیں کہ وہ کالج چھوڑ دینگے لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اُن کے کالج چھوڑ دینے سے ہماری پالیسی میں کسی طرح کا فرق نہیں آسکتا چھوڑنا تو کیا اگر ان دو ڈھائی سو لڑکوں کی گردنیں کٹ جائیں اور قربانی ہو جائے تب بھی ہمیں پروا نہ کرنی چاہیے"۔ اور صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب نے یہ ارشاد فرمایا کہ" ہم کو ان بیوقوف لڑکوں کی کچھ پرواہ نہیں

کرنا چاہیے۔ پہلے بھی ایک بار سید صاحب کے وقت میں لڑکوں نے ایک اسی قسم کا اسٹرائک کیا تھا۔ مگر اس کا نتیجہ کوئی ہمارے حق میں بُرا ثابت نہوا۔" اور نواب محسن الملک بہادر شاید بعذرِ مصلحت وقت اپنے ان الفاظ کو بالکل بھول گئے کہ " اگر اب کوئی بھی تم میں سے نکالا جائے تو میری سفید ڈاڑھی پر تھوک دینا۔" اس قسم کے برتاؤ کے بعد پھر ٹرسٹیوں کا لڑکوں سے یہ کہنا کہ "جو شور تم نے کی ہے، اوّل اس کو فرو کرو اور چپ چاپ اسٹاف کے احکام کی اطاعت کرو۔ پھر تمھاری جو کچھ شکایتیں ہونگی وہ سُنی جائیں گی اور اُنکی تحقیقات کی جائیگی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم جس طرح اپنے بعض پروفیسروں سے گستاخانہ پیش آئے ہو اور اس پر جو حکم پرنسپل صاحب نے دیا ہو تم اُس کی تعمیل نہ کرو اور تمھاری شکایتوں پر کچھ عمل کیا جائے۔" بالکل فضول تھا کیونکہ انگریزوں کے مقابلے میں ان کے قول و فعل کا اعتبار بالکل اُٹھ چکا تھا۔

غرضکہ ہر طرح پر مایوس ہو کر ۲۱ فروری کو طلبا نے عرضداشت نواب صاحب بہادر اور ٹرسٹیوں کی خدمت میں بھیجی کہ چونکہ آپ اپنے وعدے کے مطابق ہم کو محفوظ نہ رکھ سکے اس لیے ہم آپ سے رخصت چاہتے ہیں کیونکہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب نکال دیا جائیگا۔ ایسی غیر مطمئن حالت میں یہی بہتر ہے کہ ہم لوگ خود ہی چلے جائیں۔ اس عرضداشت پر منجملہ ۲۲۴ طلبا موجودہ بورڈنگ کے ۲۱۸ نے دستخط کیئے تھے۔ اور ۲۲ر فروری ۱۹۰۷ء کو طلبا نے اپنا اسباب درست کیا اور رخت سفر باندھا ردی اسباب کو (جو انکی ملکیت تھا) یکجا کر کے جلا دیا۔ کچھ طلبا جا چکے تھے کچھ جارہے تھے کچھ دوسرے دن جانیکا قصد رکھتے تھے۔" طلبا کی مذکورہ بالا تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ کل لڑکے خود ناراض ہوکر

کالج چھوڑ رہے تھے لیکن نواب محسن الملک بہادر حسب معمول اپنے گول مول الفاظ میں یوں رقمطراز ہیں کہ " طلبا نے کسی ٹرسٹی کی نصیحت نہ سنی اور بدستور ضد کرتے رہے۔ آخرکار ٹرسٹی صاحبان کالج سے چلے آئے اور اُنھوں نے مجبور ہو کر اسکے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا کہ کالج چند روز کیلیے یکم اپریل تک بالکل بند کر دیا جائے اور تمام طلبا کو چلے جانیکا حکم دیا جائے۔ تاکہ اس عرصہ میں اُن کے دل و دماغ درست ہو جائیں۔

اسی کے ساتھ یہ بھی فیصلہ کیا کہ ایک کمیٹی منتخب ٹرسٹیان کی بٹھائی جائے جو اُن اسباب کی تحقیقات کرے، جو اس شورش کے باعث ہوئے ہیں اور آئندہ کے لیے وہ تدبیریں سوچے کہ پھر ایسے ناگوار واقعات پیش نہ آئیں اس کمیٹی کے ممبر نواب وقار الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب شیخ عبداللہ صاحب، حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب، مولوی محمد نظام الدین حسن صاحب، مولوی عبداللہ جان صاحب، نواب محسن الملک اور مسٹر آرچ بولڈ مقرر ہوئے ہیں۔ اور اُنھوں نے ابتدائی جلسہ ۲۴ رفروری کو کیا۔" کمیشن کے تقرر پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا تھا البتہ اسکے بعض ممبروں کی نسبت طالب علموں اور پبلک کی اس دلیل کا درحقیقت کچھ جواب نہیں ممکن ہے کہ جن لوگوں کے متعلق کمیشن میں شہادتیں پیش ہونگی یا جنکی غلط پالیسی کے سبب سے یہ سارا ہنگامہ برپا ہوا اُن کا بھی فیصلہ کرنیوالوں میں شامل کرنا انصاف کے کس اُصول کے مطابق جائز سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر لکھنؤ۔ الہ آباد مراد آباد و شاہجہاں پور اور دہلی وغیرہ میں کالج کے پُرانے طالبعلموں اور بہی خواہوں نے جلسے کر کے یہ رزولیوشن پاس کیے کہ کمیشن کے ممبروں کی تعداد بڑھا کر چند آزاد خیال پُرانے طالب علموں کو بھی شامل کرنا چاہیے

اور پرنسپل اور سکرٹری کالج کو ضرور علٰحدہ ہو جانا چاہیے۔ کمی وقت کے باعث سے پبلک کی یہ خواہش پورے طور پر منظور نہو سکی کیونکہ کمیشن نے آخر اپریل کے مقررہ وقت سے پہلے ہی کام شروع کر دیا۔ لیکن صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے بروقت استعفا داخل کر دینے سے مسٹر محمد رفیق جج بحیثیت پریسیڈنٹ شامل کمیشن ہو گئے اور اگرچہ نواب محسن الملک اور مسٹر آرچ بولڈ نے صاحبزادہ صاحب کی قابل تعریف مثال کی تقلید نہ کی تاہم مرزا عابد علی بیگ صاحب کی مزید شرکت سے طالبعلوں کی کسیقدر اشک شوئی ضرور ہو گئی ورنہ اُن سب نے یہ مصمم قصد کر لیا تھا کہ اس بینا لبلہ کمیشن کے روبرو شہادت دینے سے قطعی طور پر انکار کر دینگے۔ پرنسپل اور سکرٹری کمیشن سے غالباً اس خیال سے علیحدہ نہونا چاہتے ہونگے کہ انکی موجودگی میں شاید طلبا اصل واقعے کو کسیقدر دیگر بیان کریں لیکن بمصداق ہر کہ از جان دست بشوید آنچہ در دل آید بگوید لڑکوں نے بلا خوف و خطر صحیح حالات اس انداز سے پیش کیے کہ ممبران کمیشن کی آنکھیں کھل گئیں اور سکرٹری و پرنسپل کو معلوم ہو گیا کہ معاملہ ہاتھ سے نکلا چاہتا ہے آخر کار دونوں نے صلاح کر کے مجبوراً کالج کے دوبارہ کھلنے سے ایک روز پہلے خارج شدہ لڑکوں کو کالج میں آنیکی اجازت دیدی اور مسٹر غلام حسین کو بھی امتحان میں بھیجدینے کا ارادہ ظاہر کیا۔

آنچہ دانا کند کند ناداں ‎ ‎ ‎ ‎ لیک بعد از خرابی بسیار

کمیشن کی تحقیقات ہنوز جاری ہے اور اُمید ہے کہ اس سے عمدہ نتائج ظہور میں آئیں گے کیونکہ موجودہ ممبروں میں سے پرنسپل و سکرٹری اور حاجی اسمٰعیل خاں صاحب کو چھوڑکر۔ نواب وقار الملک بہادر۔ مرزا عابد علی بیگ۔ مسٹر رفیق۔ اور شیخ عبداللہ صاحب کی دیانتداری و انصاف پسندی پر اعتماد نہ کرنے کی

بظاہر کوئی وجہ نہیں ہے۔

اس ذکر کو یہیں چھوڑکر اب ہم آخر میں نواب محسن الملک بہادر کے ایک اور فریب کا راز طشت از بام کرنا چاہتے ہیں۔ جس کا قصہ اس طرح پر ہے کہ کالج بند ہو جانے پر اُنھوں نے طلباء کے والدین کو دھمکا نیکے لیے تاکہ وہ ڈر کر اپنے عزیزوں کو دوبارہ کالج بھیجدینے میں عذر نہ کرسکیں، وہی ذریعہ اختیار کیا جو پرنسپل نے خود اُنکے اور بعض دیگر سادہ لوح ٹرسٹیوں کو دبانے کیواسطے استعمال کیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی رپورٹ کے آخر میں فرماتے ہیں کہ "اس ہنگامہ میں یہ افواہ بہت زور سے پھیلی تھی کہ طالبعلموں کو کانگریس والوں نے مدد دینے اور اپنے گروہ میں شامل کرنیکی ترغیب دی ہے اور لڑکے اُس آفر کے قبول کرنے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ خبر کہاں تک صحیح ہے مگر ہم کو معلوم ہوا ہے کہ لڑکوں نے گورنمنٹ کو مفصلہ ذیل تار دیا:۔

"ہم تمام طالب علم ہز آنر کو مطلع کرنا چاہتے ہیں کہ آج کل جو کالج کی کیفیت ہے وہ مطلق کوئی پولٹیکل حیثیت نہیں رکھتی۔ صرف چند ممبران اسٹاف سے جو شکایات ہیں اُنکے رفع کرنے کی کوشش ہے۔ ہم ہز آنر کو باادب یقین دلاتے ہیں کہ ہماری کوششیں احاطہ کالج کے اندر محدود اور تہذیب و واجبیت کے منافی نہیں ہیں ہم مدرسۃ العلوم مسلمانان کے خیر خواہ سرکار طالب علم اپنے محترم بانی سرسید کی پالیسی پر ثابت قدم ہیں اور اُس بن مانگی مدد کے لینے سے جو بیرون کالج سے لوگ دیتے تھے ہم نے انکار کردیا ہے۔ لبشرط ضرورت ہم ہز آنر سے جو کالج کے سرپرست ہیں مدد مانگنی زیادہ پسند کرتے"۔

ہم طلباء کے اس تار کی تعریف نہیں کرسکتے کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسقدر ذلت برداشت کرنیکے بعد بھی ان میں سے اکثر کیونکہ ہم بوثوق

کہہ سکتے ہیں کہ کل طالب علم اس تار کے مضمون سے متفق نہیں ہیں ورنہ ان کی
رائے سے یہ تار بھیجا گیا اپنی قدیم روش عاجزانہ پر قائم ہیں اور بجائے اسکے کہ
کالج کانسٹیٹیوشن کے رفارم کی خواہش رکھتے اپنی شکایتوں کو صرف چند
ممبران اسٹاف تک محدود کرنا چاہتے ہیں تاہم ہمکو پورا یقین ہی کہ "بیرون
کالج سے لوگوں کی بے مانگی امداد" کو کنایتًا " کانگرس والوں کی مدد" قرار دینے
میں سخت فریب سے کام لیا گیا ہی اور کانگرس کو خواہ مخواہ بدنام کرنیکے لیے طالبعلموں
کے ایک مبہم فقرے کا وہ مطلب نکالا گیا ہی جو اُن کی اصلی مفہوم کے ہرگز
موافق نہیں ہی۔ دیکھنا یہ ہی کہ کمیشن میں طلبار کا مفہوم دریافت کرنیکے بعد
اس ناواجب بیان کی انسٹیٹیوٹ گزٹ میں تردید بھی کیجاتی ہی یا نہیں۔ گورنمنٹ
ہند کا خوشامدی گروہ اگر کانگریس کی مخالفت کو اپنا فرض سمجھتا ہی تو وہ
جانے اور اُس کا ایمان لیکن حامیان کانگریس پر بیجا الزام عائد کرنیکی نیت
سے دروغ بیانی اور افترا پردازی سے کام لینا ہمارے نزدیک کسی طرح شایان
شرافت نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایڈیٹر صاحب البشیر کا راقم حروف کو پرائیوٹ
طور پر کانگرس کا تنخواہ دار ملازم بیان کرنا اور اپنے اخبار میں بھی دریردہ کانگرس
ایجنٹ قرار دینا ایک ایسا قابل افسوس کذب ہی جس کی نسبت سخت سے سخت
کلمہ حقارت کے استعمال کو بھی کوئی شخص ناواجب نہیں کہہ سکتا۔ اصل یہ ہی کہ جو
لوگ قومی فدائی ہونیکا دعویٰ رکھتے ہیں لیکن جنکو کالج کی خدمت کیلیے سفرخرچ
کے علاوہ زمانۂ خدمت کے بیش قرار معاوضے کا بھی مطالبہ کرنے سے شرم
نہیں آتی۔ اگر ان کو کسی کی بیغرض اور بلا معاوضہ ملکی خدمت کا یقین نہ آتا ہو
تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ؎

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

کمیشن تحقیقات کے روبرو ۱۸ مارچ تک شہادتیں پیش ہونگی اور اُس کے بعد غالباً ممبرانِ کمیشن اپنی رپورٹ مرتب کرینگے۔ لیکن بہی خواہانِ کالج کو فیصلہ کمیشن کے انتظار میں خاموش نہ ہو جانا چاہیے بلکہ معاملات کالج کو درست کرنے میں پوری کوشش سے کام لینا چاہیے اور طالبعلموں کو بھی اپنے خارج شدہ بھائیوں کے واپس آجانے پر خوش ہو کر حقیقی شکایتوں کو فراموش نہ کر دینا چاہیے بلکہ سمجھ لینا چاہیے کہ اصلاح کا یہی وقت ہی۔ اور اگر اس موقع پر غفلت کیگئی تو کالج کی درستی دس بیس سال تک کے لیے اور ملتوی ہو جائیگی۔ ہماری یہ استدعا و اصرار بلا وجہ نہیں ہی کیونکہ بعض طالبعلموں اور ظاہر دار ہمدردان قوم نے اس امر کے ثابت کرنیکی بلیغ کوشش کی ہی کہ اس جھگڑے کی اصلیت صرف اسقدر ہی کہ طالب علموں کو بعض موجودہ پروفیسروں کے برتاؤ سے شکایت ہی اور اگر وہ لوگ طلبا سے اچھا برتاؤ کرنے لگیں تو سب لڑکے پھر بدستور رضامند ہو جائیں گے۔ ممکن ہی کہ بعض لڑکوں نے اپنی شہادت میں بھی یہی بیان کیا ہو لیکن ہم بوثوق کہ سکتے ہیں کہ اس وقت سب سے بڑی شکایت نہ صرف طالب علموں کی بلکہ تمام مسلمانوں کی کالج کے متعلق یہ ہی کہ اس کے تمام معاملات میں یورپین اقتدار اعتدال سے بہت زیادہ ہو گیا ہی۔ کالج کے پرنسپل اور پروفیسروں کا کام یہ ہی کہ لڑکوں کو تعلیم دیں نہ یہ کہ وہ ان پر حکومت کریں اور اُستادانہ برتاؤ کے بجائے حاکمانہ طرز عمل اختیار کریں۔ لاریب اس وقت علی گڑھ کالج کا پرنسپل کسی دیسی ریاست کے انگریز رزیڈنٹ سے کم نہیں ہی۔ چنانچہ جس طرح سے انگریز رزیڈنٹ ہر وقت دیسی حکمرانوں کے آزادی کو سلب کرنے اور گورنمنٹ کی طرف سے خفیہ پولس کی حیثیت سے اُنپر مسلط رہنے کو اپنا فرض سمجھتا ہی۔ اسی طرح سے ہمارے کالج کا پرنسپل بھی کچھ تو ٹرسٹیوں کی کمزوری سے اور کچھ اس وجہ سے کہ وہ حکمران قوم کا ایک فرد

ہوتا ہی اور اپنی ذات کو انگلو انڈین حضرات کی طرح بجائے خود گورنمنٹ سمجھتا ہی، طالب علموں میں کسی قسم کی آزاد خیالی اور ملکی ہمدردی کی اسپرٹ کو روبترقی دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا۔

پس طالب علموں کا یہ پہلا فرض ہی کہ کمیشن کے ذریعے سے اور اگر کمیشن ان کے موافق فیصلہ نہ کرے تو بطور خود ٹرسٹیوں کو مجبور کریں کہ وہ اس خطرناک دباؤ کو کسی طرح سے دور کر کے کالج کو مسلمانوں کا ایک آزاد دارالعلوم بنانے کی کوشش کریں۔ ورنہ موجودہ حالت میں اس کو قومی کالج کہنا درحقیقت لفظ "قوم" کی ہتک کرنا ہی۔

ہم کو خوف ہی کہ کمیشن کے روبرو بعض پرانے طالب علموں نے موجودہ پروفیسروں کو ملازم ٹھیرانے کی نیت سے کالج کے گذشتہ پرنسپلوں اور پروفیسروں کی تعریف کی ہوگی اور بعض اب آرچ بولڈ اور براؤن کے دب جانے اور آئندہ عمدہ برتاؤ کرنیکے وعدوں سے خوش ہو کر انکی زیادتیوں کو فراموش کر دینے پر بھی آمادہ ہونگے۔ لیکن ہم طالب علموں کو آگاہ کیے دیتے ہیں کہ مسٹر بیک کے ان فیشنیبل مداحوں کی صلاح پر ہرگز کاربند نہوں کیونکہ "باطنی عداوت اور ظاہری رعایت" کی پالیسی علانیہ جبر و جور کی پالیسی سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہی۔ اور اس قسم کے برتاؤ میں انگریزوں کا تمام دنیا سے زیادہ ہوشیار ہونا ایک مسلمہ امر ہی۔ ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ جیسی دشمنی بیک نے کی وہ نہ کارنانے کی اور نہ اب آرچ بولڈ کر رہے ہیں۔ پولٹیکل حیثیت سے مسلمانوں کو ہمیشہ غلام بنائے رکھنا مسٹر بیک کا عام مشن تھا اور علی گڈہ کالج کو بالکل انگریزوں کے قبضہ و اختیار میں کر دینا ان کی خاص پالیسی تھی۔ چنانچہ ٹرسٹیوں کے مقابلہ میں پرنسپل کی قوت کو بتدریج بڑھا کر موجودہ

حالت پر پہنچا دینے کے باعث مسٹر بک ہی ہوئے ہیں لیکن بعض ظاہر بین اور فیشن پرست لوگ محض اس وجہ سے کہ مسٹر بیک کبھی کبھی طالب علموں کے ساتھ ہنس بول لیتے تھے، اور بعض کو "شیک ہینڈ" کی قابل افتخار عزت بھی بخش دیتے تھے، اُن کو آسمان پر چڑھا دیے ہیں۔ خیر یہ افسانہ طول طویل ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ جبتک ہمارے انتظامی معاملات بالکل ہمارے ہاتھ میں نہ ہونگے اُس وقت تک کالج کی حقیقی اصلاح بہت دشوار ہے جس کی سوا اسکے اور کوئی شکل نہیں ہے کہ ہم پرنسپل اور پروفیسروں سے عہدوں کیلیے سرسید کے قدیم اور غالباً مصلحتی اُصول یعنی یورپین کی قید کو بالکل اُڑا دیں جو سرسید مرحوم کے عہد کیلیے شاید موزوں ہو لیکن زمانے کی ترقی کے ساتھ ہمیشہ موزوں نہیں رہ سکتا اور اگر فی الحال ایسا ممکن نہ ہو تو اتنا تو ضرور ہی کریں کہ انگریزوں کے اختیارات کو اس حد تک محدود کردیں کہ وہ کالج میں ایک اُستاد کی حیثیت سے طالب علموں کو تعلیم دیں نہ یہ کہ ایک پولٹیکل افسر کی حیثیت سے اُن پر جابرانہ حکومت کو بھی جائز سمجھنے لگیں۔

کمیشن کا فیصلہ ابھی تک ظاہر نہیں ہوا لیکن ہم اس امر کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتے کہ کم از کم مسلمان پبلک ممبران کمیشن کی رائے سے متفق ہونے پر مجبور نہیں ہوسکتی اوّل اسلیے کہ اس خود ساختہ کمشن کی بے ضابطگی میں مطلق شبہ نہیں ہے۔ دوم اس بنا پر کہ نہ تو اس میں پبلک کی خواہش کے مطابق کسی غیر ٹرسٹی کا تقرر ہوا ہے اور نہ اس کی کارروائی پبلک ہوئی ہے۔ پس اگر اس کا فیصلہ اُمید کے کچھ بھی خلاف ہوا تو یقین ہے کہ پبلک ضرور اس بات کا دعویٰ کرے گی کہ جتنی شہادتیں اس وقت تک پیش ہوئی ہیں وہ شائع کی جائیں۔ اگر کمیشن اس سے انکار کرے گی تو ہم کو قوی اُمید ہے کہ جن لوگوں نے شہادتیں دی ہیں وہ از خود اپنے اظہار چھپوا کر تقسیم کر دینگے۔ یہ اس لیے کہ جہاں تک شہادتوں کا تعلق ہے بظاہر صورت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرنسپل و سکریٹری کی تکذیب اور طلبار کی تصدیق کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رہا ہے۔ ورنہ پرنسپل صاحب بہادر اپنے اس مردانہ قول سے کہ "اگر بجائے ... کے ... طالب علم بھی ہوں تو میں اپنا حکم واپس نہ لوں گا" روگردانی نکرتے اور نہ نواب محسن الملک بہادر آخرکار اپنا استعفا داخل کرنے پر مجبور ہوئے۔ جس کی خبر حال ہی میں مشہور ہوئی ہے۔ ۵

کی مرے قتل کے بعد اُسنے جفا سے توبہ   ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اگر نواب صاحب کا یہ استعفا انکے گذشتہ استعفوں کی طرح محض دفع الوقتی یا منت طلبی کی نیت سے نہیں بلکہ دل سے ہے تو ہم اس ہمت پر مبارکباد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کاش کہ وہ سب ٹرسٹی بھی جو اپنے میں انگریزوں سے کسی طرح کا اختلاف کرنے کی جرأت نہیں پاتے اور زبان حال سے اس کا اظہار بھی کرتے ہیں، نواب صاحب کی قابل قدر مثال سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور استعفا دیکر اپنے سے زیادہ موزوں لوگوں کے لیے جلد جگہ خالی کریں۔ فقط۔

[illegible] قانون

[illegible]
[illegible] قیمت صرف ۴ر

دنیا کی سیر

[illegible] جاپان۔ کوریا۔ سیام۔ جاوا۔ برما۔ تبت [illegible] عرب۔ امریکہ۔ آسٹریلیا۔ انکا تمام ملکوں [illegible] وہاں کے مکانات۔ لباس۔ تحریر رنگ [illegible] رسم و رواج و قانون و عادات۔ قیمت [illegible] [illegible] منشی [illegible] علی گڑھ

اشتہار

سودا ایمانداری و حلفیہ

(۱) [illegible] ایک خضاب [illegible]
[illegible]
[illegible] سیاہ [illegible]
[illegible] موقع امتحان
[illegible] سکیں۔
(۲) [illegible]
[illegible]
[illegible] انشاء اللہ
[illegible] بذریعہ تحریر قیمت
[illegible]
[illegible] چنگی

سلطانی پریس
ٹریڈنگ کمپنی بھاگلپور

ہر خاص و عام کو اطلاع دیجاتی ہے کہ اس کارخانہ میں تسری پیپے مختلف رنگ کے نہایت خوش [illegible] ہمیشہ خاص اہتمام سے تیار کرکے [illegible] روانہ کیے جاتے ہیں تھانہ سادہ رنگین [illegible] دو کنٹی [illegible] سیاہ و چہار خانہ رنگین مختلف الوان تھانہ تسری [illegible] و چہار خانہ [illegible] وغیرہ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ تاجروں کے ساتھ خاص رعایت ہوگی۔ نمونے حسب الطلب ارسال کیے جائیں گے

المشتہر
مولوی حمید الدین احمد سیکرٹری ٹریڈنگ کمپنی [illegible]
بھاگلپور [illegible]

فرامین مقدس حضرت رسول اللہ صلعم [illegible]

فرامین مبارک حضرت رسول اللہ صلعم [illegible]
(۱) یہ فرمان آنحضرت صلعم [illegible] تحریر فرمایا [illegible] نے نواب شاہجہان بیگم صاحبہ والیہ ریاست بھوپال کو تحفتاً بھیجا تھا
(۲) یہ فرمان رسول مقبول صلعم کا سلطان [illegible] خزانہ [illegible] سلطان [illegible] شہنشاہ ایران کی خدمت میں ارسال کیا [illegible] شوق ہے کیا کسی مسلمان کو محروم رہنا چاہیے [illegible] جناب حکیم سید محمد جواد صاحب رئیس اعظم [illegible] ہدیہ صرف [illegible]

مسجد نبوی	نقشہ کربلائے معلی باہر کے رخ سے	ایضاً اندر سے	کاظمین علیہ السلام باہر کے رخ سے	ایضاً اندر سے

روضہ حضرت عباس علیہ السلام [illegible] تحفہ اشرف مع شہر سامرہ
تمام ہندوستان کی مشہور عمارتوں کے نقشے و تصاویر شاہان [illegible]

المشتہر
سید محمد شبیر حسن محسن ڈاکخانہ قصبہ موہان ضلع اناؤ

شیخ محمد عبد الرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور چوک

چاندی سونے میں ایک گھڑی اکتیس جیبی نہایت سخت

گھڑی کو خوب خیال ہوگا کہ ایسے شخص کی جیبی گھڑی کی بہت وقت میں ایسے تھوڑے سے ہزار کی پیسہ کر کے بیچا کرتے تھے لیکن جب آپ نے خیال سے ملاں خود دیکھا اور قیمت ہے کہ گھڑی تب خود اس اعتبار کرنے کو کر دیا ہو کیا ہے اب اسکے ہمراہ شخص جو نہیں مضبوط بنا کر دیں۔ گھڑی ۲۴ گھنٹے کی کوک اصلی ڈائل مع سکنڈ ڈاکخانہ ریلوے اور تار گھر کے لیے موزوں ہے

نمبر ا سکوپ ڈائل کی پائدار	رسٹ واچ چلدی کلائی باندھنے کی
چاندی کی نقشی ڈائل کیس گارنٹی سال	چوری کی گھڑی سنہری پائدار
سنہری ڈائل کیس منقش گارنٹی سال	اکنس کلاک روزہ چابی دار

کانپور کے ہر قسم کے بوٹ

پمپ شو عمدہ وارنش شو	لیکن بوٹ شین بید وارنش
ایضاً عمدہ	رسین بوٹ مات پائدار ....
ایضاً کانپوری چمڑا	گرگابی وارنش دانی و زنانی
کینوس شوز مختلف	سلیپر دلی پھولدار خوش وضع
چپل ولایتی وارنش	کینوس بی ارجمی فی جوڑ
کرکٹ شو کینوس مختلف رنگ	ایضاً اصلی ولایتی وارنش

کانپور کے ہر قسم کے زین

زین سیاہ مع کل سامان	رومی زین مع کل سامان
زین چابک دار	اسپی کی کاٹھی کا زین عرب کے
زین پولو	ایسے مع کل سامان
زین گھوڑ دوڑ	انگریزی کاٹھی کا زین مع سامان
زین چکڑ اور بچوں کیلئے	سی دار بچوں کے لیے ۲۰

کانپور کے ہر قسم کے ساز

ساز فٹن چمڑا کانپوری پر زیر نہایت عمدہ قیمت	ساز کا گھر چمڑا کانپوری پیتل برنجی نہایت عمدہ خوبصورت
ساز فٹن وارنش نقرئی	ساز ٹمٹم چمڑا کانپوری پیتل برنجی
ساز چمڑی چمڑا کانپوری پیتل برنجی	ساز کل چمڑا کانپوری پیتل برنجی
ساز چمڑی وارنش نقرئی	

سوا اسکے ہر قسم کی اشیا دیسی و ولایتی تیار ہو سکتی ہیں۔

شیخ محمد عبد الرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور چوک

ممیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ سول سرجن و ڈاکٹر صاحب بہادر

مفرح الگرم ہیں اور تمام شہادت ہے کہ یہ شخص ایک نہایت قابل اور ریاست و روایت کے ہمراہ مشہور ہیں سرمہ و سیاہ ہے اور اسکے اس مجرب کی تصدیق زبانی ہی کہ یہ سرمہ حاصل ہوا ہے لیے اکسیر ہے ضعف بصارت وتاریکی چشم دھند جالا پھولا سبل سرخی ابتدائی موتیابند ناخونہ پانی بہنا خارش وغیرہ چند روز کے استعمال سے بینائی تیز ہو جاتی ہے اور عینک کی حاجت نہیں رہتی بچے سے بوڑھے تک یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت فی تولہ جو سال بھر کے لیے کافی ہے صرف دو روپیہ۔ ممیرہ کا سفید سرمہ فی تولہ تین روپیہ ہے۔ خاص ممیرے کی ماشہ بیس روپیہ مصری سرمہ فی تولہ چار آنہ۔ محصولڈاک ذمہ خریدار۔

المشتہر

پروفیسر میا سنگھ اہلو والیہ مقام شہباد ضلع گوجرانوالہ پنجاب

لنبے برگر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے

(۱) میں نے ممیرے کے سرمے کو جو کہ مسٹر میا سنگھ صاحب نے خود بنایا ہے آپ خود اور بہت سے مریضوں پر استعمال کر کے دیکھا ہے اور میں اس امر کی بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ یہ نادر سرمہ کا سرمہ نہایت ہی مفید اور آنکھوں کی بیماریوں کیواسطے اکسیر کا حکم رکھتا ہے میں نے اپنے تجربے میں جتنے کوئی سرمہ اس سے زیادہ فائدہ بخش نہیں دیکھا۔ آپ کا آنکھوں کی خدمتی ہی کسی قسم کی شکایت ہو بہت زور سے استعمال کرنے کی سفارش کرتا ہوں کہ یہ ہر طرح پر مفید اور فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ پانی آنا۔ دھند۔ جالا۔ خارش سرخی کیواسطے انگریزی ادویات سے زیادہ فائدہ بخش ثابت ہو اور سچ ہے آپ نے اسقدر سستے داموں میں یہ سرمہ ایجاد کر کے قوم پر بڑا احسان کیا ہے۔ اسکا شکریہ الفاظ میں ہو نا محال ہے کہ ملک کے تمام لوگ آپکے سرمے سے فیضیاب ہوں اور فائدہ اٹھائیں اور ہر طرح کی بیماریوں سے نجات حاصل کریں۔

سراقم

پنڈت گنگا رام صاحب ڈاکٹر حضور

نواب صاحب بہادر۔ بہاول پور

اردوی معلی

جلد ۱	بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۰۷ء	نمبر ۴

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی - بی اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اردوی معلی علی گڑھ

علی محمد خاں کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

تمام ضروری قوانین کا خلاصہ مع ترمیمات

جوہر قانون

تعزیرات ہند ضابطہ دیوانی و فوجداری سٹامپ و کورٹ فیس جسٹری انکم ٹیکس قانون شہادت معافی لگان مالگزاری ایکٹ میعاد سماعت آبکاری خفیفہ وغیرہ تمام قانون کا گھر عام فہم عبارت میں جسکو ہر شخص سمجھ سکے بات بات پر وکیل یا مختار و نکو روپیہ ٹھگانا نہ پڑے۔ قیمت صرف

دنیا کی سیر

ایشیا چین۔ جاپان۔ کوریا۔ سیام۔ جاوا۔ برما۔ تبت روس روم مصر۔ ٹرنسوال۔ حبش۔ امریکہ۔ اسٹریلیا۔ لنکا تمام ملکوں کے حالات مع تصاویر و نقشے۔ وہانکے مکانات۔ لباس۔ طرز تحریر رنگ ڈھنگ۔ بول چال آدمیوں کی نرالی رسم و قانون اور عادتیں۔ ان کتابوں کے ملنے کا پتہ۔ بابو گنگا پرشاد گپت منیجر منشی علیگڑھ

سدیشی نوٹس

ٹریڈنگ کمپنی بھاگلپور

ہر خاص و عام کو اطلاع دیجاتی ہے کہ اس کارخانہ میں تسری کے کپڑے مختلف رنگ کے نہایت خوش وضع و پائدار ہمیشہ خاص اہتمام سے تیار کرا کے ملک کے ہر گوشہ میں بکفایت روانہ کیے جاتے ہیں تھانہائے بافتہ سادہ و رنگین سبز و تامڑہ و مور کنٹھی و خاکی و سیاہ و چارخانہ رنگین مختلف الالوان و تھانہائے تسری تول و چارخانہ و ڈوریہ و ساری و رومال و لنگی و عمامہ وغیرہ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ تاجروں کے ساتھ خاص رعایت ہوگی۔ نمونے حسب الطلب ارسال کیے جاتے ہیں

المشتہر

مولوی حمید الدین احمد سیکرٹری ٹریڈنگ کمپنی محلہ آدم پور
بھاگلپور سٹی

ممیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ [illegible] صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں اور میڈیکل کالج کے پروفیسروں اور نامی ڈاکٹروں والیان ریاست اور یونیورسٹی نے سند فتح یورپین ڈاکٹروں کے تجربے کے اس سرمہ کی تصدیق زبانی ہے کہ یہ سرمہ دافع امراض چشم کے لیے اکسیر ہے ضعف بصارت تاریکی چشم دھند جالا پھولا سرخی ابتدائی موتیابند ناخونہ پانی جانا خارش وغیرہ چند روز کے استعمال سے بینائی تیز ہوجاتی ہے اور عینک کی حاجت نہیں رہتی۔ بچے سے بوڑھے تک سرمہ لگا سکتا ہے مفید ہے قیمت فی تولہ جو سال بھر کیلیے کافی ہے مبلغ دو روپیہ۔ ممیرا کا سفید سرمہ فی تولہ تین روپیہ ہے۔ خالص ممیرا فی ماشہ مبلغ پیسہ مصری سرمہ فی تولہ چار آنہ۔ محصول ڈاک ذمہ خریدار۔

المشتہر

پروفیسر سیا سنگھ اہلووالیہ مقام شالہ ضلع گورداسپور پنجاب

اس سے بڑھکر اور کیا شہادت ہوسکتی ہے

(۱) میں نے ممیرے کے سرمے جو کہ سردار سیا سنگھ صاحب نے خود بنایا ہے آپ خود اور بہت سے مریضوں پر استعمال کرکے دیکھا ہے اور میں اس امر کی بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ یہ نادر ممیرے کا سرمہ نہایت ہی مفید اور آنکھوں کی بیماریوں کیواسطے اکسیر کا حکم رکھتا ہے میں نے اپنے تجربے میں آجتک کوئی سرمہ اس سے زیادہ فائدہ بخش نہیں دیکھا۔ آپ کو آنکھوں کی ذرا سی بھی کسی قسم کی شکایت ہو بہت زور سے استعمال کرنے کی سفارش کرتا ہوں کہ ہر طرح پر مفید اور فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ پانی آنا۔ دھند۔ خارش۔ سرخی کیواسطے انگریزی ادویات سے زیادہ فائدہ بخش ثابت ہوگا اور سچ ہے آپ نے اسقدر سستے دام میں یہ سرمہ ایجاد کرکے ملک و قوم پر بڑا احسان کیا ہے اسکا شکریہ الفاظ میں ادا ہونا محال ہے ضرور ہے کہ ملک کے تمام لوگ آپکے سرمے سے فیضیاب ہوں اور فائدہ اٹھائیں اور ہر طرح کی بیماریوں سے نجات حاصل کریں۔

راقم

پنڈت گنگا رام صاحب ڈاکٹر حضور
نواب صاحب بہادر۔ بہاولپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میر حسن

(سنہ ۱۱۴۰ھ تا سنہ ۱۲۰۱ھ)

نام وخاندان میر غلام حسن نام حسنؔ تخلص خلف میر غلام حسین ضاحک، اباؤاجداد انکے ہرات کے رہنے والے تھے۔ امامی ہروی نے، کہ میر حسن کے جد تھے، انقلاب زمانہ کے ہاتھوں وطن اصلی کو چھوڑکر پُرانی دہلی میں سکونت اختیار کی۔ چنانچہ میر ضاحک دہلی ہی میں پیدا ہوئے اور میر حسن کا بھی ابتدائی زمانہ دہلی میں بسر ہوا

وضع و عادات اس باب میں منشی کریم الدین نے سنہ ۱۸۴۸ء کی زبان میں گارسن دتاسی کا قول اس طرح پر ترجمہ کیا ہے کہ "میر حسن اپنے باپ کے خلاف اس بات میں تھا کہ داڑھی اپنی بالکل صف چٹ کرواتا اور پگڑی اگلے وقت کے لوگوں کی سی باندھتا اور پوشاک اپنے باپ کی سی پہنتا تھا۔[1] قد اچھا بڑا تھا۔ رنگ بھورا۔ وہ ظریف اور خوش خلق آدمی تھا مگر بیہودہ اور کلام معیوب زبان سے کبھی نہ نکالتا تھا۔ سوائے ازیں شیریں مزاج اور پسندیدہ تعلیم یافتہ تھا۔ کسی نے اُسکو بُرا نہیں لکھا اور نہ کچھ الزام لگایا"۔ لیکن بعض کتابوں میں جو اُن کی تصویر دیکھنے میں آئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بقول صاحب آبحیات انکے "سر پر بانکی ٹوپی، تن میں تنزیب کا انگرکھا پھنسی ہوئی آستینیں۔ کمر سے دوپٹا بندھا" ہوتا تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ دہلی میں انکا طرز لباس وہی ہوگا جو انکے والد کا تھا۔ لیکن قیام لکھنؤ کے زمانے میں اس میں بہت کچھ تبدیلی ہوکر آخر کار وہی وضع قرار پائی ہوگی جسکا نقشہ آزاد نے کھینچا ہے۔

[1] سبز عمامہ اور بڑا جبہ میر ضاحک کی خاص وضع تھی۔

سلسلۂ شاعری | میر حسن کو لڑکپن ہی سے شعر و شاعری کا بدرجۂ کمال شوق تھا چنانچہ بزمانۂ نوعمری شاہجہاں آباد میں مصلح غزل کے میر درد صاحب تھے اور آخر میں بعد بربادی سلطنت اُس شہر کے مصنف مع والد بزرگوار فیض آباد میں آکر آباد ہوا ضیاءالدین ضیا اصلاح دیتے رہتے کبھی کبھی مرزا رفیع السودا سے بھی کہ ضیا انکے ہم مشق تھے مشورہ کا اتفاق ہوا،،[سلہ]

اس بیان سے معلوم ہوگا کہ میر حسن کی اُستادی کا فخر ایک سے زیادہ لوگوں کو حاصل ہے۔ لیکن درد اور سودا کی شاگردی کو عارضی سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ درد نے ابتدا میں اور سودا نے آخر میں صرف چند روز انھیں اصلاح دی تھی۔

درحقیقت میر حسن مستقل شاگرد میر ضیاءالدین ضیا کے ہیں جنکی نسبت مصحفی اپنے تذکرہ شعرا میں لکھتے ہیں کہ " میر ضیاءالدین ضیا اُستاد میر حسن شاگرد میر تقی میر۔۔۔۔ میر حسن بسیار ثنا خواں و معتقد او بود" آزاد نے اساتذۂ میر حسن کے زمرے میں اُنکے والد میر ضاحک کو بھی شامل کیا ہے جو بالکل قرین قیاس ہے۔

علمی استعداد | میر حسن کی علمی قابلیت کے باب میں بھی تذکرہ نویسوں کے اقوال مختلف ہیں میرزا علی لطف اپنے تذکرۂ گلشن ہند میں کہتے ہیں کہ " اقسام علم سے تو جمیع علوم میں انہیں اقرار ہیچدانی ہے ' ہاں مگر اشعار میں اُنکے البتہ ایک صفائی اور روانی ہے "! لیکن حکیم عبدالماجد لکھنوی مثنوی بدر منیر کے دیباچے میں فرماتے ہیں کہ " میر حسن طبقۂ سادات عظام سے ہے اور تحصیل علم اور فن شعر کی اسکے خاندان میں قدیم الایام سے ہے۔ چنانچہ مقبول الکونین میر غلام حسین ضاحک والد اُس بزرگوار نے عربی میں شرح ملا تک اور فارسی میں استعداد تمام بہم پہونچائی تھی اور شعر فارسی و ہندی اور ظرافت طبعی میں بھی کہ تخلص سے ظاہر ہے اسے کمال رسائی تھی۔ چنانچہ یہ

سلہ دیباچہ مثنوی میر حسن از حکیم عبدالماجد۔

رباعی فارسی نمایش شاہد استعداد اس استاد کے لیے آرسی ہے۔ رباعی

زیادہ دلاں کہ غمگساراں رفتند — سیمیں بدناں و گلعذاراں رفتند

چوں بوے گل آمدند بر باد سوار — در خاک چو قطرہ ہاے باراں رفتند

اور دادا نے بھی اسکے بامداد الٰہی علاوہ حاجی ہونے کے فضیلت میں خوب داد دی تھی۔ حقیقت حال غالباً یہ ہے کہ اس باب میں مولوی کریم الدین کا یہ قول صحیح ہے کہ[۱] "حسن عربی بالکل نہ جانتا تھا لیکن فارسی سے آگاہ تھا اسلیے اس زبان میں شعر بھی لکھے ہیں"۔ کیونکہ حکیم عبد الماجد نے بھی علم و فضل کے بیان میں حسن کے بجائے اُنکے باپ اور دادا ہی کی تعریف کی ہے اور وہ بھی اسقدر کہ "والد اس بزرگوار نے عربی میں شرح ملا تک استعداد بہم پہنچائی تھی"۔

البتہ میر حسن کی فارسی دانی میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ علاوہ متفرق فارسی اشعار کے انکی اُردو شاعری میں بھی فارسی ترکیبوں یا اُنکے ترجموں اور عام فارسی انداز بیان کی ایسی لطیف مثالیں[۲] کثرت کے ساتھ موجود ہیں جنکا کسی فارسی نہ جاننے والے شاعر کے کلام میں موجود ہونا ناممکنات سے ہے۔

اولاد و شاگرد حسن نے باوجود کامل استاد ہونیکے کسی کو اپنا مستقل شاگرد بنانا پسند نہ کیا حتیٰ کہ اپنے صاحبزادے میر مستحسن خلیق کو بھی خود اصلاح نہ دی بلکہ مصحفی کے سپرد کر دیا یہی وجہ ہے کہ دنیاے غزلگوئی میں انکا سلسلۂ شاعری بہت جلد ناپید ہو گیا لیکن جو کچھ انسے نہ ہوا وہ بامداد الٰہی اُن کی اولاد سے ظاہر ہوا اور اس شان سے ظاہر ہوا کہ اُنکے پوتے انیس و مونس و اُنس اُردو زبان کی ایک صنف کے موجد قرار پائے اور فن مرثیہ گوئی کا ایک ایسا نمونہ چھوڑ گئے جسکے اسوقت ہزاروں پیرو

---

[۱] ترجمہ تاریخ شعراے اُردو از گارسان دتاسی صفحہ ۱۲۱ [۲] آگے چلکر میر حسن کے کلام کا جو نمونہ پیش کیا جائیگا اُسمیں نشان زدہ الفاظ پر نظر کرنیسے ناظرین کو اس بیان کا کافی ثبوت بہم پہنچیگا۔

موجود ہیں اور غالباً ہمیشہ پیدا ہوتے رہینگے۔

میر حسن کے چار بیٹوں میں سے تین شاعر تھے۔ میر مستحسن خلیقؔ، میر احسن خلقؔ اور میر محسن محسنؔ۔ ان سب کا قیام فیض آباد میں رہتا تھا۔ چنانچہ خلیق و محسن بہو بیگم صاحبہ والدہ نواب آصف الدولہ کے داماد میرزا تقی کی سرکار سے متعلق تھے۔ اور میر خلق داراب علیخاں کی خدمت میں رہتے تھے۔ خلیق و خلق سے ایک ایک دیوان بھی یادگار موجود ہے۔

تصانیف میر حسن کے تصانیف سے دیوان حسن مشتمل بر جملہ اقسام سخن اور مثنوی بدر منیر معروف اسوقت تک موجود و مشہور ہیں۔ اگرچہ دیوان چونکہ چھپا نہیں ہے اسلیے کمیاب ہے یہانتک کہ آبحیات میں اس کی نسبت لکھدیا گیا ہے کہ "اب نہیں ملتا" تذکرہ شعراے ریختہ نایاب ہے اور یہی حال ان کی دو اور مثنویوں کا بھی ہے جن میں سے ایک کا قصہ اس طرح پر ہے کہ "ایک موقع پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مطابق پڑا۔ چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے قالب میں ڈھالا ہے۔

اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو کی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی اور چھڑیوں کے جانیوالوں کے جزیات رسوم کیا کیا تھے"[1]

خاتمہ دہلی چھوڑنے کے بعد میر حسن فیض آباد اور بعد ازاں لکھنؤ میں جا کر مقیم ہوئے تھے جہاں اُنھوں نے بڑی شہرت پائی اور نواب سالار جنگ نیز اُنکے بیٹے نواب مرزا نوازش علیخاں صفدر جنگ کی مصاحبت میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کی۔ اور آخر کار وہیں عشرۂ اول ماہ محرم ۱۲۰۱ھ میں بعہد نواب آصف الدولہ وفات پائی اور عقب باغ نواب قاسم علیخاں واقع محلہ مفتی گنج میں مدفون ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۞

[1] آبحیات آزاد صفحہ ۲۶۲

انتقال کے وقت آپ کی عمر ۷۰[1] سال سے زیادہ تھی۔ شیخ مصحفی نے تاریخ لکھکر حق آشنائی ادا کیا[2]

چوں حسن آں بلبلِ خوش داستاں روازیں گلزار بر رنگ و بو تافت
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی شاعرِ شیریں زباں تاریخ یافت

میر حسن کی شاعری

حسن کا طرزِ کلام زیادہ تر میر اور کمتر سودا کے انداز شاعری سے ملتا جلتا نظر آتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ کیونکہ سودا سے بلا واسطہ اور میر سے ضیا کے واسطے سے ان کی شاگردی مسلّم ہے۔ بیان سے گزر کر زبان کو دیکھیے تو وہ بھی انہیں دونوں بزرگوں کی سی ثابت ہوتی ہے۔ وہی "یں دیکھا" "میں کیا" جو میر و سودا و درد کے کلام میں پایا جاتا ہے انکے ہاں بھی موجود ہے۔ "دیکھوں ہوں" اور "دیکھے ہے" "اُسکے تئیں" "ٹک" کی سادگی اور شیرینی حسن کے دیوان میں بھی وہی کیفیت پیدا کرتی ہے جس کی بہار میر کے کلام کی جان ہے، فارسی ترکیبوں کے ترجمے ان کی غزلوں میں بھی دلپذیری کی اسی شان میں نمودار پائے جاتے ہیں جسکا جلوہ سودا اور قائم کی سحر طرازیوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ملاحظہ ہو۔

دور سے باغِ جہاں دکھلا کے دیوانا کیا متصل جانے نہ پایا میں کہ دیرانا کیا
دیکھتے ہی مے کو ساغر کا نہ کھینچا انتظار مارے جلدی کے میں اپنا ہاتھ پیمانہ کیا
طرفہ تر یہ ہے کہ اپنا بھی نہ جانا اور یونہیں اپنا اپنا کہکے مجکو سب سے بیگانا کیا
کچھ بہک کر بات گر بولوں تو ہوں معذور میں مجکو مستی نے تری آنکھوں کی مستانا کیا
بیوفائی نے یہ کس کی تجکو سمجھایا حسن اندنوں کیوں تو نے کم اس طرف کا جانا کیا

---

[1] آزاد اور مولوی کریم الدین کا قول ہے کہ میر حسن نے ۵۰ سے کچھ زیادہ عمر پائی لیکن بحیثیت ہمعصر مصحفی کی ۷۰ سال والی روایت قابل ترجیح ہے۔ [2] آبحیات آزاد۔

دل بچھڑ کر جو چلا اس بت مغرور تلک / دیکھنے میں بھی گیا اُسکے تئیں دور تلک
ہم بھی تب تک ہیں کہ یاں جلوہ ہے جبتک اُسکا / ہستی سایہ بھی پیچ پوچھو تو ہے نور تلک
مر گئے دن ہی کو ہم ہجر میں ہائے صد شکر / کام پہنچا نہ ہمارا شب دیجور تلک

اصناف سخن میں سے میر حسن قصیدے کے مرد میدان نہ تھے البتہ غزلسرائی میں انکا صاحب امتیاز اور مثنوی گوئی میں یکتائے زمانہ ہونا قطعی طور پر ثابت ہے جس سے کسی شخص کو انکار نہیں ہوسکتا۔ حقیقت میں بقول حضرت آزاد "بے نظیر و بدر منیر کا قصہ لاجواب لکھا۔ زمانے نے اسکی سحرالبیانی پر تمام شعرا، اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا۔ اس کی صفائی بیان اور لطف محاورہ اور شوخی مضمون اور طرز ادا کی نزاکت۔ اور جواب و سوال کی نوک جھوک حد توصیف سے باہر ہے" جس طرح قصیدے کیلئے بلاغت و شکوہ الفاظ، قطعات کے لیے تسلسل و نوی مضمون، رباعیات کے لیے برجستگی مضمون و الفاظ لازم و ملزوم ہیں اس طرح ذوق سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ بیانیہ مثنوی کے اسلوب نظم میں سادگی و روانی کے بجائے تصنع و محذوفات کو دخل نہو۔ کیونکہ اس سے مثنوی کی اصلی غرض فوت ہوجاتی ہے اور سامع یا ناظر کی طبیعت اصل قصے سے ہٹ کر رعایات لفظی کے پھیر میں پڑجاتی ہے۔

افسوس کہ اکثر شعرائے متاخرین نے اس خیال کو پیش نظر نہ رکھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہمکو مثنوی گلزار نسیم کی تعریف کے لیے۔ ضلع جگت۔ اختصار الفاظ، ابہام مضمون اور اسی قسم کے دیگر مشتبہ صفات کی جانب توجہ کرنا پڑتی ہے۔ ورنہ صرف مثنوی یا بیان حکایت کے لحاظ سے دیکھیے تو پنڈت دیاشنکر کی تصنیف کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ اور مثنوی میر حسن سے اسکا مقابلہ کرنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔

میر حسن کی غزلوں کا رتبہ انکی مثنوی کے برابر بلند نہیں ہے۔ پھر بھی بقول صاحب آبحیات "انکے اشعار غزل کے صحنوں میں گلاب کے پھول ہیں اور محاورات کی خوش بیانی مضامین عاشقانہ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے":

سب پہلے غزلوں کی عام خوبی ملاحظہ ہو۔

رو رو کے کیا ابتر سب کام مرے دل کا — کھویا مری آنکھوں نے آرام مرے دل کا
آغاز محبت میں دیکھا تو یہ کچھ دیکھا — کیا جانیے کیا ہوگا انجام مرے دل کا
طوفان ہے زلفوں پہ بہتان ہے کاکل پہ — ہے رشتۂ اُلفت ہی یہ دام مرے دل کا
جبتک میں جیا مجھکو قاصد نہ ملا آخر — اب جی ہی چلا لیکر پیغام مرے دل کا
معشوق کی اُلفت سے کب جان حسنؔ خالی — لبریز محبت سے یہ جام مرے دل کا

دل خدا جانے کس کے پاس رہا — ان دنوں جی بہت اداس رہا
کیا مزا وصل میں ملا اُس سے — میں رہا بھی تو بے حواس رہا
یوں کھلا اپنا یہ گلِ امید — کہ سدا دل پہ داغِ یاس رہا
شاد ہوں میں کہ دیکھ میرا حال — غیر کرنے سے التماس رہا
جب تلک میں جیا حسنؔ تب تک — غم مرے دل پہ بے قیاس رہا

مزا ہے استقامت سے مثال شمع مرجانا — جہاں ثابت قدم رکھنا وہاں سے پھر گزر جانا
کوئی دن کے ہیں مہماں اس چمن میں ایکدن آخر — مثال نکہت گل شام جانا یا سحر جانا
یہی گر خوف ہے تو زندگی کیونکر حسنؔ ہوگی — کہ جب کچھ بات کرنا روبرو اُسکے تو ڈر جانا

کیا جانے اُسکے جی پر کیا کچھ خیال گذرا — کچھ آپ ہی آپ اپنے دل پر ملال گذرا
ایسی ہی آہ باتیں اُس بیوفا نے چھیڑیں — روتے ہی روتے جس میں روزِ وصال گذرا
غیروں میں دیکھ مجھکو بیٹھے ہوئے کہیں کیا — ق — جو کچھ کہ اپنے دل پر گذرا خیال گذرا
پر منصفی سے اتنا فرمایئے کہ بارے — خدمت میں آپ کی بھی کچھ انفعال گذرا
کن تلخکامیوں سے راتیں حسنؔ نے کاٹیں — پر تو نہ اس تک اک دن شیریں مقال گذرا

رات غیروں کے بیاں آہ و زاری کر گئے — آپ ابھی آ کے میری غمگساری کر گئے
سینے دامن منہ پر اپنے اُسکے کوچے کی طرف — جب ہم آئے موسم ابر بہاری کر گئے

بادہ چلکر جس طرح مینھ برس جاتا ہے کہیں — آہ بھرتے آن نکلے اشکباری کر گئے
اب کہاں آہوں کے دستے اور کہاں وہ فوج اشک — ہم بہی کوئی دن غموں کی فوجداری کر گئے
حال میرا اُس سے جو پوچھا کسینے تو کہا — اے دہی جو آکے یاں کل بیقراری کر گئے
کل محلے سے حسن کے دل طلب کرتے تھے جو — آج یاں بھی آکے وے خانہ شماری کر گئے

اسکے بعد محاورات کی بے تکلفی اور روانی پر نظر کیجیے کہ شاعر نے کس جادونگاری سے کام لیا ہے۔

اتنی جاگھ نہ ملے اور کہیں مجکو کیا — تیری خاطر سے میں آتا ہوں نہیں مجکو کیا
گھر سے باہر جو نکلنا ہے تو جلدی سے نکل — ورنہ دہونی میں لگاتا ہوں ہیں مجکو کیا

غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو — کیا غضب کرتے ہو ادہر دیکھو
دیکھنا زلف و رخ تمہیں ہر وقت — شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو
گل ہوے جاتے ہیں چراغ کی طرح — ہم کو ٹک جلد آن کر دیکھو

اترائیو مت حسن یہ نادان بہت کچھ — دیکھا ہے ان آنکھوں نے میری جان بہت کچھ

ابرو سے اور مژہ سے عالم کی جان لی ہے — پہلے پہل یہ اسنے تیر و کمان لی ہے

ہر ایک دل و جاں کے مرغوب نظر آئے — میں خوب تمہیں دیکھا تم خوب نظر آئے

دامنِ صحرا سے اُلجھنے کو حسن کا جی نہیں — پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیابان دیکھکر

اب ہم ہجو لکھنؤ میں حسن کے چند شعر نقل کر کے اس تحریر کو ختم کرتے ہیں۔

یہ ملک ہے بہتر یہ بستا
اسیہ گل ہے گلی یوں تر ہے
کنواں بھی یوں ہے بھرا تنگ گھر
ہزاروں راہ اس میں پیچ در پیچ
نہ بس کرنے سے یہ شہر ہم عدد ہے

کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستا
بغل جس طرح زنگی کی بہے ہے
پڑے تیلی کا تل جیسے نظر میں
ولیکن مثل زلف زشت و پیچ
اگر شیعہ کہے نیک اسکو بد ہے

کسی کا آسماں گھر ہوا میں
فراغت سے یہاں کسکا مکاں ہے
کنواں کہنا اسے ہے عقل سے دور
جو کوئی رات کو بھولے یہاں گھر
سوائے قندیاں دیکھا نہ کچھ اور

کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں
ہر اک گھر نحس کا سادا ہیاں ہے
کہ ہے اس گھر کی چھاتی کا وہ ناسور
پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ در در
سو ہے روپوش وہ بھی دیکھ یہ طور

بلجیم کے دلفریب نظارے

(۵)

بروسلس کے باغات میں بائی دی کامبری نہایت ہی خوبصورت باغ ہی - یہاں شام کیوقت ٹہلنے نکلنا یا گاڑی پر سوار ہو کر گذرنا نہایت دلچسپ و پرلطف معلوم ہوتا ہی۔ ہرطرف کرسیاں اور بنچیں لوگونکے آرام کے لیے بچھی رہتی ہیں اور درختونکے جھنڈ اور دو رویہ صفیں نہایت ہی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے خوب یاد ہی کہ جسدن سہ پہر کیوقت ہماری پارٹی یہاں آرام کے لیے ایک رسٹران میں آئی تھی۔ اُسدن گرمی سخت تھی اور برف کی بنی ہوئی قفلیوں اور لیمو کے شربت نے ایسا فرادیا تھا کہ مدتوں یاد رہیگا۔ اس باغ کے قریب ہی ایک مقام ہیوڈرام کے نام سے مشہور ہے جہاں اکثر گھوڑ دوڑ ہوا کرتی ہی -

یہاں تعلیم گاہیں بکثرت ہیں خصوصاً موسیقی کی تعلیم کے لیے یہ ملک مشہور ہی۔ پرانی تعلیم گاہوں میں یونیورسٹی بہت قدیم ہی۔ یہ شہر کے پرانے حصے میں واقع ہی۔ اور باہر سے کچھ زیادہ عالیشان نہیں معلوم ہوتی۔ اس زمانہ میں یہاں چھٹیاں تھیں اور دربان کے کمرے میں سونے کا ایک طوطے جو پنجرے میں ٹنگا ہوا چیخ رہا تھا اور کوئی ذی روح اندر نظر نہیں آیا۔ اسلیے میں جلدی سے پچھلے پاؤں لوٹا۔ اس شہر کے ہسپتالونکے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا جن میں سے "سینٹ زین" کا اسپتال قابل ذکر ہی -

اسکے باہر دیوار پر پتھر کے مربع تختوں کے اوپر ہمارے اسٹریچی ہال کی طرح اُن تمام لوگونکے نام کندہ ہیں جنھوں نے چندہ دیا ہی۔ اسٹریچی ہال میں اندر کی جانب تختیاں نصب ہیں اور صرف اُن لوگوں کے نام کندہ ہیں جنھوں نے محض اس ہال کی تعمیر میں چندہ دیا ہی مگر یہاں کسی قسم کی تخصیص نہیں ہی۔ اندر بیمارونکے آرام کے لیے جو انتظامات کیے گئے ہیں اور جو صفائی ہرطرف نظر آتی ہی وہ بہت ہی قابل تعریف ہی۔ خصوصاً یہاں کی سسٹرس[1] جو اپنے فرائض کو مالی منافع

---

[1] رومن کیتھولس میں راہبات کی مدارج ہیں۔ جو سب سے زیادہ مقدس راہبہ ہوتی ہی اُسے مدر کہتے ہیں اور باقی دوسروں کو سسٹرس

کے لیے انجام نہیں دیتیں جیسا کہ انگلستان میں حال ہے۔ بلکہ بیماروں کی تیمارداری کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہیں اور تمام کام نہایت سچے جوش کے ساتھ کرتی ہیں۔ یہاں چند عملیات جراحی کے (آپریشن) بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا جس سے اس بات کا ثبوت ہوا کہ فرانس اور بلجیم کے سرجن اپنی ہوشیاری میں کسی ملک کے سرجنوں سے کم نہیں ہیں بلکہ بعض باتوں میں سبقت رکھتے ہیں
اسپتال کے قریب ہی خوبصورت بوٹینکل گارڈن ہے جہاں شیشے کے مکانات نباتات کے گرم رکھنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ تمام باغ ایک نہایت خوبصورت ڈھالوان زمین پر واقع ہے اور دور سے اسکا سین نہایت دلفریب معلوم ہوتا ہے۔

اسکے بعد شاہی کتب خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ کتب خانہ پرانے مکتوبات کے لیے بہت مشہور ہے۔ ۲۴ ہزار کے قریب نادرالوجود مکتوبات اس جگہ جمع ہیں۔ اکثر ان میں سے اُس شخص کی دلچسپی کے لیے مخصوص ہیں جسے عیسوی دنیا کے ہنر تحریر انجیل یا دیگر مطلا اور رنگ آمیز کتب کو دیکھنے کا شوق ہو۔ ساتویں صدی عیسوی میں جو کھیلنے کے تاش رائج تھے وہ یہاں دیکھنے میں آئے۔ ان پر بڑے بڑے بادشاہوں کے دستخط تھے ایک بات مجھے عجیب معلوم ہوئی کہ جس طرح ہمارے ملک میں اکبر وغیرہ کے زمانے میں مشہور کتابوں کو قلم سے لکھنے اور مطلا اور مذہب بنانے میں پوری کاریگری صرف کر دینے کا رواج تھا اسی طرح ازمنہ وسطےٰ میں یورپ میں بھی یہی دستور تھا اور اُس زمانہ کے بادشاہ بھی ایسی چیزوں کی بہت قدر کرتے تھے۔ اس کتب خانے میں ایک لاکھ کے قریب فلانڈرس کے مشہور صناعوں کے نہایت عمدہ بنائے ہوئے نقش و نگار ہیں جنمیں تمامتر مذہبی واقعات دکھائے گئے ہیں اور اُنکے ہنر و شوق کا پتہ دیتے ہیں۔

کتب خانے کے قریب ہی عجائب خانہ "ماڈرن" ہے جسمیں ۱۸۳۰ء سے بلجیم کے صناعوں کی بہت عمدہ تصاویر جمع ہیں مگر کوئی اس قابل نہیں جسکا خاص طور پر ذکر کیا جائے۔ البتہ شاہی عجائب خانے "میوزیم" میں جو تصاویر ہیں وہ بیشک قابل ذکر ہیں۔ اُسکے باہر مصوری بسنگ تراشی

سماری۔ اور موسیقی کی دیبیوں کے بہت بڑے بڑے بت نصب ہیں اور اندر بڑے بڑے مصوّروں اور ہنرمندوں کے خوبصورت بسٹ ہیں۔ انکے علاوہ اور بھی بکثرت تصاویر اور بت ہیں جن میں بعض کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

پتھر کی مورتوں میں تین خوبصورت لڑکیوں کی مورتیں ہیں جو انسانی "نکوئی" کی مثال ہیں۔ دیکھنے والے کی نگاہ پہلے انھیں مورتوں پر پڑتی ہے۔ اسکے بعد کیوپڈ (یعنی عشق کے دیوتا) اور "حسد" کے بت ہیں۔ دوسری جانب "وینس" (محبت کی دیبی) اور فاختہ کے جوڑے کو نہایت خوبی سے دکھایا ہے۔ لیکن ان سب کی جان وہ خوبصورت مورت ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک عمر رسیدہ ماں اپنے اکلوتے لڑکے کو جس پر بجلی گری ہے کس طرح مردہ پاتی ہے۔ یہ مورت تانبے کی ہے مگر کس خوبی کے ساتھ اس مادری غم واندوہ کو دکھایا ہے کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بڑھیا ماں پر اپنے بچے کو یکایک اس طرح مردہ دیکھکر جو حالت طاری ہوئی ہے کہ آنکھوں سے ایک بھی آنسو نہیں نکلا اور بایاں جبڑا کچھ عجیب طرح سے نیچے لٹک گیا ہے۔ منہ تھوڑا سا کھلا ہوا ہے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے۔ اس سب کو بت تراش کے لاجواب اوزار نے ایسی خوبی کے ساتھ دکھایا ہے کہ تعریف نہیں کیجاسکتی ہے۔

ایک دوسرا بت ہے جس میں کیوپڈ کے ایک قیدی کی حالت دکھائی ہے کہ غریب ایسی بیچارگی کی حالت طاری ہے۔ ایک اور نہایت خوبصورت سنگ مرمر کا بت ہے جس میں ایک شیر کو گرفتار عشق دکھایا ہے۔ اس جانور کی مہیب جسامت اور ایسی تابعداری کے ساتھ خوبصورت لڑکی کے قابو میں اپنے تئیں دیدینا جو اسکے پنجے سے کانٹا نکال رہی ہے ایسا موہوا اور تعجب معلوم ہوتا ہے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ انکے علاوہ اور بھی بہت سی مورتیں ہیں جنکا ذکر کرنا طوالت سے خالی نہ
اس عجائب گھر میں زیادہ تر مرقعے اور تصاویر ہیں۔ اکثر تو بہت قدیم ہیں اور فلانڈرس کی ہنرمندی کو یاد دلاتی ہیں۔ پندرہویں صدی عیسوی کی چند عمدہ تصاویر ہیں مثلاً حضر

آدم وحوا کی تصویر اور دیگر مذہبی واقعات اور افسانوں کی جو اُس زمانہ کے لحاظ سے بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہیں۔ سترہویں صدی عیسوی کے فنون کو اسی طرح دکھایا ہے۔ اس میں روبان کی تصاویر بہت زیادہ قابل ذکر ہیں۔ یہ مصوّر اپنے زمانہ میں بہت نامی گزرا ہے اور آجتک اس کی تصاویر دنیا کے مرقع خانوں میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اکثر ان میں سے انتھہ ورپ کے عجائب خانے میں موجود ہیں۔ لیکن بعض نہایت عمدہ تصویریں اس جگہ بھی نظر آئیں۔ انکا طرز مذہبی ہے جس میں مذہب عیسوی کے مختلف واقعات کو دکھلایا ہے اور خاصکر حضرت عیسٰی کے واقعات زندگی کے اکثر مناظر دکھائے ہیں۔ انکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عجیب ہُنرمندی جس کی مثال اس زمانے میں منا محال ہے اسکی تکمیل کا محرک اعلیٰ وہ مذہبی جوش ہوگا جو روبان کے رگ وریشہ میں پایا جاتا تھا اور جسکے پردے میں اس فن لطیف کے ماہرین عالم صدیوں سے اُسکے کمال کی ثناخوانی میں رطب اللسان چلے آئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جس شخص کو مذہبی تصاویر سے زیادہ شوق نہیں ہے وہ اس بے نظیر مصور کے ایک ہی جانب رُجحان کو زیادہ دلچسپی کی نگاہ سے نہیں دیکھیگا تاہم بعض تصاویر ایسی بھی ہیں جو خواہ مخواہ ہر ملک و ملت کے شخص کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ مثلاً شام کے بڈھے حضرت عیسٰی کو دیکھنے آئے ہیں۔ حضرت مریم گلستان میں ہیں۔ حضرت عیسٰے اس دنیاے دوں پر آگ اور بجلی گرا رہے ہیں اور حضرت مریم اور سینٹ وانسس ترحم کے لیے منتیں کر رہے ہیں۔ سینٹ لی ونس کی شہادت۔ جس میں سینٹ کی زبان قاتل دسپنے سے کھینچکر بھوکے کتّے کو کھلا رہا ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی تصویریں ہیں جو معلوم ہوتا ہے کہ روبان نے کسی گرجے کے لیے تیار کی ہوں گی۔ ان میں واقعات کا ہر جزو بالتفصیل ایسی خوبی کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ بے ساختہ تعریف زبان سے نکل جاتی ہے۔ وان ڈائیک کی تصاویر بھی اس جگہ بکثرت ہیں۔ یہ مصور بھی نہایت مشہور گذرا ہے۔ اس نے

پرانی داستانوں اور افسانوں (میتھالوجیہ) کو نہایت خوبی کے ساتھ دکھایا ہے اور بعض مذہبی تصاویر بھی کھینچی ہیں۔ زاروان کا نام بھی اس موقع پر قابل ذکر ہے۔ اس کی وہ تصویر مجھے بہت پسند آئی جس میں اُسنے دنیاوی غرور اور شیخی کو تصویر کے پیرایہ میں بڑی خوبی کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔ حضرت آدم و حوا کی جس تصویر کا اوپر میں نے ذکر کیا ہے۔ اسکا مصور وآن ایک تھا۔ اپنے زمانے کے لحاظ سے اس مصور کی یہ تصویر حسن و خوبی میں بے مثل شمار کی جاتی ہے۔ اولاً یہ تصویر ایک گرجے میں تھی مگر وہاں سے نامناسب خیال کرکے یہاں اُٹھا لائے۔ یہ تصویر بالکل برہنہ ہے۔ حضرت حوا کا سر کسیقدر بڑا ہے۔ جسم بہت زیادہ آگے کی جانب اُبھرا ہوا ہے اور ہاتھ پیر کسیقدر چھوٹے معلوم ہوتے ہیں مگر نزاکت و ادا کی خوبی کے علاوہ ایسی رنگ آمیزی کی گئی ہے کہ اصلی گوشت پوست کا دھوکہ ہوتا ہے۔ حضرت آدم میں مصور نے زیادہ ہوشیاری سے کام لیا ہے اور نزدیک یا دور سے کوئی عضو بے جوڑ نہیں معلوم ہوتا۔

اسی میوزیم میں ایک پرانے مصور کی چند تصویریں اور نظر آئیں جو "اتھو سوم کے انصاف" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں پرانے زمانے کے ایک قصہ کو نہایت خوبی کے ساتھ دکھایا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ اتھو اپنی ملکہ کو وزیر اعظم کی سپرد کرکے غیر ملک کے سفر کو جاتا ہے۔ جب لوٹ کر آتا ہے تو ملکہ دربار میں آکر فریاد کرتی ہے کہ وزیر نے اُسکے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے جسپر بادشاہ وزیر کو قتل کرتا ہے۔ لیکن قتل کے بعد اس کی بے جرمی کا ثبوت پاتا ہے اور غصہ میں اپنی ملکہ کو آگ میں جلانیکا حکم دیتا ہے یہ تصاویر پہلے کسی زمانے میں دیوان عدالت میں لٹکائی گئی تھیں تاکہ لوگ دیکھیں اور عبرت حاصل کریں۔

اس میوزیم کا ذکر چھوڑکر اب میں میوزیم ورٹز کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جہاں واقعی ایسے قابل دید مرقعے ہیں جنکی نظیر یورپ میں کم ملسکتی ہے۔ یہ تصویرخانہ ایک جُداگانہ عمارت سے

اور صرف ایک ہی مصور کی بنائی ہوئی تصویریں یہاں ہیں۔ جوزف ورٹز ۱۸۰۶ء سے ۱۸۶۵ء میں گذرا ہے۔ ہنرمندی کے لحاظ سے اسکا نام بڑے بڑے مصوران یورپ میں لیا جاتا ہے اس میں اگر اپنی قابلیت خداداد کے ساتھ مزاج میں تھوڑی سی سنک نہ ہوتی جسکا اظہار اُس کی تمام تصویروں سے ہوتا ہے تو غالباً اُسے مصوروں میں اتنا بڑا رتبہ حاصل نہ ہوتا۔ اسکی تصویریں ایسی عجیب ہیں کہ لوگ انہیں دیکھتے ہیں اور پریشان خیالی اور قوت تخیلہ کی عجیب بلند پروازی پر کبھی حیرت کرتے ہیں اور کبھی ہنستے ہیں۔ کبھی نفرت سے مُنہ پھیر لیتے۔ کبھی عبرت پکڑتے ہیں اور کبھی تعریف کرتے ہیں۔ مرقعوں کے اس عجیب مجموعہ کا اس موقع پر ذکر کرنا شاید بے محل نہوگا۔

(۱) "پٹروکلس کی نعش پر"۔ یہ تصویر بہت بڑی ہے جس میں یہ دکھایا ہے کہ پٹروکلس یونانی سپہ سالار کی نعش پر یونان اور ٹرائے کے جانباز اڑے ہوئے اور ہر گروہ اپنی اپنی طرف لیجانے کی کوشش کرتا ہے۔ پٹروکلس کی برہنہ نعش پر ایک مضبوط کپڑا لپٹا ہوا ہے سروں کو ہر دو فریق پکڑے ہوئے اپنی اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اس سخت کشاکش میں لاش کو جو حرکت ہوتی ہے اور کفن پر بل پڑ جاتے ہیں اُن کو نہایت خوبی کے ساتھ دکھایا ہے۔

(۲) "یتیموں کا ماتم" جس میں بہت سے غریب بچے اپنی ماں کے تابوت سے لپٹتے ہوئے واویلا کر رہے ہیں۔ یتیموں کی امداد کے لیے اس مصور سے لوگوں نے چندہ کی درخواست کی تھی جسکے بجائے اُسنے یہ تصویر تیار کرکے نذر کی۔ جسکا اثر عامہ خلائق پر اسقدر ہوا کہ امداد کی کوئی کمی نہ رہی۔ یہ تصویر واقعی انتہا درجہ کی دردناک ہے۔

(۳) بھوک۔ فلاکت۔ حماقت اور جرم۔ ان چار چیزوں کو اس طرح دکھایا ہے کہ ایک بدنصیب عورت غربت اور پریشان حالی سے لاچار ہو کر دیوانی ہوگئی ہے اور اپنے چھوٹے بچے کو بھون بھون کر کھا رہی ہے اور اپنے بال نوچ نوچ کر عجب

شکل بنا رہی ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس تصویر کو میں نہ دیکھتا کیونکہ کئی روز تک اُس نے مجھے پریشان رکھا اور ہندوستان کے غدر کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔

(۴) "اُنیسویں صدی کی تہذیب" اس میں یہ دکھایا ہے کہ سپاہی ایک مکان میں داخل ہوئے ہیں۔ ایک عورت ایک ہاتھ امداد کے لیے اُٹھائے ہوئے اور دوسرے میں کچھ اپنا سامان لیے بھاگ رہی ہے۔ اور سپاہی اپنی سنگینوں اور بندوقوں سے اُسے نشانہ بنا رہے ہیں۔ شاید یہ تصویر نپولین کے افواج کی بے رحمی کو دکھاتی ہیں۔

(۵) "اخیر توپ" مقتولوں کا انبار میدان جنگ میں ہے اور آسمان سے فتح و نصرت کے فرشتے اُتر رہے ہیں۔

(۶) "بچے کا جلنا" گویا ایک مکان میں آگ لگی ہے اور ماں اپنے بچے کو گود میں لیے چلاتی ہوئی اُسی طرح جل گئی ہے۔ عجب ہیبت ناک تصویر ہے۔

(۷) "بلجیم کی ایک خاتون کی جوانمردی" اس میں یہ دکھایا ہے کہ ایک مہیب شخص ایک عورت کو برہنہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اُس کی عصمت کے درپے ہے اور عورت ایک ہاتھ سے تپنچہ اُس آدمی پر چھوڑ رہی ہے۔ عورت کے چہرے سے عجب پریشانی اور خوف کے آثار پائے جاتے ہیں۔

(۸) "خودکشی" یعنی ایک آدمی نے تپنچہ سے اپنا سر اُڑا دیا ہے اور ایک طرف موت کا فرشتہ آنکھیں نیچی کیے ہوئے کھڑا ہے اور دوسری طرف حیات کا فرشتہ نفرت کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ چھپائے ہوئے ہے۔

(۹) "حضرت عیسٰی کی ظفریابی" یہ تصویر بہت ہی بڑی ہے اس میں آسمان سے حضرت عیسٰی کا نورانی چہرہ نظر آرہا ہے۔ اور حضرت زمین پر ایک انبوہ فرشتگان کے ساتھ نیچے اُتر رہے ہیں۔ اور نیک و بد روحوں میں ہر طرف کشاکش ہے۔

اس تصویر کی رنگ آمیزی اور اظہار جزئیات نہایت ہی قابل تعریف ہیں جنکو بیان کرنا مشکل ہے۔

(۱۰) "نیکی وبدی کی لڑائی" اس میں عجیب عجیب مہیب اور خوبصورت دونوں طرح کی تصویریں اسقدر بڑی اور نرالے انداز کی بنائی گئی ہیں کہ کمال حیرت ہوتی ہے اور مصور کے متخیلہ کی پرواز سمجھ میں نہیں آتی۔

(۱۱) "شیر واٹرلو" یہ تصویر بھی بڑی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ایک نہایت مہیب شیر واٹرلو کے میدان میں ایک عقاب کو دبائے ہوئے بیٹھا ہے اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے کھا رہا ہے شیر سے مراد افواج متحدہ (یعنی انگریزی اور پرشن فوج) ہے اور عقاب سے مراد فرانسیسی فوج اسلیے کہ نپولین کے پرچم پر عقاب بنا ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ورٹز فرانسیسیوں کا دوست نہ تھا۔

(۱۲) "نپولین اعظم جہنم میں" یہ تصویر بہت ہی عجیب ہے۔ اس میں یہ دکھایا ہے کہ نپولین اپنی پوری فوجی وردی میں جہنم میں کھڑا ہے اور آگ چاروں طرف سے لپیٹے ہوئے ہے۔ اُسکے ہر چہار طرف صدہا غریب عورتیں۔ بچے۔ بڈھے اور لڑکے جنکے خاندانوں پر اسکی لڑائیوں کی وجہ سے تباہی وبربادی آئی تھی یہ چیخ اور چلا رہے ہیں اور ہر طرف سے اُسے نوچ کھسوٹ رہے ہیں اور نپولین مہیب صورت بنائے اُن کی طرف غیظ وغضب سے دیکھ رہا ہے۔ یہ تصویر بہت کچھ عبرت انگیز وپُرمعنی ہے۔ اصل میں ورٹز اپنے ملک کا بڑا فدائی تھا۔ اُسکو نپولین کی فتح یابی اور اپنی قوم کو بے بس دیکھنا پسند نہیں آیا اس لیے اُس نے اس عمدہ موقع پر اپنی دلی نفرت کا جو نپولین سے اُس کو تھی اظہار کیا ہے۔

"مانی" از لندن۔

سکندرہ

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

ہندوستان کی عمارتوں میں سکندرہ یعنی مدفن اکبر اعظم سیاح کی چشم بینا کے لیے عبرت کی ایک بڑی درسگاہ ہے۔ یہاں جو منظر وہ دیکھتا ہے اس کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ اور جو نغمے گوش تخیل سُنتا ہے وہ کسی طرح پر زبان سے ادا نہیں ہو سکتے۔ قوت متخیلہ یہاں اپنا پورا فعل کرتی ہے۔ اس عالیشان عمارت کا ہر حصہ تاریخ کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ اور اسکی ہر ٹھیکری عبرت کی ایک پُر درد داستاں ہے۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں تھوڑی دیر کے لیے قدیم اسلامی جاہ و جلال کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ فلسفۂ سیاست۔ اور فن حکمرانی کے معرکۃ الآرا مسائل یہاں حل ہو جاتے ہیں اور دنیا میں غالباً یہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر مذہب کے لوگوں کو جذبۂ عقیدت کھینچ لاتا ہے۔ اور اُن کو اس مقدس خوابگاہ پر ارادت کے پھول چڑھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

آہ اکبر اعظم، تیری یہ بیکسی کا عالم ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ ایک دن تیرا شوکت و فر بنی آدم کے دلوں کو ہلا دیتا تھا۔ تیرے انبوہِ خدم و حشم کے لیے بساط زمین تنگ تھی۔ تیرے جلوہ گاہ کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔ لیکن آج تو اس سُنسان وحشت انگیز کھنڈر میں پڑا ہوا ہے جہاں ایک ہُو کا عالم ہے۔ جانورانِ صحرائی اور حشرات الارض تیرے ہمسایہ ہیں۔ ہائے وہ آج تیرے نورتن کے ممبر کہاں۔ ابوالفضل کے عالمانہ مباحث۔ فیضی کے شاعرانہ لطیفے۔ بیربل کے پھڑکا دینے والے چٹکلے کہاں۔ تیرے شاہی ساز و سامان میں، ایک ٹین کی لالٹین ہے۔ جو تیری مونس و رفیق ہے۔ اور وہ تیرے سرہانے آٹھ آٹھ آنسو رو کر تجھے انقلاب زمانہ کی داستانیں سُناتی ہے۔ لیکن صرصرِ غم اُسے بھی خاموش کیا چاہتی ہے۔

تیرے اس محلسرا ے میں کوئی درباں نہیں۔ البتہ وحشت لوگوں کو یہاں آنے سے روکتی ہے
تیرے قدیم رعب و داب۔ جاہ و حشم کی جگہ عبرت نے لی ہے، جسکا یہاں کے ہر ہر حرف
پر عمل ہے۔ وہ تیرے زائرین کے دل پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہے۔ ممکن نہیں کہ تیرے آستانہ پر
کوئی بغیر دل تھامے چلا آئے۔ تیرے شوکت و فر کا وہ پہلا سا خوف تو طاری نہیں ہوتا۔
لیکن خدا جانے دل کی کیا حالت ہو جاتی ہے کہ ہوش حواس بجا نہیں رہتے۔

اکبر اعظم! تجھے اس سرائے فانی کو چھوڑے ہوئے ایک زمانہ ممتد گذرا۔ گو
فطرت کا دستور العمل وہی ہے۔ اسی طرح بہار و خزاں کے چمن عالم میں دور ہوتے ہیں۔ آسمان
پر کالی کالی گھٹائیں اب بھی اٹھتی ہیں۔ لیل و نہار کی وہی گردشیں ہیں۔ آسمان و زمین
کے وہی مناظر ابتک ہیں جو پہلے تھے۔ تاہم تغیرات عالم جو اس اثنا میں ہوئے ہیں شمار
میں نہیں آسکتے۔ گو بنی آدم کا نظام جسم وہی ہے جو پہلے تھا۔ وہی قوتیں اب بھی ہیں جو پہلے
ودیعت کی گئیں تھیں۔ مگر اب اُن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سوشیل اور دماغی ترقیوں
نے ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ یہاں تک کہ اگر تو، یا تیرے ہمعصر آج اُٹھیں
تو اس سرزمین اور اسکے باشندوں کو مشکل سے پہچان سکیں گے۔ مگر باینہمہ کیا یہ امر
حیرت انگیز نہیں ہے کہ تیری وقعت و عزت اہل الرائے کے نزدیک ابتک وہی ہے جو پہلے
تھی۔ بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔ تیری تیغ سیاست کا تمام دنیا آج لوہا مانے ہوئے ہے۔
تیرے طرز حکمرانی نے آج یورپ کو اپنا خوشہ چیں بنالیا ہے۔ تیری بہادری اور جرأت کے
لوگوں کے دلوں پر سکے جمے ہوئے ہیں۔ ہندو تجکو ایک دیوتا مانتے ہیں۔ تیرے درشن
کے ابتک مشتاق ہیں۔ تیرے عرس میں ایک بھی میلا کرتے ہیں۔ مسلمان تجھپر فخر و
مباہات کرتے ہیں اور تجھے ہندوستان کے ایوان اسلام کا بانی کہتے ہیں۔ انگریز
تجھے ہند کا سولن تسلیم کرتے ہیں۔ تیری زیارت کو کالے کوسوں سے آتے ہیں۔ اور تیرے
آستانۂ مقدس پر سر نیاز جھکا کر تیرے عظمت و جلال کا کلمہ پڑھتے ہیں۔

اکبر اعظم! تیرا مدفن ہم کو ایک اور مفید سبق دیتا ہے، جو لوح دل پر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اور وہ دنیا کی بے ثباتی ہے۔ اس عالیشان عمارت پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے الا کل شئ ما خلا اللہ باطل - یہ ہر ایک سے بزبان حال کہتی ہے کہ یہ دنیا سرا سے چند روزہ ہے۔ اس سے دل لگانا حماقت ہے اور اسپر اعتبار کرنا نادانی طوق فنا ہر ایک کے گردن میں ڈالا جائیگا۔ اور زمانہ کی گردش ہر متنفس کو درپیش ہے۔ جاہ و شوکت کا فطرت پر کچھ رعب نہیں جم سکتا۔ اور دولت وحشمت کسی کو اس قانون قدرت سے مستثنے نہیں کرا سکتے۔ بڑے بڑے شاہنشاہان عالم تیر اجل کا نشانہ بن گئے۔ اور بڑے بڑے شاہ و حکما پیوند زمین ہو گئے۔ کیسے کیسے پیشوایان دین و دنیا فنا ہو گئے۔ کیا کیا مہ جبین خاک میں مل گئے۔ ہائے۔ غالب

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

آگرہ سے جو قدیم سڑک دہلی کو گئی ہے اُسپر اگر تم چلو تو تھوڑے فاصلہ پر تم کو ایک عالیشان دروازہ نظر آئیگا جو دہلی دروازہ کے نام سے اب تک مشہور ہے جس میں سے زمانہ قدیم میں شاہان اجل نہایت تزک و احتشام کے ساتھ دہلی کو جاتے تھے۔ وہ تم کو اپنی قدامت کی تاریخ سنائیگا۔ اور اپنے معزز مہمانوں کی مفارقت کا راگ سنائیگا جسکا ایک ایک لفظ تیر و نشتر اور جس کی رام کہانی نہایت دلدوز ہوگی۔ اس سے گذر کر ایک گورستان قدیم نظر آئیگا جس میں بہت سے معاصرین اکبر محو خواب ہیں۔ اس سے کچھ فاصلہ پر فیضی اور ابوالفضل کا عبرت انگیز کھنڈر دکھائی دیگا۔ جسکو دیکھکر ممکن نہیں کہ تم دل پکڑ کر نہ بیٹھ جاؤ۔ اسکے بعد تم کو وہ مقدس عالیشان عمارت نظر پڑے گی جسکے حالات ہم اسوقت لکھنا چاہتے ہیں۔

یہ مقبرہ نہایت مرتفع اور بلند ہے۔ اور مقام سکندرہ میں واقع ہے جو پہلے باغ بہشت آباد کے نام سے مشہور تھا۔ یہ عمارت رفعت اور خوبصورتی میں اپنے

رنگِ خاص میں بے مثل ہے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اسکا پلان خود اکبر اعظم کا نتیجۂ طبع ہے
سکے متعلق ایک جرمن سیاح لکھتا ہے۔ کہ جس طرح اکبر اپنے معاصرین میں بے مثل تھا
اُسی طرح پر اُسکا مدفن تمام دنیا کے مقابر میں بے مثل ہے۔

یہ حیرت انگیز عمارت ایک وسیع باغ میں واقع ہے، جو تقریباً ایک میل مربع ہے
یہ سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے۔ بعض حصے سنگ مرمر کے ہیں۔ اسکا پھاٹک نہایت
شاندار ہے جسکے گنبد آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ پُرانے لوگ کہتے ہیں کہ پہلے زمانہ
میں یہ اسقدر بلند تھا کہ جب اس پر روشنی ہوتی تھی تو دہلی سے دکھائی دیتی تھی۔
۱۷۶۴ء میں جاٹوں نے اسکو منہدم کرادیا۔ اس پھاٹک پر ایک نقار خانہ تھا جس پر
صبح و شام نوبت بجا کرتی تھی۔ اور کرنا۔ نفیری اور سرنا کی دلکش آوازوں سے
تمام قرب و جوار گونج اُٹھتا تھا۔ اسکے قریب قرآن خوانوں کے قیام کے لیے کمرے
بنے ہوئے تھے۔

پھاٹک کے اندر جو دالان ہے اسمیں اشعار ذیل کندہ ہیں۔

بہ فرمان شاہنشہ ذو الجلال	کہ باشد شہنشاہیش بے زوال
شد آراستہ آں چناں روزگار	کہ حیراں شد اندیشۂ روزگار
بہ گیتی ز فیض ازل بادشاہ	بود سایۂ نور ذاتِ الٰہ
چو از دہر آں سایہ گردد نہاں	فتد سایۂ دیگر اندر جہاں
بدنیا بود تا سر انجام کار	بنزد خرد گردش روزگار
زمانہ دگرگوں شود ہر نفس	نہ گردد بیک گونہ با ہیچکس
فلک رتبہ شاہ اکبر عرش گاہ	کہ از ہیبتش کوہ گشتے چو کاہ
نشستے چو بر تخت شاہنشہی	گرفتے جہاں فتر ظل الٰہی
فروزندۂ افسر و تخت بود	کریم و رحیم و جواں بخت بود

دل روشن و جان آگاہ داشت | جہاں خورد و داد و گرفت و گذاشت
بباغ جہاں تخم نیکی بکشت | براں ہم گرفت و ریاض بہشت
روانش چو انوار خورشید و ماہ | فروزندہ باد از نور الہ

پھاٹک کے جنوبی دروازہ پر اشعار ذیل لکھے ہوئے ہیں۔

مرحبا خورم فضاے خوشتر از باغ بہشت | مرحبا عالی بناے برتر از عرش برین
جنتی او را ہزاراں روضۂ رضواں غلام | روضۂ او را ہزاراں جنت الماوی زمین
کلک معمار قضا بنوشت بر درگاہ او | ھذہ جنت عدن فادخلوہا خالدین

کتبہ عبد الحق شیرازی ۱۰۲۲ھ

ایک جگہ یہ اشعار کندہ ہیں۔

شاہ اکبر ز روے دانائی | گر نظا ہر ز دہر فانی رفت
دولتش بے زوال بود ازاں | دل بدنیاے بازوال نبست
مرغ روحش چو بود طائر عرش | رفت و بر آشیان خویش نشست

دوام ملک بقاے قدیم کس را نیست

خداے راست بقاے قدیم و ملک دوام

شاہنشاہ کی تاریخ وفات کے اشعار بھی اسی طرف ایک جگہ لکھے ہوئے ہیں۔

طاقیکہ از رواق نہم چرخ برتر است | روشن ز سایہ اش رخ تابندہ اختر است
ایں طاق زیب فلک ہفت کشور است | از روضۂ منورۂ شاہ اکبر است

تاریخ دوازدہم جمادی الآخر سنہ ہزار و چہاردہ ہجری۔

اس پھاٹک سے نکلکر ایک وسیع باغ نظر آتا ہے جسکے وسط میں مقبرہ کی عالیشان عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ جو ۴۰۰ فیٹ مربع سنگ مرمر کے چبوترہ پر قائم ہے۔ یہ عمارت نہایت شاندار اور پنج منزلہ ہے۔ چبوترہ سے ایک ڈھلواں راستہ

مزار کو گیا ہے۔ جو ایک وسیع اور تاریک کمرے میں واقع ہے اور وہ ۳۰ فیٹ بلند ہے۔
اور ہر ایک جانب ۳۶ فیٹ ہے۔ لوح مزار سادہ اور بہت شاندار ہے۔ کمرے کی دیوار پر زریں کام کیا ہوا ہے۔ اس پر ایک بیش قیمت چادر پڑی رہتی تھی۔ جو لارڈ نارتھ بروک کی عقیدت کا نتیجہ تھی۔ اس کی تیاری میں آٹھ ہزار روپیہ صرف ہوئے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ چوروں کے تصرف میں آگئی۔

قبر کے پاس ایک مقام ہے جہاں حسب وصیت اکبر اُس کی تصنیفات اسلحہ اور گرانبہا جواہر جنکو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا دفن کیے گئے تھے۔ لیکن بھرت پور کے جاٹ جنہوں نے گزشتہ صدی میں آگرہ پر قبضہ کرلیا تھا سب کچھ نکال لے گئے سُنا جاتا ہے کہ اُس کی بعض چیزیں ریاست مذکور میں ابتک باقی ہیں۔ مزار کے اوپر جو روشندان ہے اُس میں ایک بیش قیمت ہیرا جڑا ہوا تھا وہ بھی دستبرد زمانہ کے وقف ہوا سب سے اوپر کی منزل غیر مسقف ہے۔ اور بالکل سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ اُسپر سے تمام شہر کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ شمال و جنوب کی طرف جمنا اور خوبصورت تاج نظر آتے ہیں۔ مسٹر ہُیلر یہاں متاثر ہو کر لکھتا ہے کہ "مجکو یہاں آنے سے غرناطہ کا محل الحمرا یاد آگیا۔ نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ میں عالم خواب میں ہوں"۔

یہاں پر بادشاہ کی ایک نقلی قبر بنی ہوئی ہے جو خالص سنگ مرمر کی ہے اور اسپر پچیکاری کا کام کیا ہوا ہے اور اُسپر خدا کے ۹۹ نام عربی میں کندہ ہیں سرہانے کی طرف اللہ اکبر لکھا ہوا ہے اور دوسری طرف جل جلالہ کندہ ہے۔ جو اکبر کے مذہب الٰہی کو یاد دلاتا ہے۔
اُس کی چار دیواری پر یہ نظم لکھی ہوئی ہے۔

بنام شہنشاہِ ملک قدم	کہ ذاتش مبرا بود از عدم
ہمہ بادشاہاں روے زمیں	از و صاحب تاج و تخت و نگیں
کند از عدم آشکارا وجود	بود ذات او مظہر عدل و جود

ز لطفش که دمه طلبگار کام	بود درگهش قبلهٔ خاص و عام
نگارندهٔ جوهر آب و خاک	طرازندهٔ گوهر جان پاک
دو عالم ز فیض ازل آفرید	یکی کرد پنهان و دیگر پدید
بنجشید آنگه سرای سپنج	به شاهان با افسر و تاج و گنج
که از عدل ایشان شود روزگار	شگفته تر از باغ در نوبهار
ره داوری را چو گیرند پیش	شناسند بیگانه را همچو خویش
شهی کو چنین زیست در روزگار	بود سایهٔ ذات پروردگار
ز نه صد فزون بود شصت و دو سال	که شاه اکبر آن سایهٔ ذو الجلال
به بالای زرینه مسند نشست	بر تخت او گشت افلاک پست
جهان را بیاراستا ز عدل و داد	دل اهل عالم از و گشت شاد
بر پایهٔ تختش از هر گروه	شده جمع مردان صاحب شکوه
به مهر ار فگندی نظر سوی خاک	به گوهر شدی بهتر از جان پاک
گرفتی بیک حمله ملکی برزم	بایمای ابرو بدادی به بزم
چو لطف خدا لطف او عام بود	بهر کار چشمش به انجام بود
بدرگاه او هر که بردی پناه	چو اندیشه رفتی ز ماهی بماه
چنان پر شد آوازه اش در جهان	که در دل نگنجید راز نهان
بپرداخت آن گونه روی زمین	که گر کرد آفرینش جهان آفرین
به گیتی در افزون ز پنجاه سال	چنین کرد شاهی ندهٔ جلال
چو از عدل آباد کرد این جهان	سوی آنجهان رفت روشن روان
شه هفت کشور ازین پیش بود	کنون هفت جنت مسخر نمود
بنزد خردمند هشیار دل	سرائیست این عالم آب و گل

مجو مہر از جوہر نہ سپہر | کہ با کس بہ پایاں نہ بردست مہر
سپہرست بر کینہ مہرش مدار | کہ با کینہ در مہر ناید بکار
جہاں ست مانند موج بر آب | ازاں تشنہ دل کے شود کامیاب
بہ بست ست پیماں بہ کس روزگار | کہ نشکست آں را بہ ہنگام کار
نہ ماند بہ گیتی کسے جاوداں | ز دستِ اجل کس نبردست جاں
چہ خوش گفت آں کامل نکتہ سنج | کہ از گوہر دانش اندوخت گنج
جہاں اے برادر نماند بکس | دل اندر جہاں آفریں بند و بس
شد از عدل شاہ اکبر کامگار | بسان بہشت بریں روزگار
جہاں گشت خرم بدورانِ او | زمین و زماں شد بفرمانِ او
دمے دہر بے مہر پیماں گسل | زکیں مہر او کرد بیروں ز دل
ز تاثیر بے مہری ایں جہاں | رواں شد سوی عالم جاوداں

روانش ہمیشہ ز حق شاد باد
ازو عالم قدس آباد باد

اگرچہ اس عمارت کی بنیاد عہد اکبر ہی میں ڈالی گئی تھی۔ لیکن جہانگیر کے زمانہ میں اتمام کو پہونچی۔ جہانگیر اپنے تزک میں اسکے متعلق لکھتا ہی۔

دو شنبہ ۱۷۔ جمادی الثانی کو میں پاپیادہ عرش آشیانی کے مقبرے کو بغرض زیارت روانہ ہوا۔ اگر ممکن ہوتا تو میں اس رستہ کو سر اور آنکھوں سے طے کرتا۔ میرے پدر بزرگوار نے جب میری ولادت کی منت پوری کرنے کے لیے پاپیادہ اجمیر شریف تک قدم رنجہ کیا تو یہ میرے لیے کوئی حیرت انگیز بات نہ تھی جو میں اس فاصلہ کو سر و چشم سے طے کرتا۔ روضہ مبارک کی زیارت پر مجکو خیال ہوا کہ یہ عمارت میری خواہش کے مطابق تعمیر نہیں ہوئی۔ کیونکہ میری آرزو تھی کہ یہ مقبرہ ایسا ہوتا کہ دنیا

میں اس کی نظیر نہ ہو سکتی۔ لیکن افسوس ہو کہ جب یہ عمارت زیر تعمیر تھی خسرو نے علم بغاوت بلند کیا۔ اور مجکو مجبوراً لاہور کا سفر کرنا پڑا۔ اسلیے معماروں نے اسکی تعمیر میں بہت کچھ اپنی رائے کو دخل دیا۔ اور تین چار سال میں تمام روپیے جو اسکے لیے منظور ہوئے تھے صرف کرڈالے۔

اس مقبرہ کی تعمیر میں ۴۵ لاکھ خانی صرف ہوئے تھے جو سکہ رائج الوقت کے مطابق ۱۵ لاکھ روپیے ہوتے ہیں۔

اس مقبرے کے چاروں طرف کمرے ہیں جس میں شاہی خاندان کے لوگ مدفون ہیں۔ اکبر اعظم کے مزار کے مشرقی کرہ میں اُس کی نامور بیٹی آرام بانو کی قبر ہے جس پر آیۃ الکرسی اور اُسکا نام لکھا ہوا ہے۔ مزار کے مغربی کمرہ میں اُس کی دوسری بیٹی شکر النسا کی خوبصورت خوابگاہ ہے جسپر اُسکا نام پاک کندہ ہے۔ اُسی کے قریب میں ایک اور قبر ہے جو مسٹر بیل کی تحقیق میں رقیہ سلطانہ بیگم کی ہے۔ اس قبر کے مشرق میں صاحب عالم سلیماں شکوہ کی قبر ہے جو بادشاہ شاہ عالم کے بیٹے تھے۔ جنہوں نے ۱۲۵۳ھ میں آگرہ میں وفات پائی۔ لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے۔

اللہ و محمد و علی فاطمہ حسن و حسین

چو فرمود رحلت سلیماں شکوہ — زدار الفنا سوئے ملک بقا

بسال دو صد الف وپنجاہ و سہ — بذیقعد بست و نہم زیں سرا

دراں دم زہاتف ندا ایں رسید — بگو کرد برشاہ رحمت خدا

لوح منور مرشد زادہ آفاق مرزا سلیماں شکوہ ابن محمد شاہ عالم بادشاہ غازی۔

یہ سلیماں شکوہ وہی ہیں جو دہلی سے مفرور ہوکر، مدتوں بعہد نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں رہے تھے۔ اور اپنی ایک بیٹی کی شادی بھی بادشاہ سے کردی تھی۔ لیکن آخر میں ایک طوائف کے متعلق اُن میں اور بادشاہ میں رقیبانہ تعلقات پیدا ہو گئے

تھے جو آخر ترک لکھنؤ کا باعث ہوے۔ لکھنؤ کی مفارقت کے بعد اپنے قدیم خزاں رسیدہ چمن (دہلی) کو پھر دیکھنا گوارا نہ کر سکے اور کچھ دنوں تک آگرہ ہی میں گوشہ عافیت اختیار کیا تھا۔ لیکن افسوس مذہبی جھگڑوں نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا۔

شاہزادہ سلیماں شکوہ بہت بڑے شاعر تھے۔ اُنھوں نے اپنی یادگار میں ایک دیوان چھوڑا ہے جسکا ہر شعر تیر و نشتر ہے۔ اُن کا مکان شعراے زمانہ کا ماوی و ملجا تھا۔ سودا۔ انشا۔ جرأت۔ مصحفی وغیرہ کے مدتوں تک وہ سرپرست و قدرداں رہے۔ اُنھیں کی وجہ سے کچھ دنوں تک لکھنؤ مرکز اہل کمال بن گیا تھا۔ اُردو شاعری اُن کی شرمندۂ احساں ہے۔ افسوس اُنکے بعد اس مجموعہ کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور اُس شمع کے خاموش ہوتے ہی بزم سخن میں اندھیرا چھا گیا۔ احباب ایک ایک کر کے اُٹھ گئے۔ اور ایوان سخن میں چند پروانوں کے ڈھیر کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

محبوب الرحمٰن کلیم بی۔ اے

آثار اکبری

یعنی فتح پور سیکری کی دلچسپ تاریخ جسمیں فتحپور اور سیکری اور دیگر مقامات ملحقہ قصبہ روپ بانس خانواں۔ چرباری۔ مڈھاکر وغیرہ کی مفصل تاریخ اور وہاں کی قدیم عمارات کی تفصیلوار حالات اور پیمائش کے علاوہ ضمیمہ میں حضرت شیخ الاسلام شیخ سلیم چشتی اور نواب اسلام خاں چشتی۔ نواب قطب الدین خاں کوکلتاش نواب محتشم خاں۔ نواب مکرم خاں۔ نواب ابراہیم خاں وغیرہ کے حالات بھی مندرج ہیں مؤلفہ جناب محمد سعید احمد صاحب مارہروی مؤلف حیات خسرو و امراے ہنود و آثار خیر وغیرہ۔ قیمت فی جلد عــہ/ مولف سے اس پتہ پر مل سکتی ہے۔

سعید احمد اہلمد کلکٹری آگرہ

انتخاب بیاض حسرت

علامہ شبلی نعمانی

غمزہ اش تازہ کند رسم جفاکوشی را	جلوہ یادت دہد از خویش فراموشی را
می باندازہ زدن گرہ ورسمی ست قدیم	طرح نو در فگن آئین قدح نوشی را
امن فدا بت شوخی کہ بہنگام وصال	بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را
بنگر دستگہ حسن کہ آن نرگس مست	بہم آمیختہ ہشیاری و مدہوشی را
شبلی نامہ سیہ گرچہ سراپا گنہ ہست	بس بود دامن عفو تو گنہ پوشی را

انتخاب رسالہ مالوہ جاورہ

آخر کو عشق کفر سے ایمان ہو گیا	داغ	میں بت پرستیوں سے مسلمان ہو گیا
ہر طرح دلنشیں ترا پیکان ہو گیا	[illegible]	غم بن گیا کبھی کبھی ارمان ہو گیا
قربانیوں میں پہلے مجھی پر چھری پھری		میں اس ادائے ناز پہ قربان ہو گیا
وعدے کی شب خوشی سے نہیں فرصت وصال	شرف	دشوار ہو گیا ہے جو آسان ہو گیا
بزم عدو میں نام ترا کیا پڑا مجھے	"	ایک شخص جان بوجھ کے انجان بن گیا
خون وفا کو خاک میں ملنا نصیب ہو	[illegible]	یہ کیا غضب ہوا وہ پشیمان ہو گیا
نقص حبیب میں بھی ادائے کمال ہے		وہ بیوفا ہوا تو مری جان ہو گیا
لو اے بتو سنو کہ وہ داغ صنم پرست	داغ	مسجد میں جا کے آج مسلمان ہو گیا

کلام تعشق مرحوم لکھنوی ماخوذ از رسالہ معیار

کیا تصور ہے کہ ہوں ہر وقت ہم پہلوئے دوست		ہر گل داغ جگر سے آ رہی ہے بوئے دوست
خون ناحق کا عوض آخر ہوا کس حسن سے		نام سے تعویذ کے باندھے گئے بازوئے دوست
وائے حسرت کس طرح وہ قتل کرتے ہیں مجھے		غیر چہرے سے ہٹاتے جاتے ہیں گیسوئے دوست
اے تعشق اب سر شوریدہ ہے اور سنگ ہے	فقط	وصل کے ایام میں تھی عادت زانوئے دوست

ایک خط ایسے مصنف کے نام جو سخت دماغی محنت کا عادی تھا

(ترجمہ از پی جی ہیمرٹن)

ہم کو نظام اعصاب کے فعل کی نسبت اسقدر کم معلومات ہو کہ اُس مضمون میں طب کی رو سے بحث کرنے میں بہت مشکل تحقیقات کی ضرورت پڑیگی جو ایک غیر سائنس داں شخص کی قابلیت سے باہر ہے۔ اسیلیے آپ مجھے یہ عرض کرنیکی اجازت دیں کہ طبی اُمور کو آپ ماہرین فن کی تصانیف سے دریافت کریں۔

اور میں آپ سے صرف وہ چند امور بیان کر دوں جو دماغی کام کرنے والوں کے تجربوں سے متعلق ہیں اور جو اُس شخص کے لیے بکار آمد ہیں جسکو سخت اور مسلسل دماغی محنت سے سابقہ رہتا ہی۔

چند سال کا عرصہ ہوا کہ لندن کی ایک انجمن میں یہ مضمون پڑھا گیا تھا کہ بالکل صحیح اور تندرست آدمی کو دماغی محنت سے ہرگز نقصان نہیں پہونچتا۔ اور یہ جو اکثر خرابی صحت کی مثالیں پیدا ہوتی ہیں جنکو لوگ عام طور سے دماغی کام کی زیادتی سے منسوب کر دیتے ہیں۔ ان کی وجہ اصل میں کسی سابقہ علالت کی تحریک ہوتی ہی۔

یہ ایک ایسا دعویٰ ہے کہ جسکا جواب ایک فقرہ میں ادا نہیں ہو سکتا۔ انتہا سے اختصار پر بھی یہ کہنا پڑتا ہی کہ دماغی محنت علالت کا باعث نہیں ہو سکتی۔ البتہ جو بیماری پہلے سے موجود ہو اُس میں اسکی وجہ سے ترقی ہو جانا ممکن ہی اور اسکا اندازہ کرنا مشکل ہی۔ کیونکہ جب تک صحت بالکل درست رہتی ہی اسوقت تک دماغ سے کام لیا جاے یا نہ لیا جاے وہ بہرحال درست رہیگی۔ اور جب صحت میں فرق ظاہر ہوتا ہے اُسوقت اسکا فیصلہ کرنا آسان نہیں ہوتا کہ خرابی صحت کے اسباب میں دماغی محنت کا حصہ کہاں تک ہے۔ اسکے علاوہ ایسے عام دعوی کی صداقت کے ثبوت میں کچھ

مثالیں بھی نہیں پیش کیجاتیں۔ کیونکہ یہ بالاتفاق مسلم ہے کہ علالت کا باعث صرف دماغی کام نہیں ہوتا۔ چنانچہ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ علالت کے بہت سے اسباب میں سے دماغی محنت اوروں سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔

جب ورڈس ورتھ (شاعر) دہایٹ ڈوآف رائی لسٹن کی تصنیف میں مصروف تھا تو اُس کی ٹانگ میں ایک زخم آگیا اُسکو خیال ہوا کہ اسوقت اس علمی شغل کو جاری رکھنے سے زخم کی شدت کو ترقی ہوگی اور اس کام کے ملتوی کردینے سے تخفیف ہوگی چنانچہ اُسنے ایسا ہی کیا۔ اور دماغی کام کے بند ہوجانے سے کامل صحت حاصل ہوگئی۔ اسی موقع پر جہاں اُسنے یہ واقعہ بیان کیا ہے وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ شاعری کے ہیجان اور اُسکے ساتھ نظم کرنے کی طویل محنت سے ہمیشہ صحت میں کم و بیش فتور آگیا۔ مگر اس شاعر نے اپنے عادات و حرکات زندگی بھر ایسے قائم رکھے جس سے اُنکو کوئی دوامی مضرت نہ پہونچ سکی۔

موجودہ مصنفین میں سے ایک نہایت قابل شخص کی حالت یہ دیکھی ہے کہ وہ اپنی ہر تصنیف کے اختتام پر مرنے کے قریب پہنچتا ہے۔ ایک اور مصنف ہے کہ یوم السبت کو کام نہ کرنے کی وجہ سے اُن کی طبیعت ناساز رہتی ہے۔ اور ہفتہ میں ایک روز کی بیکاری بھی اُس کو گراں گزرتی ہے۔

ورڈس ورتھ کی نسبت یہ خیال ہے کہ اُسکے قویٰ بہت درست تھے اور اسّی برس کی عمر تک بھی وہ نہایت ہی صحیح اور تندرست رہا۔

باقی جو دو مثالیں دی گئیں اُن کی صحت کے بارے میں صحیح طور سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تاہم یہ دونوں مصنف اس زمانہ میں تندرست نظر آتے ہیں جب وہ کچھ عرصہ کے لیے دماغی اشغال سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں۔ ایک پارسی صاحب کہ بہت توانا و تندرست ہیں اور وقتاً فوقتاً علمی کام بھی اچھی طرح کرلیا کرتے ہیں۔ اُنھوں نے ایک بار

مجھ سے فرمایا کہ مینے جب کبھی علمی اشغال کو قید و ضبط کے ساتھ کرنا چاہا تو مجھے اعصابی اشتعال سے تکلیف ہونے لگی لیکن بے ترتیبی سے کام کرنے میں کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایک سوداگر جسکو اپنے کاروبار میں مستعدی کی بہت ضرورت پڑتی ہو اُسنے مجھ سے بیان کیا کہ معمولی اشغال کے علاوہ جب مینے کسی غیر زبان کو حاصل کرنے کی کوشش کی جسے میں نے اپنے لیے مفید سمجھا تو میرے دماغ میں خرابی کے آثار ایسے خطرناک پیدا ہوے کہ مجھے ہر بار اُس ارادہ سے باز آنا پڑا۔ یہ شخص اگرچہ بے انتہا توانا و چست ہو لیکن تحصیل زبان غیر کے زمانے میں اُسکے ہاضمہ میں فتور واقع ہوجاتا ہو۔ مگر جب سے اُس نے نئی زبانوں کا سیکھنا ترک کردیا اُسوقت سے دماغی علالت کے آثار بھی غائب ہو گئے۔

میں نے لندن کے دو شخصوں کو دیکھا جنکا پیشہ علمی شغل تھا اور دونوں بے انتہا محنت کرتے تھے وہ دونوں دماغی امراض میں گرفتار ہوے۔ بعد صحت ایک نے عہد کرلیا کہ آیندہ حد اعتدال سے زیادہ کبھی کام نہ کرونگا وہ شخص روشن اور صحیح دماغ کے ساتھ اب تک زندہ ہو۔ دوسرا شخص بعد صحت پھر ویسی ہی محنت کرنے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ مغز کے تحلیل ہوجانے سے دو برس بعد مرگیا۔

جہانتک میرا خیال ہو مذکورۂ بالا مثالوں میں جتنی بیماریاں پیدا ہوئیں سب کا باعث قوائے دماغی پر بے انتہا زور کا پڑنا ہوا ہو۔ سر والٹر اسکاٹ کی صحت کی نسبت اُنھیں کی شہادت سے معلوم ہوا ہو کہ وہ غیر معمولی طور پر توانا اور تندرست تھے اور وہ جوان کو لقوہ ہوگیا تھا اسکی وجہ جہانتک خیال کیا یہ معلوم ہوئی کہ اُنھوں نے مالی تکالیف میں پڑکر محنت بہت کی۔ اگر اُن کو اسقدر دماغی محنت اور تردد نہ کرنا پڑتا تو اُن کی صحت بہت روز تک درست رہتی۔ بائرن کی موت میں اُسکے حرکاتِ اوباشانہ اور ہیجان شاعری دونوں کو دخل ہو۔ تاہم گمان غالب یہ ہو کہ

اگران دونوں وجوہ کا اثر ایک ساتھ نہ پڑتا تو ایک کا صدمہ وہ برداشت کرسکتا تھا اس کے حرکات یوں ہی مضر صحت تھے اُسپر ہر وقت کے ہیجان تخیل اور نظم اشعار کی محنت شاقہ نے پہیے سبب کے صدمہ کو اسقدر بڑہا دیا کہ اُس سے وہ جانبر نہو سکا۔
اسکاٹ کو دیکھیے کہ شعر کہنا اسکے لیے بہت آسان تھا مگر اُس نے جوشش فکر کا خوف کیا اور شعر و شاعری سے کنارہ کش ہو گیا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ سوودے کا دماغ بھی اخیر میں افکار سخن کا متحمل نہیں رہا تھا۔
اگرچہ بعض حالتوں میں صحیح طور سے یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہی کہ جس شخص کی صحت جسمانی آخر میں کثرت کار سے خراب ہو گئی ہو وہ ابتدا میں بھی تندرست تھا یا نہیں؟ اور اگرچہ یہ بات ظاہر ہی کہ بساا وقات آخر میں ایسے امراض پیدا ہو جاتے ہیں جنکو دماغی کام سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ تاہم واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ قوائے دماغی سے بے انتہا کام لینا صحتِ جسمانی کے حق میں مضر ہی۔ اور یہ کہ تمام دماغی محنت کا دار و مدار صحتِ جسمانی پر ہی۔ اس اُصول کے خلاف کوئی شخص محفوظ نہیں رہ سکتا نہ یہ ممکن ہی کہ وہ علائق جسمانی سے قطع تعلق کرکے بالکل روح سے کام لے۔
اس مضمون کے دوسرے خط میں دماغی کام اور جسم و دماغ کی حالت میں جو قریبی رشتہ ہی وہ ثابت کیا گیا ہی۔ اور وہ مضمون کسی طبیب کی سند سے نہیں لکھا گیا ہی بلکہ دماغی اشغال والوں کے تجربات سے ماخوذ ہی۔ فقط

ہندوستانی ریاستوں کی بابت برٹش گورنمنٹ کی پالیسی

ایک پولیٹیکل افسر کا حیرت انگیز بیان

گزشتہ فروری میں لفٹنٹ کرنل سر ڈونلڈ رابرٹسن کے۔سی۔ایس۔آئی۔ نے

رائل کلونیل انسٹیٹیوٹ کے ایک جلسہ میں "ہندوستان جدید پر چند خیالات" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا تھا۔ اُسکے ایک فقرہ سے اُس پالسی کا اظہار ہوتا ہے جو انگریزی حکومت نے ہندوستان کی پولیٹکل آزادی کے باب میں قائم کر رکھی ہے اور وہ اُن تمام لوگوں کے لیے غور طلب ہی جو اس ملک کی آزادی کے مسئلے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ فقرہ یہ ہی کہ "دیسی ریاستوں میں حکومت دستوری کا کسی عنوان سے قرار پانا مناسب نہیں ہی کیونکہ ہر رئیس بذاتِ خود سرکار انگریزی کو خوبی انتظام کا جوابدہ ہی اور اس ذمہ داری میں وہ اپنی رعایا کو نہیں شریک کر سکتا۔"

ہم نے اپنے پرچہ ماہِ ستمبر میں ہندوستانی ریاستوں کے انتظام دستوری کے متعلق یہ مشورہ دیا تھا کہ ہندوستانی رؤسا اور اُن کی رعایا کا سب سے بڑا فائدہ اسی میں ہی کہ رؤسا اپنی اپنی رعایا کے لیے وہی طرز حکومت قائم کر دیں جو اسوقت انگلستان میں رائج ہی۔

ہم سر ڈونلڈ رابرٹسن سے ۱۸۸۵ء سے واقفیت رکھتے ہیں جبکہ وہ ایجنٹ وسط ہند کے نائب درجہ اول تھے۔ اور گو وہ ہم لوگوں سے موافقانہ برتاؤ رکھتے تھے تاہم پولیٹکل صیغے کا جو تجربہ ہم کو مدت دراز میں ہوا ہے اُس سے ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ سلطنتِ ہند کے اس صیغے سے جو انگریز افسر وابستہ ہوں انسے اس بات کی توقع رکھنا بے سود ہے کہ وہ رؤسائے ہند کی آزادی کے موافق کوئی بات تجویز کرینگے۔ اس کے

ثبوت

میں ہم ایک واقعہ اُس ریاست کا بیان کرتے ہیں جہاں ہم دیوان تھے۔ ہوا یہ کہ رئیس کے زمانہ کم سنی میں سرکار انگریزی نے ایک بڑی تنخواہ کے انگریز کو ریاست میں مقرر کر دیا تھا۔ جب رئیس با اختیار ہوا تو اُسنے اپنی رعایا کو لوکل سلف گورنمنٹ

عطا کر دی۔ اُسوقت مقامی کاونسل نے اُس کی تنخواہ میں بذریعہ اتفاق راے کے تخفیف کر دی۔ اسپر ایک اعلیٰ پولٹیکل افسر کی طرف سے رئیس صاحب کی وہ مزاج پرسی کی گئی کہ انکا دل ہی جانتا ہوگا۔

دیسی رؤسا کی خودمختاری سے انگریزونکی ظلرانی میں عانت ہوتی ہے

تمام اینگلو انڈین حضرات عموماً اور پولٹیکل افسر خصوصاً اس بات کے خواہاں نظر آتے ہیں کہ دیسی رؤسا بالکل مطلق العناں رہیں اور انکے ذمہ سواے سرکار انگریزی کے کسی اور کی جوابدہی نہ رہے۔ اسکے صرف تین سبب ممکن ہیں (۱) یہ کہ اس میں رئیس کا نفع ہو یا (۲) اس میں رئیس کی رعایا کا نفع ہو یا (۳) اس میں اُس فریق کا نفع ہو جو رئیس کو اپنی رعایا کے مقابلے میں مطلق العناں رکھنا چاہتا ہے

اب جہانتک ہم دیکھتے ہیں مطلق العنانی میں رؤسا کا کچھ نفع نہیں نظر آتا کیونکہ جو حاکم مطلق العناں ہوگا وہ اپنی رعایا پر جبر ضرور کریگا جس سے رعایا بددل ہوکر اُس سے کسی قسم کی ہمدردی نہ رکھے گی اور یہی یار لوگوں کا مطلب ہے کہ اگر احیاناً سرکار انگریزی اور رئیس کے درمیان کوئی ناچاقی پیدا ہو جاے تو رئیس کو اپنی رعایا کی طرف سے کسی طرح کی تقویت نہ پہنچ سکے۔

دوسرے سبب کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ کوئی ذی ہوش اس امر کو تسلیم نہ کریگا کہ بحالت امن وامان شخصی حکومت سے کسی کو نفع پہونچیگا۔ کس طرح مان لیا جائے کہ ریاستہاے ہند کے چھ ساڑھے چھ کرور باشندے حکومت دستوری سے اختلاف رکھتے ہیں اور محاصل کا جمع خرچ اپنے ہاتھ میں لینا گوارا نہیں کرتے۔ خصوصاً ایسے زمانے میں جبکہ انگریزی علاقوں میں ہر طرف حکومت خود اختیاری کی خواہش پیدا ہوتی جاتی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ دیسی رؤسا کی خود مختاری میں سارا نفع فریق ثالث یعنی انگریزی سلطنت کا ہی۔ اس بیان کی تصدیق میں ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

فرض کیجیے کہ قزاقوں کی ایک باقاعدہ جماعت کسی کمپنی کو لوٹنا چاہتی ہے اور روپیہ اُسکے گھر ہی میں رکھا ہے تو قزاق بے تکلف ساری دولت لیجا سکتے ہیں لیکن اگر اُس کا روپیہ آسامیوں میں پھیلا ہوا ہی تو یہ قزاقوں کے لیے محال ہی کہ وہ اُس کی تمام آسامیوں کے ہاں سے اُسکا روپیہ وصول کرتے پھریں۔ ظاہر ہی کہ اگر اُن قزاقوں سے مشورہ کیا جاے تو اُن کی راے میں اُس کمپنی کی ساری دولت کا گھر ہی میں رہنا مناسب ہوگا۔

اس مثال کے ملاحظہ کے بعد ہر شخص بلا تامل سمجھ سکتا ہی کہ سر ڈونلڈ رابرٹسن وغیرہ کو دیسی ریاستوں کی کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ سے جو اسقدر اختلاف ہی تو کیوں ہے وجہ یہ ہی کہ وہ جانتے ہیں کہ ہماری دال جب ہی تک گلے گی کہ ڈوائیڈ اینڈ گورن کی پالسی کے ساتھ حاکم و رعایا میں سخت کشیدگی قائم رہے۔

رئیسوں کی افسوسناک حالت

جن لوگوں کو ریاستوں کے انتظام سے واقفیت ہی وہ جانتے ہیں کہ تمام ریاستوں میں درحقیقت انگریزی پولیٹکل افسر رئیس کی آڑ میں خود سرانہ حکومت کرتا ہی اور رئیس کا وجود براے نام ہوتا ہی۔

اس بات کے ظاہر کرنیکے لیے کہ رئیسوں کو عام برٹش رعایا کی برابر معمولی حقوق بھی حاصل نہیں ہوتے ہم لارڈ کرزن کے صرف اُس سرکلر کی یاد دہانی کرنا چاہتے ہیں جس میں انھوں نے رؤسا کی تمام اختیاراتِ نقل و حرکت کو محدود کر دیا ہی اور یہ رؤسا کون ہیں جنکو برٹش گورنمنٹ اپنا دوست کہتی ہی۔ ان لوگوں کی حالت اسقدر زار و قابلِ رحم و افسوسناک ہی کہ کوئی خود دار آدمی جسکے دل میں ذرا بھی خود مختاری کی حرارت ہو ہرگز اپنی حالت کو اُن کی حالت سے بدلنا گوارا نہ کریگا۔ ہم بلا مبالغہ کہتے ہیں کہ رؤسا اپنی اس حالت

اندازہ خود بھی کرتے ہیں اور اکثر اوقات اُنکے مُنہ سے نکلجاتا ہے کہ ہم سے تو انگریزی علاقے کا ایک ادنیٰ شخص بھی زیادہ آزاد ہے۔ پس ظاہر ہی کہ کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ کے نہونے سے رؤسا کا فائدہ بالکل نہیں ہی البتہ برٹش گورنمنٹ کو بلا خوفِ پاداش جبر کرنیکا موقع ملجاتا ہی۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ انگریزی علاقوں کو ریاستوں سے واسطہ کیا؟ ہم بلا تامل جواب دیتے ہیں کہ برٹش انڈیا کی ترقی و تنزل ریاستوں کی ترقی و تنزل کے ساتھ وابستہ ہی۔ جب تک سر ڈونلڈ رابرٹسن کے مشورے کیموافق ریاستوں میں شخصی حکومت قائم رہیگی انگریزی علاقے والوں کا تقاضاے سلف گورنمنٹ یہ کہکر ٹال دیا جائیگا کہ پہلے ریاستوں میں اپنے اور ہموطنوں کی ابتری تو دیکھو پھر ہم سے کچھ کہنا۔ ریاستوں کی رعایا کی ابتری میں انگریزونکے دو فائدے نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انگریزی علاقوں کی حالت کو اپنے یہاں سے کسی قدر بہتر دیکھکر اُنھیں انگریزوں کی حفاظت میں آنے کی خواہش ہوتی ہی۔ دوسرے یہ کہ برٹش گورنمنٹ کو اپنی رعایا کے دبانے کی ایک معقول دلیل ہاتھ آجاتی ہی۔

ایک سربرآوردہ امریکن کی رائے

ہی کہ تمام رؤساے ہند کو چاہیے کہ اپنی اپنی ریاست میں مالگذاری جہانتک ممکن ہو کم کردیں۔ تعلیم بے فیس جاری کردیں۔ اور اپنی اپنی رعایا کو وسیع خیالات اور رعائتیں عطا کریں تاکہ انگریزوں کو بھی کچھ عبرت آئے اور وہ بھی اپنی رعایا کے مطالبہ سلف گورنمنٹ کو پورا کرنے پر مجبور ہوں۔"

عہدناموں کی رو سے رؤسا اپنی ریاستونکے مختار جزوکل ہیں

سر ڈونلڈ رابرٹسن ریاستوں میں حکومت دستوری کے قیام سے اس بنا پر اختلاف کرتے ہیں کہ رؤسا کیلیے خوبی انتظام کے باب میں انگریزوں کو جوابدہی لازم

اور اس ذمے داری میں وہ اپنی رعایا کو شریک نہیں کر سکتے۔ ہم کہتے ہیں کہ کیوں شریک نہیں کر سکتے؟

سلطنت انگریزی اور سربرآوردہ ریاستوں میں جو معاہدے ہوئے ہیں آیا انکی رو سے ہر رئیس اپنی ریاست میں مختار کل نہیں ہے۔ اور کیا وہ اپنی ریاست کے اندر جو چاہے نہیں کر سکتا؟ ۱۸۱۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور مہارانا اودیپور کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اُسکی نویں دفعہ یہ ہے۔

"مہارانا اودیپور ہمیشہ اپنے ملک کے خود مختار حاکم رہیں گے۔ اور انکا ملک انگریزی اختیارات کی حد سے باہر رہیگا۔" ایسٹ انڈیا کمپنی اور راؤ کچھ کے معاہدہ ۱۸۱۹ء کی دسویں دفعہ یہ ہے "راؤ اور اُنکے ورثا و جانشین اپنی ریاست کے خود مختار مالک رہینگے اور انگریزوں کے قوانین دیوانی و فوجداری اُن کی ریاست میں نہ جاری کیے جائینگے۔" مہاراجہ ہلکر اندور کے معاہدہ ۱۸۱۸ء کی دسویں دفعہ بھی ملاحظہ ہو کہ "سلطنت انگریزی اس معاہدے کے ذریعے سے اعلان کرتی ہے کہ وہ مہاراجہ کی اولاد۔ اقربا۔ متعلقین خدام یا رعایا سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھے گی۔ اور اس معاملے میں مہاراجہ بالکل خود مختار ہیں۔" اسکے علاوہ ایک اقرار اور بھی کیا گیا تھا جسکے الفاظ یہ ہیں کہ "آنریبل کمپنی کا کوئی عہدہ دار مہاراجہ کی حکومت کے اندرونی معاملات میں کبھی دخل نہ دیگا۔" ہم نے مشتے نمونہ از خروارے صرف تین رئیسوں کی خود مختاری از روے معاہدات ثابت کر دی تاکہ سر ڈونلڈ رابرٹسن کے دعوی کا بطلان ہو جاے اور ہر آزاد خیال و بے غرض شخص دیکھ لے کہ ہندوستانی ریاستوں کے رؤسا اپنی رعایا کو حکومت دستوری عطا کرنے یا محکمہ جات ریاست میں دخیل کرنے کے معاملہ میں بالکل آزاد ہیں اور اگر وہ ایسا کریں تو اُن کی رعایا کے ساتھ انگریزی رعایا کا بھی نفع ہے۔ نیز یہ کہ رؤسا کو سر ڈونلڈ رابرٹسن کے سے

گواںڈین حضرات کے خود غرضانہ خیالات پر ذرا بھی توجہ نہ کرنا چاہیے۔ فقط

شام جی کرشن ورما

دراںڈین سوشیالوجسٹ لنڈن

تنقید

(۱) صوبجاتِ آگرہ و اودھ کی پہلی پروونشل کانفرنس

کا اجلاس ۲۹ - سے ۳۱ - مارچ تک الہ آباد میں منعقد ہوا لیکن کئی وجوہات
سے کامیابی نصیب نہوئی۔ معمولی سبب تو یہی بیان کیا جاتا ہے۔ مرض طاعون کی
مدت نے اضلاع سے آنے والوں کی تعداد بہت کم کر دی لیکن حقیقی باعث
ر پردازانِ کانفرنس کا وہ جابرانہ وخود سرانہ طریق عمل تھا جس کی نسبت سخت ناپسندیدگی
لے اظہار کو ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ بعض لوگوں کے دماغ میں یہ وسوسہ
ا گزیں ہوگیا ہے کہ صوبجات متحدہ کی قایم مقامی کا فخر صرف انکی یا انکے چند ہمخیال احباب کی
ات تک محدود ہوگیا ہے۔ نیز یہ کہ کسی اور کو انسے اختلاف رائے کا نہ حق حاصل ہے
قدرت۔ چنانچہ یہی زعم باطل تھا جسکی بنا پر آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی کی زبان
سے کلکتہ کانگرس کے زمانے میں کئی بار یہ غلط دعویٰ سرزد ہوا کہ صوبجات متحدہ
تعلم تحریک بوائیکاٹ کے خلاف ہیں۔ جہاں اور جتنی مرتبہ یہ دعویٰ کیا گیا وہیں اور
تنے ہی مرتبہ ہمنے زور کے ساتھ اس کی تردید کی لیکن ہمارے آنریبل دوست نے
.وا نہ کی اور یہی سمجھتے رہے کہ "جو میں کرتا ہوں وہی سارے صوبے کی رائے ہے اور اسی کو
نا چاہیے" اسلیے کہ میں اپنے صوبے کا مسلمہ پولیٹکل لیڈر ہوں اور میری رائے
ا پابندی ہر شخص پر فرض ہے۔ افسوس کہ پنڈت صاحب نے زمانہ کی ہوا کو نہ پہچانا
ور یہ نہ دریافت کر سکے کہ لیڈر کی یہ تعریف کہ وہ بالکل خود مختار اور مطلق العنان ہو؟

چند سال پہلے ممکن ہے کہ صحیح مانی جاتی ہو۔ لیکن آجکل جبکہ آزادی کا دور شروع ہو چکا ہو یہ امید کرنا کہ لوگ بے سوچے سمجھے کسی دوسرے شخص کی ذاتی رائے کو اگرچہ وہ لیڈر ہی کیوں نہ سمجھا جاتا ہو صحیح مان لینگے۔ صاحب امید کی سادہ دلی کے سوا اور کسی امر پر دلالت نہیں کرتا۔

الحمد للہ کہ واقعات نے بہت جلد مالوی صاحب کے خیال کو غلط ثابت کر دیا اور اُن کو معلوم ہو گیا کہ مویدین بوائکاٹ کی تعداد ایسی نہیں ہو کہ وہ اُسکو کلکتہ کی طرح ہر موقع پر نظر انداز کر سکیں۔ کیا خوب ہوتا کہ حقیقت حال سے سبق لیکر فریق نرم فریق گرم کے وجود کو تسلیم کرکے بلکہ اُسکو بھی شریک مشورہ کرکے پروونشل کانفرنس کا بندوبست کرتا لیکن افسوس کہ قوت واقتدار کے غرور اور خودسری کے جذبے سے مغلوب ہو کر کارکنان کانفرنس نے پے درپے چند ایسی غلطیاں کیں کہ بعد کو اُنکی تلافی بہت دشوار ہو گئی۔

اول تو یہ ہوا کہ انتظام کانفرنس کے لیے صرف وہی لوگ منتخب ہوئے جو نرم عقائد کے پیرو تھے اور بیرونجات کے احباب میں سے بھی صرف اُن لوگوں سے مشورہ کیا گیا جنسے یہ امید تھی کہ وہ مالوی صاحب کی ہر تجویز پر آمنّا وصدقنا کہنے پر تیار ہونگے۔ نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ پہلی بار رزولیوشنوں کی جو فہرست تیار کی گئی اس میں سودیشی کے متعلق کوئی رزولیوشن نہ تھا۔ بعد کو پبلک کے اعتراضوں سے بچنے کے لیے صرف سودیشی کا رزولیوشن ہی زیادہ کر دیا گیا۔ لیکن تحریک بوائکاٹ کو کانفرنس پروگرام سے خارج کرنے کی کوشش میں اسقدر زیادتی سے کام لیا گیا اور بے ضابطگی اور بے انصافی کا ایسا برتاؤ جائز رکھا گیا جسکی نسبت فریق گرم کے قابل دید روزانہ اخبار بندے ماترم بالکل صحیح لکھتا ہو کہ

"الہ آباد میں پنڈت مدن موہن مالوی اور اُنکے مقلدوں کا طرز عمل خودسرانہ

ہونے کے علاوہ ایمانداری کے بھی خلاف تھا۔ ریوے تھیٹر میں جو لوگ ڈیلیگیٹ نیابے گئے تھے ان کا انتخاب اسی طریق کے مطابق ہوا تھا جسکو کانگرس نے ہمیشہ جائز تسلیم کیا ہے

لاریب جو لوگ کسی بڑی پبلک میٹنگ میں شرکت کانگرس یا کانفرنس کی غرض سے نامزد کیے گئے ہوں انکے استحقاق نیابت کی نسبت اس سے پیشتر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا گیا تھا لیکن پنڈت صاحب اور انکے حواریوں نے ایک عارضی کمیٹی میں جسے کانگرس کا نسٹیٹیوشن کو تبدیل کرنیکا کوئی اختیار نہ تھا، چند جبری رزولیوشن پاس کرکے ریوے تھیٹر کی میٹنگ میں نامزد شدہ ممبروں کو ڈیلیگیٹ تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ مطلق العنانی کی ایسی قابل شرم اور عجیب کارروائی کرتے ہوئے؛ خود سر برٹش حکام کو بھی ضرور حیا آتی۔ ...... پہلے تو ان لوگوں نے تھیٹر ہال کے منتخب شدہ گرم ممبروں کو خارج کرنے کی کوشش اس قابل تمسخر دلیل پر کی کہ میوہال میں ایک مقررہ تعداد سے زیادہ لوگوں کے بیٹھنے کی گنجایش نہیں ہے لہذا (فریق نرم کی منطق ملاحظہ طلب ہے) اس مقررہ تعداد کو کلیتاً پیروان مسٹر مالوی پر مشتمل ہونا چاہیے لیکن بعد میں یہ معلوم کرکے کہ اس چال سے کام نہ نکلے گا ایک نئے عذر کا سہارا پکڑا کہ کانفرنس میں خاص شہر الہ آباد کے ممبروں کی کثرت تمام صوبے کے نائبوں سے زیادہ نہونا چاہیے حالانکہ یہ بھی ایک صریح چالاکی تھی کیونکہ قواعد موجودہ کی رُو سے جس مقام پر کانفرنس کا اجلاس ہو وہاں کے ممبروں کی زیادتی تعداد کا روکنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ جن چند لوگوں نے کانفرنس میں حصہ لیا اُن میں بھی اہل الہ آباد ہی کی تعداد سب سے زیادہ تھی ۔"

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اخبار ایڈوکیٹ اور انڈین پیپل کو اپنے فریق کی خلاف قاعدہ و انصاف کارروائی پر افسوس کرنے کے بجاے فریق گرم کی بیجا شکایت کرنے میں بھی تامل نہ ہوا اور اُنھوں نے تھیٹر ہال کی میٹنگ کو بہ نظر حقارت

طالبعلموں کی میٹنگ قرار دیکر پبلک کو فریب دینا چاہا۔ ہمارے خیال میں طالبعلموں کی میٹنگ کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی خصوصاً ایسی حالت میں طالبعلم زیادہ تر ایم۔ اے۔ اور ایل ایل۔ بی کے طالب علم ہوں۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ جلسۂ زیر بحث کو طلبا کا جلسہ کہنا ہی غلط ہے کیونکہ بقول اخبار سٹیزن الہ آباد اس میں حاضرین کی کم از کم تعداد یعنی ۷۰۰ میں سے مجارٹی ایسے لوگوں کی تھی جو طالب علم نہ تھے۔ چنانچہ رزولیوشن پیش کرنے والوں اور تائید کرنے والوں میں سے ایک شخص بھی طالب علم نہ تھا۔ اور ہم اسوقت ۴۵۰ ایسے لوگوں کے نام پیش کرسکتے ہیں جنھوں نے میٹنگ میں حصہ لیا۔ بیشک ۲۰۰ منتخب شدہ ڈیلیگیٹوں میں سے ایک نہایت قلیل تعداد ایسے گریجویٹ طالبعلموں کی تھی جو امتحان قانون کی تیاری کررہے تھے یا ٹیچر تھے لیکن ساتھ ہی اس کے معترضین نے بھی اپنے جلسۂ میوہال میں فورتھ ایر کے ایک طالب علم کو منتخب کیا تھا۔ واقعی مقام تعجب ہے کہ میوہال کی میٹنگ جس میں حاضرین کی تعداد صرف ۱۵۰ تھی محض اسلیے ریپریزنٹیٹو قرار پاے کہ اس میں مسٹر مالوی کے ہمخیال لوگ شریک تھے اور تھیٹر ہال کا جلسہ جسمیں طالبعلموں کے علاوہ ۴۵۰ اور لوگ بھی شریک تھے محض اسوجہ سے بے ضابطہ ٹھہرے کہ اس میں فرق گرم کا عنصر غالب تھا۔

نیتجہ اس ناعاقبت اندیشی کا یہ ہوا کہ جن لوگوں کو خود مالوی جی کے گروہ نے الیکٹ کیا تھا اُن میں سے بھی ایک کثیر تعداد نے بغرض اظہار ناراضامندی کانفرنس میں حصہ لینے سے انکار کیا اور شرکاے کانفرنس کی تعداد ۱۳۳ سے زیادہ نہو سکی۔

وزیٹروں کے لیے پہلے ٹکٹ مقرر کیا گیا تھا لیکن بعد میں ٹکٹ کے بجاے یہ نامعقول قاعدہ جاری کیا گیا کہ کانفرنس کے خود ساختہ سکرٹری جسکو اجازت دیں

وہی داخل ہو سکتا ہے۔ ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوے ہم بھی بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ الہ آباد کا نفرنس کی حیثیت ایک پرائیویٹ میٹنگ سے زیادہ نہیں ہو سکتی جسمیں چند لوگوں نے اپنے یار دوستوں کو ساتھ لیکر جو چاہا پاس کرلیا۔ اور اب اپنے فیصلوں کو تمام صوبے کا فیصلہ قرار دینے کی بیہودہ کوشش میں مصروف ہیں۔ پنڈت موتی لال صاحب نہرو کا ایڈریس اکثر مقامات پر غلط دلیلوں کا ایک قابل افسوس مرقع ہے۔ اور کانفرنس کے رزولیوشنوں میں سے خاصکر وہ رزولیوشن جس میں یونائٹڈ پرونسز ایسوسی ایشن کے قواعد مرتب کرنے اور قبل ترتیب قواعد اُسکے ممبروں کی تعداد محدود کرنیکا ذکر ہے سخت اعتراض کے قابل ہے۔

حاجی موسیٰ خانصاحب رئیس دتاولی نے ہم سے یہ بھی شکایت کی ہے کہ ججان ہائی کورٹ وجوڈیشیلی کے رزولیوشن میں بحیثیت مسلمان اُنکی کچھ بھی شنوائی نہ ہوئی بلکہ کسی صاحب نے کانفرنس کو علانیہ ہندو کانفرنس کہنے میں بھی تامل نہیں کیا۔ یہ سب باتیں بحث طلب ہیں لیکن فی الحال تو ہمیں اس پرائیویٹ کانفرنس کو پرونشل کانفرنس تسلیم کرنے ہی میں تامل ہے اور اسلیے اس کی کارروائی پر اعتراض کرنے کو ہم ایک فعل عبث خیال کرتے ہیں۔ دیکھنا صرف اسقدر ہے کہ فریق گرم کو شکست دینے کے لیے جو جو دلیلیں تراشی گئی ہیں ان پر ہمارے صوبے کے نرم لیڈر قائم بھی رہتے یا نہیں۔ اور آیندہ لکھنؤ کانفرنس میں بھی اس امر کا لحاظ رکھا جاتا ہے یا نہیں کہ باشندگان لکھنؤ کی تعداد زیادہ ہونے پائے۔

ہمارے خیال میں اب وہ وقت آگیا ہے کہ کانگرس و کانفرنس کے لیے ڈیلیگیٹ منتخب کرنے کے قواعد صحیح اصول پر وضع کیے جائیں اور صاف صاف بتا دیا جاے کہ کون کون سے لوگ ڈیلیگیٹ بنائے جا سکتے ہیں اور کون کون سے لوگ ووٹ دے سکتے ہیں اور ہر حصہ ملک یا صوبے کو زیادہ سے زیادہ کتنے ممبر منتخب کرنیکا اختیار ہے۔ نیز یہ کہ

خود کانگرس یا کانفرنس کے لیے زیادہ سے زیادہ کتنے ممبر منتخب ہو سکتے ہیں کیونکہ جب تک یہ نہوگا اُسوقت تک کانفرنس تو کانفرنس کانگرس کا بھی خاطرخواہ وقعت پیدا کرنا۔ خیال است و محال ست و جنوں۔

مکتوبات آزاد

(جنکا سلسلہ کئی ماہ تک رسالہ مخزن لاہور میں جاری رہا تھا)

یعنی حضرت آزاد صاحب ایجات کے چند دلچسپ خطوط کا مجموعہ جسکے شروع میں سید جالب صاحب دہلوی کے قلم سے نکلا ہوا ایک نہایت پسندیدہ دیباچہ اور حضرت آزاد کی ہاف ٹون تصویر بھی موجود ہے۔ ۶۰ر علاوہ محصولڈاک میں مینیجر مخزن سے ملتا ہے۔

حضرت جالب نے مولانا آزاد کی افسوسناک دیوانگی کے ضمن بیان میں ذوق غالب و مومن کی بھی شاعرانہ خود فراموشی کا حال اس طرح پر لکھا ہے کہ

"غور کیا جاے تو مولانا کی حالت کا یہ زبردست انقلاب کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں۔ کیونکہ حکماے مشرق و مغرب دونوں اس بارہ میں متفق الراے ہیں کہ دماغی کام کرنیوالے اپنی محویت و استغراق سے یہ راستہ برابر طے کرتے رہتے ہیں اور شعرا، تو بلند پروازی خیال کی مدد سے اکثر اس کی سرحد کے لگ بھگ ہی پہنچ جاتے ہیں چنانچہ ایک بڑا یونانی فلسفی لکھتا ہے کہ "اگر میں اپنے تمام خیالات لوگوں پر ظاہر کر دوں تو فی الفور پاگل قرار پاؤں"۔ گولڈ اسمتھ اپنے ایک مضمون میں زبان کی اس تعریف کو کہ "وہ اظہار خیالات کا ذریعہ ہے" غلط ٹھہراتا ہے اور بدلائل محکم ثابت کرتا ہے کہ یہ تعریف صرف حواس باختہ قطرب زدہ لوگوں ہی پر صادق آسکتی ہے۔ صحیح الدماغ اشخاص کے لیے زبان کی تعریف یہ ہونی چاہیے کہ وہ اسکی مدد سے اپنی اصلی حالت کو چھپاتے ہیں اور اکثر اوقات اپنے قلبی محسوسات کے بدلے اوپری معاملات لوگوں پر ظاہر کرتے ہیں۔ افلاطون مانتا ہے کہ ہر فرد بشر پر وقتاً فوقتاً دیوانگی کی حالت طاری

رہتی سب ہے اور زیادہ تر یہ نامعلوم طریق پر ہوتی ہے خصوصاً جو اشخاص تحقیقات و اختراعات کے درپے ہوتے ہیں وہ خود کو زیادہ اس کا مورد بناتے ہیں۔ حکیم ارشمیدس کا قصہ مشہور ہے کہ حمام میں غسل کرتے وقت پانی کے حوض میں جا اس کو ڈوبتے اور بقدر اسکے حجم کے پانی کو اچھلتے دیکھکر معاً "تر ازوئے آبی" کا خیال اس کے ذہن میں آیا اور فرط مسرت سے وہ اسقدر مدہوش ہوا کہ فوراً "پالیا پالیا پالیا" کہتا ہوا ننگا حمام سے نکل بھاگا اور بادشاہ کے دربار میں جا داخل ہوا۔ یوروپ کے اخبارات میں ذیل "لطائف و ظرائف" آئے دن بڑے بڑے نامی پروفیسروں کی خود فراموشی کے واقعات چھپتے رہتے ہیں۔ لارڈ کیلون جو اسوقت نہ صرف انگلستان بلکہ دنیا کے چیدہ سائنس دانوں میں گنا جاتا ہے۔ اس سے کئی بار ایسی حرکات سرزد ہو چکی ہیں کہ کوئی نادان بچہ بھی اتنا بھولکڑ نہ ہوگا۔ خود جناب آزاد کے نامور استاد ملک الشعرا خاقانی ہند حضرت ذوق مرحوم کی نسبت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ آپ چلم کے لیے آگ لینے جو نکلے تو کسی شعر کی دُھن میں ٹھیکرا لیے ننگے پابند باندھے۔ ٹوپی سی جوتی پہنے ایک رئیس کے دولت سرا تک چلے گئے۔ اور ایک بار نہانے کے ارادہ سے چلے تو اسی ہیئت کذائی سے قلعہ کے اندر پہنچ گئے۔ لوگ حیران وانگشت بدندان تھے۔ مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ استاد شاہ کو ٹوک سکتا۔ آخر آپ سراپردہ شاہی پر جاکر چوبدار کے سلام کرنے سے رکے اور اسوقت آپ کو اپنی حالت کا ہوش آیا۔ گھبرا کر باہر نکلنے کو تھے کہ اتنے میں یہ بات بادشاہ کے کان تک جا پہنچی۔ حضور فوراً بہ نفس نفیس برآمد ہوئے۔ اور بمنت استاد کو اندر لے گئے۔ اور بڑے اصرار سے وہ اشعار سُنے جنھوں نے حضرت ذوق کو اس قدر وارفتہ و محو کر دیا تھا۔ پھر جو استاد باہر نکلے تو گرانبہا خلعت شاہی زیب تن فرما کر نکلے۔ مرزا غالب مغفور کے دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ آپ کوٹھے پر رہا کرتے تھے اور نیچے دیوانخانہ میں محلّہ کے

تمام بنگرے آکر جمع ہوتے تھے۔ حقہ وپان وغیرہ سے اُن کی تواضع کی جاتی تھی۔
اور جب کسی شاگرد یا رئیس کے ہاں سے میوے یا مٹھائی کی نذر یا سوغات آتی تھی
تو اُس میں بھی اُن لوگوں کا حصہ لگتا تھا۔ ان بیٹھنے والوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ۔
خواندہ۔ نیم خواندہ۔ جاہل۔ خلیق۔ بدمزاج سب ہی طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ اور
چونکہ اکثر گنجفہ۔ شطرنج۔ چوسر وغیرہ کا شغل رہتا تھا۔ اس لیے باتوں باتوں میں تکرار
بھی ہو پڑتی تھی اور خوب غل مچتا تھا۔ جس کی آواز جب مرزا کے کان تک جاتی تھی
تو وہ سمجھتے تھے کہ "ہاں دیوانخانہ آباد ہے"۔ اگر اتفاق سے کسی روز جھگڑا نہ ہونے
پاتا تھا یا شور وشغب کی نوبت نہ آتی تھی تو مرزا صاحب کچھ افسردہ سے ہو جاتے تھے
اور ملازموں سے فرماتے تھے کہ "دیکھنا میاں۔ آج محلہ میں خیریت تو ہے۔ کوئی حادثہ تو
نہیں ہو گیا"۔ نوکر جنھیں لوگوں کی چلمیں بھرنی اور متفرق کام کرنے پڑتے تھے دل
میں دعائیں مانگتے تھے کہ آج دیوانخانہ گرم نہ ہو۔ مگر جب مرزا صاحب کو بے چین
دیکھتے تھے تو دل ہی دل میں سُلگتے اور زبان سے کچھ بڑبڑاتے ہوئے لوگوں کے
گھروں پر جاتے تھے اور آواز دیکر کہتے تھے "بھئی چلو بڈھے کو سودے کا زور ہوا۔
چلو۔ چل کر اودھم مچاؤ"۔ لیکن یہ حالت ملازموں کی عارضی تھی ورنہ درحقیقت ہر شخص
اُن کا عاشق وجاں نثار تھا۔ مرزا صاحب اپنی شاہ خرچی اور فیاضی کے باعث اکثر
تنگدست رہتے تھے اور نوکر بھی اُنکے ساتھ پریشان ہوتے تھے مگر کبھی کوئی ملازم
حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا اور بڑے بڑے رؤسا کے ہاں زائد تنخواہ پر بھی کسی نے جانا
نہ چاہا۔ خاصکر کلّو۔ کلیان جنھوں نے اپنی خدمت کا سب سے بڑا صلہ یہ پایا ہے کہ مرزا صاحب کے
رقعات مندرجہ اُردوئے معلّی وعودِ ہندی نے صدیوں تک اُنکے بقائے نام کا سامان کر دیا تھا
اُنسے اسقدر مانوس تھے کہ کلّو نے ان کی وفات کے بعد پھر کسی کی نوکری ہی نہیں کی۔
اور ساری عمر اُن کی یاد اور فاتحہ خوانی میں گذار دی۔ راقم الحروف نے کلّو سے بارہا مرزا صاحب

موہوم کے حالات سُننے ہیں مگر کبھی اُسنے ٹھنڈا سانس پیے اور سخت حسرت ظاہر کیے بغیر انکا ذکر شروع نہیں کیا۔ دیوانخانہ میں بیٹھنے والوں کی نسبت وہ کہا کرتا تھا کہ جناب مرزا صاحب بعض اوقات دنوں نیچے نہ اُترتے تھے اور ان کی صورت تک نہ دیکھتے تھے مگر وہ غل غپاڑہ گویا ان کی غذائے روح تھا۔ جسکے بغیر انہیں کل نہ پڑتی تھی۔ ان لوگوں سے اگر وہ کبھی کچھ کام لیتے تھے تو یہ لیتے تھے کہ جب کوئی نیا مضمون باندھتے تھے اور اسکی مسترت کے کیف میں بیخود ہو جاتے تھے تو نیچے تشریف لے آتے تھے اور وہ شعر لوگوں کو سناتے تھے اور داد لیکر پھر اُلٹے پاؤں واپس چلے جاتے تھے۔ کبھی ایسا موقع ہوتا تھا کہ دیوانخانہ میں چند ناخواندہ شخص جمع ہیں جو شعر کا مطلب تو درکنار اس کی ترکیب لفظی کو بھی نہیں سمجھ سکتے مگر مرزا صاحب مغفور پر شوق کا وہ غلبہ ہوتا تھا کہ انہیں کو سناتے تھے۔ ایک ایک لفظ کی تشریح کرکے بتاتے تھے اور داد لیتے تھے۔ کلّو کا بیان ہے کہ کئی مرتبہ ایسا بھی دیکھا کہ دیوانخانہ میں چڑیا بھی نہیں۔ لیکن مرزا صاحب آئے اور دروازہ میں کھڑے ہوکر آپ نے فرمایا "لو بھئی سنو۔ کیا مضمون ہاتھ آیا ہے" اور پھر آپنے شعر پڑھا اور اس کی ضروری تشریح کی اور مطمئن ہوکر پھر کوٹھے پر چلے گئے۔ ملازم چونکہ ان حالتوں سے واقف تھے اس لیے وہ خاموش رہتے تھے اور بعض اوقات کسی معمولی آدمی کو چپکے سے دیوانخانہ میں بھیج دیتے تھے تاکہ مرزا صاحب کی تکلیف رائگاں نہ جائے اور وہ آزردہ نہ ہوں۔ حالانکہ انھیں مرزا نوشہ کی نازک دماغی کا یہ حال تھا کہ بعض موقعوں پر جناب نواب ضیاء الدین خاں مرحوم نیّر درخشاں اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ مرحوم اور نواب علاء الدین خاں علائی مغفور جیسے روساے بلند پایہ منتیں کرتے کرتے تھک جاتے تھے اور وہ ایک مصرع تک زبان پر نہ لاتے تھے۔ اللہ اللہ سچ کہا ہے کہ شاعر اپنے رنگ میں بادشاہ سے بڑھکر ہوتا ہے۔ حکیم مومن خاں مغفور کا یہ عالم تھا کہ رستہ میں چلتے چلتے خود بخود ٹھٹھک جاتے تھے اور پھر چلنے لگتے تھے۔ ایک دو

شاگرد یا معتقد ساتھ لپٹے رہتے تھے کہ کہیں کسی گاڑی گھوڑے کی زد میں نہ آجائیں۔ پھر بھی ایسا ہوا کہ کئی بار چوٹ کھائی اور کئی بار گرتے گرتے بچے۔ آپ کے ہاتھ کی جنبش اکثر اُس خیال کا پتہ دیا کرتی تھی جس میں آپ غرق ہوتے تھے۔ کبھی دونوں ہاتھ بھی چلتے تھے۔ ایک شاہزادہ صاحب کا بیان ہے کہ کلاں محل میں ایک بالاخانہ پر ہم چند احباب کی نشست رہتی تھی۔ حکیم صاحب بھی گاہے ماہے قدم رنجہ فرماتے تھے اور چونکہ ہم میں قریب قریب سب تعلیم یافتہ اور مذاق سخن کے دلدادہ تھے اسلیے اپنا کلام بھی سُناتے تھے۔ ایک روز میں بالاخانہ کے چھجے پر بازار کے رخ بیٹھا تھا۔ دور سے دیکھتا کیا ہوں کہ جناب حکیم صاحب جھومتے جھامتے چلے آرہے ہیں۔ مگر آپ کا دایاں ہاتھ عجب انداز سے ہلتا جاتا ہے۔ جیسے کوئی کسی چیز کو جھٹکتا ہو۔ جب اکوٹھے کے نیچے آئے تو میں نے آواز دی کہ "تھوڑی دیر کے لیے قدم رنجہ فرمائیے" مگر اُنھوں نے مطلق اعتنا نہ فرمایا۔ میں نے پھر بلایا۔ اور جب دیکھا کہ یہ سُنتے ہی نہیں تو خود نیچے اُتر گیا۔ مگر آپ آگے بڑھ گئے تھے۔ میں نے دبے پاؤں آپ کے قریب جاکر سُنا تو اس مصرع کی تکرار فرمارہے تھے ع مومن چلا ہے کعبہ کو ایک پارسا کے ساتھ۔ میں نے کہا "اچھا حضرت پھر ہم سے بھی گلے ملتے جائیے۔ خدا خیریت سے واپس لائے" اسپر آپ نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا دیئے۔ حکیم صاحب مغفور کی ایک یہ بھی عادت تھی کہ راتوں کو دو دو تین تین بجے سوتے سوتے اُٹھکر باہر نکل آتے تھے اور جسطرف منھ اُٹھتا تھا چلدیتے تھے۔ لوگونکو خبر ہوتی تھی تو تلاش میں نکلتے تھے! یہ حالتیں ظاہر کرتی ہیں کہ شعرا کو بیخودی و خود فراموشی سے اکثر سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ مگر اُن حضرات میں یہ حالتیں عارضی ہوتی ہیں اور حضرت آزاد کے معاملہ میں ملک و زبان کی بدقسمتی سے اُنھوں نے استقلال کا درجہ قبول کرلیا اور فرط استغراق سے یہ عالم ہم پہنچا ہے کہ گھنٹوں اور دنوں تو درکنار ہفتوں اور مہینوں بھی آپ اپنے آپ میں نہیں آتے۔ اللہ اللہ"

حصۂ نظم

غزل علامۂ شبلی نعمانی

مرا کشتست از اندیشۂ آزادست پنداری — چناں بے باک خوں ریزد کہ جلادست پنداری

زبس کز سینۂ ما لب گشت لبریز شکایت ہا — نوائے کز لبم برخاست فریادست پنداری

چنیں کز بیم دشمن وصف او در پردہ میگویم — حدیثم از گل و نسرین و شمشادست پنداری

زبس ہر شیوہ اش باشد جفائے لطف ماننئے — نوازشہائے خاصش نیز بیدادست پنداری

شکستن ہای رنگ روی قاصد نیست بے چیزے — ز دستش نامہ ام در راہ افتادست پنداری

دو زلفش دام بر دوش و دو چشمش در کمیں سازی — بداں ساماں ہمی آید کہ صیادست پنداری

نشد ہرگز کہ آں بدعہد حرف راستی گوید — بافسوں سازی و نیرنگ آزادست پنداری

بر آب و رنگِ نظم خویشتن نازد چناں شبلی
کہ در اقلیم معنی کہنہ استادست پنداری

غزل حضرت ضامن کنتوری

سودائے زلف ضامن بہر خدا نہ کرنا — سر پر بلا نہ لینا، دل پر جفا نہ کرنا

دیکھا زبان و دل بھی باہم رقیب نکلے — افشائے رازِ الفت پھر برملا نہ کرنا

بیتابیِ محبت اک شعبۂ جنوں ہے — میرے کہے سُنے پر تم اعتنا نہ کرنا

رنگِ پریدۂ رخ تفسیر بیدلی ہے — عرض نیاز الفت اسکے سوا نہ کرنا

کہنا یہ ہے انکا "اتنا ہی حوصلہ تھا" — ذکر وفا دوبارہ اے بے وفا نہ کرنا"

جیتے ہیں جینے والے، مرتے ہیں مرنے والے — عاشق کے غم میں دیکھو تم زلف وا نہ کرنا

ہستی ہی تیری کیا ہے، یہ ناوکِ قضا ہے! — ترچھی نظر کا اے دل تو سامنا نہ کرنا

ہاتھوں سے اُنکے ضامن چھوٹی عنان کہیں
بس کر چکے جو آہیں ان کے سوا نہ کرنا

غزل حضرت محشر لکھنوی

ہجر کی شب کوئی غمخوار کہاں سے لائیں | چارہ ساز دل بیمار کہاں سے لائیں
وقت پرسش ہو لحاظ بشریت بھی ضرور | ایسی تقدیر گنہگار کہاں سے لائیں
یاس ہر گام پہ ہے حوصلہ فرسائے تلاش | تیرے ناکام مددگار کہاں سے لائیں
مذہب عشق میں گو بادہ پرستی ہو حلال | ابر و فصل گل و گلزار کہاں سے لائیں
چارہ سازوں کو اشاروں ہی سے رخصت کردیں | اتنی طاقت ترے بیمار کہاں سے لائیں
دشت وحشت میں ہے اک تازہ جنوں بے شغلی | سر کے ٹکرانے کو دیوار کہاں سے لائیں
خون دل سوز محبت نے کیا خشک تمام | طاقت لذت آزار کہاں سے لائیں
حسن جویائے مساوات ہے اور عشق کا قول | اتنی ہم گرمی بازار کہاں سے لائیں ؟
جذبۂ حسن سے پرساں ہے خم زلف بتاں | روز اک تازہ گرفتار کہاں سے لائیں
لن ترانی کا جواب اور وہ مقبول بھی ہو | ہم یہ خوبی دم گفتار کہاں سے لائیں
بے عیادت کے نہ صبر آئے انہیں اے محشر | وہ برا وقت وہ آزار کہاں سے لائیں

غزل حسرت موہانی

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں | آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں
بیزبانی ترجمان شوق بے حد ہو تو ہو | ورنہ پیش یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں
مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگار عشق کی | اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں
التفات یار تھا اک خواب آغاز وفا | سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بےصبری ہے حسرت خامکاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

مسئلہ مصر اور برٹش کانشنس

(ماخوذ از اخبار بندے ماترم کلکتہ)

حال میں اخبار پائونیر نے بدقسمت ملک مصر کی قومی تحریک سے متعلق اپنا فیصلہ بدیں الفاظ شائع کیا ہے کہ "مصریوں کی تقاضائے حکومت خود اختیاری کی مخالفت خود اہل مصر کے فوائد کے لحاظ سے ضروری ہے" ہمارے نزدیک اگر صاف طور پر کہدیا جاتا کہ اہل مصر کی آرزوں کا خون "محافظین مصر" کے فوائد کی خاطر روا رکھا جاتا ہے تو یہ ایک بات قرین قیاس بھی ہوتی لیکن یہ ظاہر کرنا کہ اس فعل سے باشندگان مصر کی بہبودی مد نظر ہے درحقیقت اول درجے کا فریب ہے۔

اپنے غرور اور خود پسندی کی بدولت انگریز اکثر اس قسم کی قابل تمسخر اور مہمل باتیں لکھ جاتے ہیں اور اپنے تئیں خدا کی جانب سے تمام عالم کا حکمران سمجھکر جو شخص ذرا بھی اُنکی مزاحمت کرتا ہے اُسے [illegible] باغی اور نمک حرام قرار دے لیتے ہیں۔

انگلستان کی تاریخ درحقیقت ایک کارنامہ ہے حصول آزادی کی مسلسل کوششوں کا اور زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ موجودہ وزیر اعظم نے جب وہی پارلیمنٹ ڈوما پہلی مرتبہ شکست ہوئی ہے تو اُسکے فوراً دوبارہ قائم ہونیکی بڑے زور سے خواہش ظاہر کی اور اُنکی اسپیچ کا ایک فقرہ تمام دنیا میں مشہور ہوگیا۔

لیکن جب کبھی مصر یا ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ پیش ہوتا ہے جس سے فوائد برطانیہ کو بھی ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے اسوقت انگریزوں پر جذبہ طمع غالب آجاتا ہے اور وہ لوگ ضمیر فروشی کو شعار بناکر جمہور کی تحریک حریت کو دبانا چاہتے ہیں اور اپنے جور و استبداد کے جواز میں ہر قسم کی مہمل دلیلیں گڑھنے لگتے ہیں۔

لیکن انگلستان کے قبضہ مصر کا حال سب پر روشن ہے کہ ابتدا میں اسکا عارضی ہونا مسلم تھا مگر اب بربنائے مصلحت وہی دوامی ہوگیا ہے اور اسلیے دنیا اب ان اخباری دروغ بیانیوں کے فریب میں نہ آئے گی۔

اہل مصر میں بھی قومیت کی نئی روح پیدا ہو گئی ہے اور ہر مصری ملا[illegible]
کہ "مصر کو صرف مصریوں کے لیے ہونا چاہیے" چنانچہ آخرکار لارڈ کرومر کو بھی مجبوراً تسلیم کرنا
پڑا ہے کہ آیندہ باشندگان ملک اپنے قدرتی حقوق سے بالکل محروم نہیں کیے جا سکتے...
... اور اسلیے انھوں نے اغیار و اجانب کے فوائد کو پیش نظر رکھکر "قومیت" کا ایک جدید
مفہوم تراشا ہے وہ یہ کہ "بلا لحاظ قوم و مذہب مصر کے تمام رہنے والے مصری قوم سمجھے
جائیں"۔ اور اسی مفہوم کی بنا پر آپ نے مصری کانسٹیٹیوشن کی ایک عجیب و غریب
تجویز پیش کی ہے جسکے ۳۲ ممبروں میں سے کم از کم ۲۱ غیر ممالک کے باشندے
ہونگے جو وہ درحقیقت مصری نہیں ہیں۔ صرف مصر میں سکونت رکھتے ہیں"
اس حیرت انگیز تجویز کو دیکھکر ہر شخص اقرار کریگا کہ انگریز اپنے سوا اور ساری دنیا کو
بے وقوف سمجھتے ہیں۔

رسید کتب

(جنپر ماہ آیندہ میں ریویو ہوگا)

(۱) ثمرہ فصاحت دیوان فیاض حیدرآبادی (۲) زینت البنات از ا۔م۔خ
عظیم آبادی (۳) فارسی عربی الفاظ کی جمعیں اور مادے از حسام الدین صاحب
پروفیسر ٹریننگ کالج پونا (۴) سوانح جہاں آرا بیگم از محبوب الرحمن کلیم بی۔اے
(۵) جمشید بغدادی از حضرت شرر لکھنوی (۶) مسئلہ مسلمانان ہنود از مسٹر شنکر ناتھ ایم۔اے
(۷) تذکرہ گلشن ہند۔

نوٹ: لارڈ کرومر حال ہی میں اپنی خدمت سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ اور اس موقع پر تمام
اخبار ان کی تعریفوں کے پل باندھ رہے ہیں۔ لیکن حقیقت حال کا اظہار اس واقعے سے بخوبی
ہو سکتا ہے کہ ان کی ستائش میں جو جلسہ مصر میں کیا گیا اس میں کوئی مصری شریک
نہیں ہوا۔

رجسٹرڈ نمبر ۲۰۱

اردوئے معلیٰ

نمبر	بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۰۷ء	جلد

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی - بی اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلیٰ علی گڑھ

علی محمد خان کے اہتمام سے
مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

قیمت سالانہ قسم (۲) (۳) روپئے چار آنے مع محصول

فاتحہ صد سالہ میر تقی مرحوم

سال آیندہ یعنی ۱۳۲۵ھ میں میر کی وفات کو پوری سو برس ہو جائینگے۔ دس پندرہ سال اُدھر سے ہمارا یہ خیال تھا کہ اس موقع پر کوئی عظیم الشان جلسہ میر کی یادگار میں منعقد ہو تو اسکے ذریعہ سے ہم اپنی قدردانی کا ایک نمونہ پیدا کر سکیں گے۔ اُردو شاعری خصوصًا غزلخوانی کے فن کو میر نے جس بلند مرتبہ پر پہونچایا اسکی نظیر بہت مشکل سے مل سکیگی وہ کون شاعر تھا جس نے میر کو اُستاد نہیں مانا اور واقعی اُستاد وہی مانا جاتا ہے جسکے کلام کو سُن کے طبیعت کو عجز ہو جائے ورنہ یوں تو سبھی کہہ لیتے ہیں۔ یہ بھی کہنا بیجا نہوگا کہ ہر زمانہ کے لئے اُستاد تھا بہتسے شعرا ایسے گذرے ہیں جو اپنے زمانے میں اُستاد مانے گئے اسلئے کہ اُس زمانے میں اُس قسم کا مذاق عام پسند ہوگیا تھا جس مذاق میں اُن کو کمال تھا لیکن من بعد وہ مذاق باقی نہ رہا اس قسم کی بہت سی مثالیں آپ کو اُردو شاعری میں بھی ملیں گی مگر میر کا مذاق ایسا صحیح ہے کہ اُس کی قدر ہر زمانے میں ہوتی ہے۔ واقعی میر ایسا ہی اُستاد تھا جو کچھ اُسکی تعریف کیجائے ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک جسقدر شاعری کے نام لیوا موجود ہیں سب بجا اور درست کے نعرے بلند کرنے کو آمادہ ہو جائیں گے مگر زمانہ کسقدر ناقدر ہے کہ میر کی قبر کا نشان بھی نہیں بتا سکتا ہمنے بڑی تلاش سے ایک جگہ کا پتہ پایا ہے مگر وہ بھی شاید ہمارا قیاس ہو اور خدا کرے کہ قیاس ہو کیونکہ وہ مقام اس قابل ہی نہیں کہ ہم کسی کو اُس مرحوم کے مزار کی زیارت کرا سکیں۔ دل کی تسکین کو یوں کہہ لیجئے کہ مٹی کا ڈھیر ملنا تو کیا ہوتا اور نہ ملا تو کیا ہوا۔ اس صد سالہ یادگار سے میر کی شہرت کو فائدہ پہونچے یا نہ پہونچے مگر اُردو لٹریچر کے لئے ضرور نافع ہے بشرطیکہ اہل فن اس تجویز کی طرف متوجہ ہوں۔ عنوان جو کچھ پسند کیا جائے بہرصورت اس تمام جلسہ کا خلاصہ چند حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے (۱) قرآن خوانی یا اور جو مذہبی رسم کی اس موقع پر ادا کئے جانے کی رائے دیجائے (۲) میر کی سوانح عمری پر مضمون (۳) میر کی شاعری پر ریویو (۴) اُس زمانے کی شاعری سے اس زمانے کی شاعری کا امتیاز (۵) مشاعرہ میر کی طرح پر اسکے سوا اور جو امور تجویز کئے جائیں اُنپر غور ہوگا۔ اس جلسہ میں جنکو شرکت منظور ہو وہ اپنے نام نامی سے دفتر انجمن معیار کو مطلع کریں۔

راقم مرزا محمد ہادی اڈیٹر الحکم لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

راسخ عظیم آبادی

(از ۱۱۶۲ھ تا ۱۲۳۸ھ)

نام و تخلص شیخ غلام علی نام راسخ تخلص عظیم آباد کے یگانۂ روزگار اساتذہ میں سے تھے جن سے بقول نساخ ۱۲۳۸ھ تک اور بقول گارسن دتاسی ۱۲۴۰ھ تک عظیم آباد و نواح عظیم آباد میں فیض سخن کا دریا جاری رہا۔

سلسلۂ شاعری تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے انکا سلسلۂ شاعری مشہور استاد عشق معاصر سودا سے اس طرح پر ملایا ہے کہ یہ فدوی کے شاگرد تھے اور فدوی کو عشق سے تلمذ تھا لیکن خود انھوں نے جہاں کہیں لکھا ہے اپنے کو میر تقی میر کا شاگرد اور عقیدت مند بیان کر کے اکثر فخر و مباہات سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً

ہیں میر گزشتہ کے بدلے حضرت راسخ ــــ اب ان کو سلامت رکھے اللہ تعالیٰ

راسخ کو ہے میر سے تلمذ ــــ یہ فیض ہے اُن کی تربیت کا

نسبت تو اُسی سے تھی راسخ کو تلمذ کی ــــ وہ میر جو استاد اس اشعار کے فن کا تھا

شاگرد ہیں ہم میر سے استاد کے راسخ ــــ استادوں کا استاد ہے استاد ہمارا

زندہ ہے نام میر راسخ سے ــــ کون ہے شاعروں میں ایسا آج

یہ دار سخن اب کون ہو ہمسر راسخ ــــ شاہ اقلیم معانی ہوئے ہم میر کی طرح

کروں کیونکر نہیں راسخ مباہات ــــ کہ ہیں استاد میرے حضرت میر

ان مقطعوں کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ راسخ اپنی نسبت شاگردی کو میر ہی کے ساتھ مسلّم رکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور یہ بات میر کے رتبہ شاعری کے لحاظ سے کچھ زیادہ معیوب بھی نہیں معلوم ہوتی ورنہ اگرچہ انھوں نے میر تقی کو بھی اپنے شعر دکھلائے تھے[1] لیکن درحقیقت

---

[1] سخن شعرا از نساخ صفحہ ۱۰۶

وہ شاگرد فدوی ہی کے ہیں جسکے اظہار میں اُنھیں کسی قسم کے تامل کی ضرورت نہونا چاہیے تھی کیونکہ فدوی کا پایۂ استادی بھی اسقدر ضرور بلند تھا کہ اُنکے لائق سے لائق شاگرد کے لیے سرمایۂ فخر ہوسکتا۔

فدوی کا حال | مرزا احمد علی عرف مرزا بچو فدوی تخلص متوطن شاہجہاں آباد نظم ریختہ میں استاد، تلاشِ معنی میں فکر رسا رکھتے تھے، اور بیانِ حُسن میں دل درد آشنا[1] جیسا کہ اُنکے کلام سے ثابت ہو۔ فرماتے ہیں ؎

ہم کو تو وفا سے نہیں اے یار گزرنا | پر تو بھی جفا سے نہ ستمگار گزرنا
ضد دیکھو خوباں کی اک آن کی خاطر | مرجائے جو عاشق تو نہ زنہار گزرنا
اس بو کے تصدق ہوں کہ اُس گُل کی گلی سے | ہے بادِ صبا کے تئیں سو بار گزرنا
جب یار کے آگے سے چلے قافلۂ دل | اے اشک تو ہو قافلہ سالار گزرنا
شاید نظر آجائے کبھو در پہ تو سو بار | فدوی کے تئیں ہو بس دیوار گزرنا

اور مندرجۂ ذیل اشعار اسوقت تک لوگوں کی زبانوں پر جاری ہیں۔ ؎

چل ساتھ کہ حسرت دل محروم سے نکلے | عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

شب ہجراں کی اور تو فدوی | ہمیں تقریر کرنی نہیں آتی
پر یہ وہ بات ہے کہ جسکی ہمیں | صبح ہوتی نظر نہیں آتی

فدوی کو موسیقی میں بھی کافی دخل تھا۔ اور وہ کچھ روز احمد شاہ بادشاہ کے دقائع نویس بھی رہے تھے[2] دہلی چھوڑ کر چند سے مرشدآباد میں رہے لیکن آخر کار عظیم آباد میں مستقل سکونت اختیار کی چنانچہ وہیں شاہ رکن الدین عرف شاہ گھسیٹا عشق کی فیضِ صحبت سے کامیاب علوم ظاہر و باطن ہوئے۔

عشق کا حال | فدوی کی مانند شاہ گھسیٹا بھی اصل میں دہلی کے رہنے والے اور شاہ فرہاد کے نواسے تھے جنکی نسبت مشہور ہے کہ وہ بادشاہ وقت کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے ایام شباب میں انھوں نے بھی ترکِ وطن کرکے مرشدآباد میں طرح اقامت ڈالی اور عرصے

[1] تذکرہ گلشن ہند از مرزا علی لطف۔ [2] سخن شعرا صفحہ ۳۵۹۔

تک خواجہ محمدی خاں کے ہمراہ بڑے آرام سے رہے چنانچہ مصحفی نے اسی زمانے میں انکی نسبت اپنے تذکرے میں لکھا تھا کہ "بسیار بعزت و حرمت بسر میبرد" لیکن آخر میں عظیم آباد جاکر اپنے آباؤ اجداد کی روش کے مطابق طریق درویشی اختیار کیا اور ۱۱۹۵ھ تک ہدایت خلق میں مصروف رہے۔ بقول منشی کریم الدین انکا دیوان پیرس میں ڈی تاسی کے پاس موجود تھا۔ اب خدا جانے کہاں ہے۔ یہ بھی سودا کے ہمعصر اور مسلم الثبوت استاد تھے جیسا کہ ارباب مذاق پر دیوان عشق کے مندرجہ ذیل انتخاب[1] سے پورے طور پر روشن ہوجائیگا۔

روز و شب تجھ سے گو ملا کیجے ۔ چین پھر بھی نہو تو کیا کیجے
دل نے مجھ کو بہت ستایا ہے ۔ کسو کافر سے آشنا کیجے

ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا ۔ نہ دیکھا سو دیکھا جو دیکھا نہ دیکھا
وہ آیا نظر بارہا پر کسی نے ۔ یہ حیرت ہے اسکا سراپا نہ دیکھا
میں رو رو کے اشکوں سے کی شیشہ بازی ۔ پہ ہنس ہنس کے تونے تماشا نہ دیکھا
سبھی دعوئ عشق کرتے ہیں یارو ۔ کوئی عشق سا ہم نے رسوا نہ دیکھا

ہم نے تو ناک بھی دیکھا نہ اثر رونے میں ۔ عمر کیوں کھوتے ہو اے دیدۂ تر رونے میں
جب تلک اشک تھمیں بیٹھ اگر آیا ہے ۔ تری صورت نہیں آتی ہے نظر رونے میں

کیا کیا جفائیں ظالم ہم نے تری سہی ہیں ۔ لیکن شکایتوں سے لب آشنا نہیں ہیں
کہ بعد قتل مجھکو کس طرح چین آوے ۔ جو حسرتیں تھیں دل میں جوں کی توں ہی ہیں

نے درد دل ہے باقی نے آہ نے فغاں ہے ۔ اے شور عشق تجھ کہہ تو اندنوں کہاں ہے

فدوی و عشق کے مندرجہ بالا حالات و کلام سے ہر صاحب نظر بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ راسخ کا یہ سلسلۂ شاگردی بھی فخر و امتیاز و بلند نامی سے عاری نہیں ہے اگرچہ ہم اسکو سلسلۂ میر کے برابر قرار نہ دیسکیں۔

تصنیفات راسخ راسخ کے کلام سے تقریباً ہر جگہ ان کی علمیت کا ثبوت ملتا ہے لیکن افسوس کہ شاعری کے سوا کسی اور علم یا فن میں انھوں نے کوئی تصنیف یا تالیف یادگار نہیں

[1] ماخوذ از تذکرہ مصحفی۔

[ش]اعری۔ اصناف سخن میں سے البتہ کوئی صنف ایسی نہیں ہے جسکا پسندیدہ نمونہ انکی کلیات
[م]یں موجود نہ ہو۔
شروع میں نو قصیدے اور چند قطعات ہیں انکے بعد دیوان شروع ہوا ہے جسے انکی شاعری کا
[ا]صلی نمونہ سمجھنا چاہیے۔ پھر پچھتر کے قریب رباعیاں، پانچ مخمس، ایک واسوخت، اور چند مرثیے
[ہ]یں اور آخر میں حسب ذیل قابل دید مثنویاں دوسو باسٹھ صفحوں پر ختم ہوئی ہیں۔
(۱) مثنوی حسن وعشق (۲) مثنوی ناز ونیاز (۳) مثنوی سبیل نجات (۴) مثنوی
[ک]شش عشق (۵) مثنوی نیرنگ محبت (۶) مثنوی جذب عشق (۷) مثنوی اعجاز عشق
(۸) مثنوی نور الانظار (۹) مثنوی گنجینۂ حسن (۱۰) مثنوی مرأت الجمال (۱۱) مثنوی
[م]کتوب شوق (۱۲) مثنوی شرح حال (۱۳) مثنوی انقلاب زمانہ (۱۴) مثنوی مدحیہ
(۱۵) حکایات ہزل۔
ان سب مثنویوں کا انداز میر کی مثنویوں سے اسقدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں میں تمیز بھی مشکل
ہو سکتی ہے۔ قطعۂ تاریخ ایک بھی نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کی طرح ناسخ
بھی تاریخ گوئی سے بالکل بیگانہ تھے۔ لیکن ہمارے نزدیک تاریخ گوئی کو کمال شاعری سے
کوئی تعلق نہیں ہے۔

راسخ کی شاعری

کیا بلحاظ نفاست ومتانت معنی اور کیا بلحاظ نرمی الفاظ وتازگی ترکیب راسخ کا کلام میر تقی میر
کی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔ انکے ہاں بھی ہم کو خیالات کی دردمندی اور بیان کی شیرینی
اکثر فارسی انداز اور فارسی ترکیبوں کے ساتھ، یکتائی کے اسی عالم میں نمایاں نظر آتی ہے
جہاں میر کا مرتبۂ یکتائی پر فائز ہونا ہر نگاہ پایہ شناس کو معلوم ومنظور ہے۔
نفاست مضمون اور متانت معنی سے مراد یہ ہے کہ راسخ کا کلام، کنگھی چوٹی، بوس وکنار
اور ضلع جگت کے التزاموں سے بری ہونیکے علاوہ، ایسے بھی تمام مضامین سے پاک ہے
جن میں محبوب کا اطلاق صرف زنان بازاری کی ذات پر ہو سکتا ہو۔
حقیقت میں کلام کی اصلی برتری یہی ہے کہ شاعر کے الفاظ اور مفہوم میں وسعت اور

بلندی اسدرجے تک موجود ہو کہ پاک سے پاک اور عالی سے عالی طبائع بھی اسنے بقدر حوصلہ اپنی دلچسپی و مسرت کا سامان فراہم کرسکیں۔ چنانچہ پیرو میر کی حیثیت سے راسخ نے ان تمام خوبیوں کا بدرجۂ غایت اہتمام کیا ہے اور ابتذال مضمون سے قطعی احتراز کے علاوہ نوی الفاظ و شگفتگی تراکیب کا بھی خاص طور پر لحاظ رکھا ہے یعنی یہ کہ تقریباً ہر موقع پر پامال لفظوں اور فرسودہ ترکیبوں پر شاعرانہ و رنگین الفاظ و تراکیب کو ترجیح دی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

زہے جاں آفریں جسنے جہانِ جاں کیا پیدا — تفِ خاکِ سیہ سے گوہرِ انساں کیا پیدا
کیے اضداد ظاہر قدرت معلوم ہونے کی — جہنم کے مقابل خلدِ جاوداں کیا پیدا
نہالِ حسن کو کس کس روش بخشی ہے زیبائش — چمن میں عشقبازی کے گلِ حرماں کیا پیدا
رخِ زیبا دیا گل کو دلِ بے صبر بلبل کو — اسے خنداں کیا پیدا اُسے نالاں کیا پیدا
ہے اسکی جستجو واجب سبھوں پر جسنے اے راسخ — بایں خوبی و رونق عالمِ امکاں کیا پیدا

جملۂ دل میں وفا شعار رہا — مسکنِ درد و داغِ یار رہا
میری چشمِ پرآب کی دولت — ابر بے مایہ مایہ دار رہا
دل کی قیمت شکستگی سے بڑھی — قلب تھا کامل العیار رہا
ہے گنہ حسنِ شاہد رحمت — اس لیے میں گنہگار رہا
در بھی اس کی زلف کی وہ ہے — جس سے آشفتہ روزگار رہا

سونپا ہوا داغ اُنکا تازہ ہی سدا رکھا — ہمنے اس امانت کو چھاتی سے لگا رکھا
معمور طرب رکھے دل دوستی نے دشمن کے — آنکھوں کو محبوں کی آنسو سے بھرا رکھا
اک وہم سے میں راسخ اُس مہ کی جدائی میں — ہر آن کی کاہش نے اب اُنہیں ہی کیا رکھا

دل گریباں جنوں کی ہوا بھی بار کیا کیا — دیکھیں شگوفہ لائے فصلِ بہار کیا کیا
امادہ انکی ترکیب آغوش و بوس کی ہے — ہم ہاے اپنے جی کو کہتے ہیں مار کیا کیا

صبر کس دن مونسِ شبہائے تنہائی رہا — یاں سدا تم بن قبا جیب شکیبائی رہا
ساز نادانی سے کر پھر تجھسے پرسش کچھ نہیں — ہے وہی ماخوذ جو مغلوبِ دانائی رہا

عقل والوں کے نہ آیا پیچ میں راسخ کبھو　　پر بھی اُس کی ذی شعوری تھی کہ سودائی رہا

مجھے حُسنِ فسردہ مزاج سانئے بہار کی روش　　وہیں آگ لگ گئے مشتعل تھی شو شوں کو بڑھا گئے

انھیں آرزو تھی کہ صدر نشیں ہوں پا بلندی علو کا　　مجھے نقشِ پا کی ہی طرح دے سرِ راہ اپنی بٹھا گئے

عبث اُس سے بیٹھے ہو دل لگا چلو راسخ اب کہیں بھاگ تم　　روش اُن عزیزوں کی خوب تھی جو دل اُس چمن سے اُٹھا گئے

فارسی ترکیبوں کا اُردو اشعار میں بکمال خوبی و دلنشینی حل کر دینا شعرائے قدیم کی استعداد و لیاقت کا خاص جوہر تھا جسکی مثالیں راسخ کے دیوان میں بھی بکثرت موجود ہیں مثلاً

وے ہنسنے میں جو اشکبار ہوا　　گریہ کیا آب روئے کار ہوا

حشرِ دیدار کیا قیامت ہے　ق　وعدہ یہ وجہ اضطرار ہوا

ہائے پر طول شوق تو دیکھو　　میں مہیائے انتظار ہوا

خوب ہے دردِ محبت کو نہاں کرنا　　کڑھنا ہے ہیچ تصنع سے ہی دیا کرنا

بیستر تم تھے جہاں اب سببِ تسکیں ہے　　اس مکاں کے در و دیوار کو دیکھا کرنا

اپنے دیوانوں کا سرخیل بنایا مجھ کو　　نہوا پر انھیں منظور تماشا کرنا

ہم نے پیوند کیے ٹکڑے جگر کے باہم　　شرط تھا رونے کا سامان مہیا کرنا

ناقصوں کی ہوں میں تکمیل کا باعث راسخ　　یعنی آتا ہے مجھے قطرے کو دریا کرنا

ہر آن جو رفتہ سا رہے گا　　سر رشتۂ کار پا رہے گا

کل صبح جو وہ مائل گلگشت چمن کا تھا　　مُنہ تہ میں گریباں کی گُل زدہ چمن کا تھا

جرأت نہ تھی ملنے کی اُس یار نگاریں سے　　ورنہ یہ علاج اپنی آنکھوں کی جلن کا تھا

اُس زلف کے کوچے سے نکلا ہی نہ دل اپنا　　پابندیٔ سودائی کیا حُبِّ وطن کا تھا

متصل دل کو اضطراب رہا　　جان پر تجھ بن اک عذاب رہا

بے حجابی کے بعد بھی مجھ سے　　اُن کو اک طور کا حجاب رہا

وے تھے خواہاں مری خرابی کے　　میں اسی واسطے خراب رہا

زلف پر پیچ دیکھ کر اُس کی　　دیر سنبل کو پیچ و تاب رہا

وے رہے ہم شراب غیر کے ساتھ　　راسخ اپنا جگر کباب رہا

ہوئے ہیں پیر ہم اب بھی دلی رو بہار ہے — پلک پر اپنے آنسو صبح پیری کا ستارا ہے
خدا جانے یہاں اس آشکارا میں ہے کیا کچھ — خوشا وے اہل دل جن پہ نہاں بھی آشکارا ہے
فلک ایسا ہمارے درپئے ایذا نہ تھا آگے — یہ بے مہری تمہاری ہے تمہارا ہی اشارا ہے
یہی کہہ کہہ کے مارا اپنے بیمار محبت کو — کہ تو مرنے سے ڈرتا ہے بہت جی تجھکو پیارا ہے
شروع عشق راسخ کیسے ہو جاتا ہے جی ڈوبا — کنارے ہی پہ اس دریا کے حال ایسا تمہارا ہے

ان آخری دو غزلوں میں میر کا رنگ یہانتک پیدا ہے کہ اگر وہ میر کی چند منتخب غزلوں میں شامل کرکے پیش کیجائیں تو غالباً ارباب بصیرت بھی دونوں کا فرق نہ دریافت کرسکیں اور راسخ کے کمال کی یقیناً یہی سب سے بڑی دلیل ہے۔ فقط

فنون لطیفہ اور اسلام

فنون لطیفہ میں ذیل کے فنون شامل ہیں (۱) شاعری (۲) موسیقی (۳) مصوری (۴) نقاشی (۵) فن آراستگی۔ آجکل رقاصی اور ایکٹ کرنے کے فن کو بھی فنون لطیفہ میں شمار کرتے ہیں۔

یہ فنون دنیا کی قوموں میں آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہیں۔ جوں جوں کسی قوم کا تمدن بڑھتا اور اسکا مذاق سلیم اور دماغ روشن ہوتا ہے، ان فنون پر اسکی توجہ زیادہ مائل ہوتی ہے۔ اور عام لوگ ان میں کمال حاصل کرنے کے شائق ہوتے جاتے ہیں اور اُن کی دلچسپی قدر کرنے لگتے ہیں۔ تاریخ میں دنیا کی جن عظیم الشان قوموں کا ذکر ہے، اُن میں سے کوئی قوم ایسی نہیں ہے، جسنے جسمانی اور روحانی معراج حاصل کی ہو اور ان فنون کو دلچسپی کی نظر سے نہ دیکھا ہو۔ یونان کے باشندے اپنے مکانوں اور مندروں میں طرح طرح کی نقاشیاں اور گلکاریاں کرتے تھے۔ اُنکے کمروں کی دیواریں دلفریب تصویروں اور ہوش ربا نقش و نگار سے آراستہ کیجاتی تھیں۔ رومیوں نے بھی ان فنون میں

کمال حاصل کیا اور اپنی تر دستیوں اور ہنرمندیوں سے اُن کو اس بلندی پر پہنچایا کہ اُن کی جو یادگاریں آج یورپ کے عجائب خانوں میں موجود ہیں، وہ سیاحوں کے لیے حد سے زیادہ نظر فریب اور دلکش ہیں۔ رومی امرا کے کمروں میں فرش اور دیواروں پر نہایت خوشنما میناکاری کی جاتی تھی اور رنگا رنگ شیشوں کے ٹکڑے اس طرح ترکیب دیے جاتے تھے کہ انسے سیر و شکار کے منظروں اور تاریخی جلسوں کی تصویریں نمایاں ہوتی تھیں۔ ہر ایک کمرہ جس کام کے لیے مخصوص ہوتا تھا، اُسکے مناسب نقاشی اس کمرہ میں کیجاتی تھی۔ پومپئی، جو ملک اٹلی کا ایک قدیم شہر تھا اور جو کوہ ویسو ویس کی شرر باریوں میں دنیا کی نظروں سے غائب ہوگیا تھا، جب اثریات کے عالموں نے اسکو کھود کر نکالا اور لاعلمی کا نقاب اُسکے چہرے سے ہٹایا گیا، تو اُسکے دیکھنے سے قدیم زمانے کے تمدن کے عجیب و غریب جلوے دکھائی دیے۔ لارڈ لٹن نے پومپئی کے حالات پر ایک نہایت دلکش تاریخی ناول لکھا ہے۔ اُس میں ایک نامور رومی امیر کے شاندار محل کا حال نہایت دلچسپ لکھا ہے۔ اس محل کو سونے کا محل کہنا چاہیے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اُسکے در و دیوار پر کندن کے چمکدار پترے جڑے ہوئے تھے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ اُسکا ایک بڑا کمرہ امیر مذکور کے سونے کے لیے مخصوص تھا۔ اس کمرے میں خواب اور بیداری کے دیوتا کی تصویر کھینچی گئی تھی، جو انتہا سے زیادہ دلفریب ہے۔ زمانۂ حال کا تمدن بھی، جسکی عمارت قدیم تمدن کی منہدم شدہ بنیادوں پر اُٹھائی گئی ہے، فنون لطیفہ پر توجہ مبذول کرنے میں قاصر نہیں رہا ہے۔ یورپ کی جدید شائستہ قوموں نے بھی ان فنون کو مدارج کمال پر پہنچایا ہے اور اُن کی نادر صنعتوں کے نمونوں سے یورپ کے عجائب خانے مزین ہیں۔ اگر کوئی مشرقی سیاح ان عجائب خانوں میں قدم رکھتا ہے، تو وہ حیران ہو جاتا ہے کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا ہے، جس میں دنیا کے تاریخی واقعات اور حالات انسانوں کے جذبات اور خیالات مجسم اور زندہ نظر آتے ہیں۔

فنون لطیفہ دنیا کی مہذب قوموں پر مستقل بالشان اثر ڈالتے ہیں۔ ایک سیاح جو روس و جاپان کی جنگ میں موجود تھا اور جسنے کچھ زمانہ جاپان میں بسر کیا ہے۔

بیان کرتا ہے کہ جاپانیوں کی اسقدر نمایاں ترقی کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہر ایک جاپانی اپنی فطرت کے لحاظ سے شاعر ہے اور قدرتی حسن کا دلدادہ ہے۔ مثلاً جاپانی کسان جو کسی کھیت کے بونے میں مشغول ہے، ہر ایک درخت، ہر ایک پھل، ہر ایک پھول اور ہر ایک پرند میں قدرتی حسن کا جلوہ محسوس کرتا ہے۔ اس نظارہ سے اُس کی محنت ہلکی اور اُس کا کٹھن کام آسان ہو جاتا ہے، وہ قدرت کی جو نیرنگیاں رات دن دیکھتا ہے، اُن سے اُس کی زندگی پُر لطف ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب ایک جاپانی سپاہی تلوار اُٹھاتا ہے تو وہ اُس تلوار کے جوہر میں اپنے نامور اسلاف کے کارناموں کی تصویر دیکھتا ہے۔ وہ تلوار کو ہلا کر خیال کرتا ہے کہ اُسکے بزرگوں نے اسی سے جاپان کے دشمنوں کی چلیاں گرائی ہیں اور اُن کو موت کے گھاٹ اُتارا ہے۔ وہ بھی چاہتا ہے کہ اس سے کام لے اور اپنے بزرگوں کا نام زندہ کرے اور جاپانی خون کا حق ادا کرے۔ غرضکہ ہر ایک جاپانی جس طرف نظر اُٹھاتا ہے شاندار قدرتی اور تاریخی منظر اُسکے دل پر اپنی جھلکیاں ڈالتے ہیں اور اُسکے دل و دماغ کو روشن کرتے ہیں اور اُسکے مذاق کو سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ یہی جمال پرستی اور نازک خیالی ہے، جسنے جاپانیوں کو علم و عمل کے بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔

سشیلر اپنی کتاب "زندگی کی کامیابی" میں لکھتا ہے کہ "جو انسان ہر قسم کے حسن و جمال سے اثر پذیر ہوتا ہے، اُسکا مذاق تربیت یافتہ اور شائستہ ہے۔ جو شخص کوئی دلکش راگنی، یا کوئی عجیب شعر سُنکر جھومنے لگتا ہے، ہم یقین کرتے ہیں کہ اُس کی فطرت صحیح ہے اور اُسکا مذاق سلیم ہے اور اُسکا دماغ روشن ہے اور اُسکے خیالات بلند ہیں لیکن جو شخص کوئی راگ سُنکر ناک بھوں چڑھاتا ہے، یا کوئی حسین صورت دیکھکر حیران نہیں ہوتا، اُسکو ہم انسانیت کے دائرے سے خارج سمجھتے ہیں۔ کیا وہ انسان پتھر نہیں ہے، جو سورج کے طلوع ہونے کو دیکھتا ہے، مگر قدرت کے اس شاندار نظارے سے متاثر نہیں ہوتا؟ کیا وہ انسان جانوروں سے کم درجے کا نہیں ہے، جو جنگل کی سبزیوں و شادابیوں پر نظر ڈالتا ہے، مگر اُسکے دل میں کوئی امنگ نہیں اُٹھتی؟ کیا وہ انسان انسان ہے جو پانیوں کی روانی اور طغیانی، بادلوں کی بوقلمونی اور گونا گونی،

ستاروں کی چمک دمک، پھولوں اور پھلوں کی دلفریبیاں، پرندوں کی دلربا راگنیاں، آبشاروں کا جوش و خروش اور دریاؤں کے پیچ و خم دیکھتا ہے، مگر اس کی اندرونی قوتیں مردہ اور بےحس رہتی ہیں، اور اُن میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوتی"۔

شیکسپیر نے بھی ایک جگہ لکھا ہے "کیا تم گھوڑوں کو نہیں دیکھتے، جب اُن کے کانوں میں موسیقی کی موزوں اور نشاط انگیز آوازیں پہنچتی ہیں، تو وہ گردنیں اُٹھا لیتے ہیں اور جھومنے اور ناچنے لگتے ہیں اور بعض دفعہ اُن کی باگیں سواروں کے قابو سے نکل جاتی ہیں۔ جو انسان حسن و جمال کے معنی نہیں سمجھتا، وہ فی الحقیقت کچھ نہیں سمجھتا اور اُس سے کسی فائدے کی امید نہیں ہے اور اُس پر کوئی بھروسا نہیں ہو سکتا"۔

جمال ہر جمیل چیز میں موجود ہے۔ اسی جمال کے سمجھنے پر فنون لطیفہ یا جمالیات کا سمجھنا منحصر ہے۔ جمال نے صبح آفرینش سے آج تک انسانوں کے دلوں پر عظیم الشان تاثیر کی ہے، کیونکہ جمال کا اثر جسموں پر نہیں، بلکہ روحوں پر ہوتا ہے۔ اُس سے سنگدلوں کے دل موم ہو جاتے ہیں، تند اور سرکش طبیعتیں رام ہو جاتی ہیں۔ مذاق میں نفاست اور لطافت آجاتی ہے۔ مزاج میں نزاکت اور اخلاق میں حلاوت نمایاں ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ جمال کے اثر سے انسان جسمانی حالت سے گزر جاتا ہے اور روحانی دنیا کی بلندیوں پر جا پہنچتا ہے۔ طبیعت دانوں نے اس مسئلے میں اتفاق کیا ہے کہ جمال کا اثر حیوانوں پر بھی ہوتا ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ کسی انسان پر اُسکا اثر نہ ہو۔ اور جمال کا اُسکے دل میں کوئی ولولہ موج زن نہو۔ جب یہ امر مسلّم ہو چکا کہ جمال کی تاثیر خاصکر انسانی طبیعتوں پر بہت زیادہ ہوتی ہے اور یہ تاثیر اُن میں زندہ دلی، شگفتگی، نازک خیالی اور نرم مزاجی پیدا کر دیتی ہے، تو شائستہ اور مہذب قوموں کے لیے یہ ضرور ہے کہ وہ جمالیات یعنی فنون لطیفہ کو تعلیم و تربیت کا اہم جزو قرار دیں اور اپنی ترقیوں اور بلند پروازیوں کی بنیاد اُن پر رکھیں۔

بعض تنگدل اور تعصب پرست یورپین مصنفوں نے اسلام پر نکتہ چینی کی ہے کہ اُسنے فنون لطیفہ کی تعلیم کو روکا ہے اور اسی وجہ سے مسلمانوں نے فنون لطیفہ میں ترقی

نہیں کی ہے مگر اُن کا یہ خیال سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اسلام کے احکام کا صحیح اور مستند معیار جسپر تمام دنیائے اسلام متفق ہے قرآن مجید کے سوا اور کوئی کتاب نہیں ہے اس مقدس کتاب میں کہیں کوئی ایسا حکم مندرج نہیں ہے کہ مسلمانوں کو مصوری، نقاشی شاعری، موسیقی اور فن آراستگی سے پرہیز کرنا چاہیے، کیونکہ یہ فنون اُنکے لیے ناجائز قرار دیے گئے ہیں۔ احادیث میں مورتیں اور صورتیں بنانے کی جو ممانعت ہے وہ عام حکم نہیں ہے؛ بلکہ جو مورتیں اور صورتیں اُس زمانے میں بتوں اور دیوتاؤں کی بنائی جاتی تھیں اور جن کی اہل عرب پرستش کرتے تھے، یہ ممانعت انھیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ آنحضرت ایسی مسند پر جلوہ افروز ہوا کرتے تھے، جو منقش اور زرکار تھی۔ صحابہ کے پاس روم اور ایران سے ایسے کپڑے آتے تھے جو حیوانوں اور انسانوں کی تصویروں سے آراستہ ہوتے تھے اور وہ اُن کو فرش اور پوشاک اور بستر کے طور پر کام میں لاتے تھے۔ رومیوں کے سکے سونے اور چاندی کے عرب میں عام طور پر رائج تھے اور اُن پر سلاطین روم کی تصویریں منقش ہوتی تھیں۔ احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت نے مزمار اور دف پر گانے والوں کے نغمے کئی بار سُنے ہیں۔ عرب کے بعض مشہور شعرا کا کلام آپ کو یاد تھا اور آپ نے صحابہ کو اُنکے اشعار پڑھکر سُنائے ہیں۔ بعض نامور صحابی کامل شاعر تھے اور اُنکا کلام آجتک موجود ہے۔ آنحضرت ہر جمیل چیز کو پسند فرماتے تھے اور قدرت کے جمال سے متاثر ہوتے تھے۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ "عرب کے ہاشمی پیغمبر نے ہزاروں راتیں ستاروں کے حسن و جمال کا نظارہ کرنے میں بسر کی ہیں اور ہزاروں دن جنگل اور پہاڑ کے قدرتی منظروں سے لطف اُٹھانے میں گزارے ہیں۔ وہ عجیب کتاب جو اُن پر نازل ہوئی، قدرت کے عجائبات کو مطالعہ کرنے اور آسمان اور زمین کے اسرار پر غور کرنے کی تمام انسانوں کو ہدایت کرتی ہے۔ اُنکا قول تھا کہ خدا جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔"

اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام فنون لطیفہ کی تعلیم سے منع نہیں کرتا؛ بلکہ مسلمانوں کو ان فنون کے سیکھنے پر آمادہ کرتا ہے اور خود آنحضرت فنون لطیفہ کے

بڑے سرپرست اور حامی تھے۔

مسلمانوں نے مختلف ملکوں میں حکومت کی ہے اور اُنکے مختلف خاندان تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ اگر ہم مسلمانوں کی تاریخ کی ورق گردانی کریں اور اُن کو بغور مطالعہ کریں تو ہم کو دمشق، بغداد، قاہرہ اور غرناطہ کے سربفلک شاہی محل نظر آئیں گے اور اُن کو رنگ برنگ کی دلفریب تصویروں، خوشنما بیل بوٹوں اور نادر مجسموں سے آراستہ اور مزین دیکھیں گے۔ اُنکے خاص خاص کمروں میں جو طرح طرح کے شاندار اور پرتکلف سامانوں سے معمور ہیں، اونچی اونچی دلکش تانیں اُٹھتی اور اُن میں مستانہ راگنیوں کی آوازیں گونجتی سُنائی دینگی۔ ہم بہت سے محدثین اور فقہا کی زیارت کرینگے جو دینیات کے علاوہ موسیقی میں بھی کمال رکھتے ہیں اور جنکے دلچسپ حالات سے "اغانی" اور ادب کی دیگر کتابیں لبریز ہیں۔ بیشمار شاعروں سے بھی ہماری ملاقات ہوگی جو زندہ دلی اور شگفتگی کے زندہ نمونے ہیں اور جنکے اشعار بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ بہت سی مسجدیں اور عام عمارتیں نظر آئیں گی، جنھوں نے سنگ تراشی اور نقاشی کے کمال کو آئینہ کردکھایا ہے اور جنکے مفصل حالات "تمدن عرب" میں ایک فرانسیسی انشا پرداز نے قلم بند کیے ہیں۔ بہت سے کپڑے اور کتابیں اور برتن اور عام استعمال کی چیزیں ہماری نظر کے سامنے آئیں گی، جن پر انسانوں، جانوروں اور گلدار پودوں کی تصویریں نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے منقوش کی گئی ہیں۔ غرضکہ جدہر نظر اُٹھائینگے یہ امر صاف طور پر روشن اور بیّن نظر آئیگا کہ مسلمانوں کو فنون لطیفہ یا جمالیات سے خاص دلبستگی ہے اور اُن کی ہر صنعت اور ہر کام سے اُن کی زندہ دلی، نازک خیالی، لطافت پرستی اور نفاست پسندی نمایاں ہے۔ اس دل خوش کن نظارے سے یورپ کے تنگدل انشا پردازوں کا یہ اعتراض بھی باد ہوا ہو جائیگا کہ مسلمانوں کو فنون لطیفہ سے کوئی دلبستگی نہیں رہی اور اُنھوں نے ان فنوں کے دائرے میں کوئی وسعت پیدا نہیں کی۔ تاریخی صفحات سے عبور کرنے کے بعد موجودہ زمانے کے مسلمانوں پر نظر ڈالنی لازم ہے۔ ہندوستان کے مسلمان علماء، جو تاریوں کی شدت آمیز فقہ کے نشے میں شا

ہیں، اکثر فنون لطیفہ سے ناک بھوں چڑہاتے ہیں اور مسلمانوں کو دو ہزار برس پیچھے ہٹا کر اُس زمانے میں لیجانا چاہتے ہیں، جبکہ عرب میں ظلمت چھائی ہوئی تھی اور اسلام کا آفتاب عالمتاب ابر میں نہاں تھا اور مسلمانوں کا شاندار تمدن عدم سے وجود میں نہیں آیا تھا اور اہل عرب وحشیانہ حالت میں زندگی بسر کرتے تھے اور اپنی جہالت اور اوہام پرستی پر فخر و ناز کے نعرے بلند کرتے تھے؛ مگر ہندوستان کے سوا دیگر بلادِ اسلامیہ کا یہ حال نہیں ہے۔ مصر اور ٹرکی کے عجائب خانے ہم کو زمانۂ قدیم کے بتوں اور دیوتاؤں کے دلفریب مجسموں سے بھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان ملکوں کے کتب خانوں میں ہزارہا مرقعے ہیں، جن میں نظر فریب تصویریں جمع کی گئی ہیں اور ہزار ہا کتابیں ہیں جنکے صفحات زرکار اور تصویروں سے مزین ہیں۔ کتابوں اور مرقعوں کے علاوہ بہت سے اخبار اور رسالے ان ملکوں سے نکلتے ہیں، جن میں عکسی تصویریں شائع کیجاتی ہیں۔ اور یہ تصویریں آلات، عمارات، نباتات، حیوانات اور انسانوں کی ہوتی ہیں بعض شہروں میں تھیٹر بھی ہیں، جہاں دنیا کے مسرت خیز اور درد انگیز واقعات مجسم اور زندہ کرکے دکھائے جاتے ہیں۔ جہاں بڑے بڑے نامور موسیقی داں آتے اور ترکی و عربی نغموں سے حاضرین کو محظوظ کرجاتے ہیں۔ مصر میں عنقریب ایک تعلیمی کانفرنس منعقد ہونے والی ہے، جس میں منجملہ دیگر مضامین کے فنون لطیفہ کی تعلیم پر بھی خاص طور سے بحث کیجائے گی۔ ایران میں بھی عنقریب ہر شہر میں ایک اوپیرا ہوس قائم کیاجائیگا اور ایران کے نوجوان طلبار کو اس ملک کے مدارس میں مصوری اور نقاشی کی تعلیم بھی دیجائے گی۔ افغانستان میں بھی فنون لطیفہ کو زندہ کرنے کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔

اس عام ولولے اور جوش کے زمانے میں، جبکہ اسلام ہر طرف بیدار نظر آتا ہے اور ہر ملک کے مسلمان قدیم تعصبات اور اوہام کی زنجیروں سے آزاد ہو رہے ہیں اور یقین کرنے لگے ہیں کہ اسلام کسی علم اور کسی فن کی تعلیم سے مانع نہیں ہے اور زمانۂ حال کے تمدن اور مسلمانوں کے قدیم تمدن میں ایک طرح کی مشابہت ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو لازم ہے کہ فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کریں اور انکے ذریعہ سے اپنے

مذاق کو پاکیزہ اور شائستہ بنائیں، اپنے دل و دماغ کو روشن کریں، اپنے خیالات کو بلندی پر لیجائیں اور اپنے جذبات کو سانچے میں ڈھالیں۔

"فنون لطیفہ اور اسلام" کے عنوان سے عرصہ ہوا، ایک مضمون "معارف" جلد اول میں شائع کیا گیا تھا؛ مگر افسوس ہے کہ اسکے بعد پھر کسی مضمون نگار نے اس ضروری مضمون پر اپنی توجہ مبذول نہیں کی اور مسلمان نوجوانوں کو ان فنون پر مائل نہیں کیا۔ ہم چاہتے ہیں کہ "اردو ے معلے" کے وہ مضمون نگار بھی جنکو فنون لطیفہ سے دلچسپی ہے ان عنوان پر قلم فرسائی کریں۔

وحید الدین سلیم

ہندوستان کے روحانی لیڈر

انگریزی تعلیم کا نہایت برا اثر ہندوستانیوں پر یہ بھی ہوا کہ تعلیم یافتہ گروہ نے روحانی لیڈریوں کے ساتھ تعلق چھوڑ دیا۔ اور ان کو نظر حقارت سے دیکھنے لگے۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ پھر انھیں روحانی لیڈروں کے روبرو ہم زانوے ادب تہ کرکے بیٹھیں اور ہندوستان کی تالیف کے دور کرانے میں انسے امداد کے خواستگار ہوں ان روحانی لیڈروں کا تعلق عوام الناس کے ساتھ ہے اور عوام الناس کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور ان کی ذہنی حالت پر انکو آگاہ کرنیکا اس سے زیادہ آسان طریقہ کوئی نہیں کہ تعلیم یافتہ گروہ میں سے ہندو مسلمان ایک مختصر سا ڈیپوٹیشن بنا کر ان حضرات کی خدمت میں حاضر ہوں اور دو چار موٹی موٹی باتیں انکے پیش کرکے ملتجی ہوں کہ ان باتوں کی تلقین اپنے مریدوں یا زیارت کرنے والوں یا وعظ سننے والوں کو کیا کریں۔ یہ کام اور بھی زیادہ آسان ہوسکتا ہے۔ اگر ہر ایک ضلع کی ایسوسی ایشنیں اپنے اپنے ضلع کے ہندو مسلمان سکھ روحانی لیڈروں کی خدمت میں حاضر ہونا اپنے ذمہ لیں۔ ہندوستان کا افلاس انکے پیش کریں اور اسکے دور کرنے کی تدابیر پر ان کو مطلع کریں۔ سردست دو مسئلے ہی کافی ہونگے ایک یہ کہ ہندو مسلمان آپس میں اتفاق کریں

اور ایک دوسرے کی دل آزاری نہ کریں بلکہ دلداری کریں۔ دوم اپنے ملک کی چیزیں استعمال کرنے کی طرف رغبت کریں۔ ان باتوں کی تعلیم عوام الناس میں روحانی سرگروہوں کے ذریعے نہایت آسان اور موثر ہوگی۔

پولیٹکل تعلیم بھی اس ذریعے سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ اس ذریعے کو بہت جلد اختیار کرنا چاہیے اور روحانی لیڈروں کی قدر دل میں بٹھا کر انسے اس کام میں امداد دینی چاہیے۔ جس شخص کا کچھ بھی اثر عوام الناس پر ہو اسکو اپنے ساتھ شامل کرنا چاہیے اور اسکے ساتھ عزت سے پیش آنا چاہیے۔ اس قسم کے لوگ بڑا کام کرینگے اور بڑی جلدی کرینگے۔ ٹھاکر دواروں، گوردواروں، خانقاہوں میں جن کی طرف عامہ خلائق کا رجوع ہے۔ صبح شام یہ تعلیم دیجا سکتی ہے اور بہت سے ایسے بے نفس آدمی پائے جاتے ہیں جو بغیر کسی طمع اور لالچ کے مذہبی تلقین کرتے ہیں۔ سیالکوٹ میں ایک سکھ فقیر صاحب تشریف لائے۔ نہایت متبرک صورت اور بالکل بے سروسامان تھے۔ کوئی طمع یا لالچ انھیں نہیں تھا۔ آپ اس دھن میں شہر بشہر اور دہ بدہ پھر رہے تھے کہ حقہ نوشی کی ممانعت کریں۔ آپنے عہد کیا تھا کہ سوا لاکھ حقہ توڑنا ہے۔ آپ کا اثر اس قدر تھا کہ اکثر حقہ پینے والے حقہ توڑ دیتے تھے اور نہیں تو انکے سامنے ضرور چھپا لیتے تھے۔ تلقین آپ کی یہ تھی کہ "اسی دنیا میں ہو اور دوزخ میں پڑے ہوئے ہو" کیوں نرگ میں جاتے ہو وغیرہ وغیرہ۔

اگر اس قسم کے لوگوں سے کہہ دیا جاوے کہ حقہ کی ممانعت کے ساتھ ساتھ وہ سودیشی اور پولیٹکل تعلیم بھی لوگوں کو دیا کریں تو کتنی جلدی عوام الناس میں یہ تعلیم پھیل سکتی ہے۔ یہ لوگ دنیاوی قیود سے آزاد ہوتے ہیں۔ سازش کی انھیں ضرورت نہیں ہوتی۔ جو یہ منہ سے کہتے ہیں اپنے عملی نمونہ خود بنا کر دکھاتے ہیں۔ اسوجہ سے عوام الناس پر انکی بات کا زیادہ اثر پڑتا ہے۔ آو اس قسم کے بے نفس اور پاک سرگروہوں کے پاؤں پڑیں۔ متبرک مقامات میں سجدے کریں اور اس طرح اہل ملک کو انکے اصلی فرائض سے آگاہ کر کے ملک کو آسودہ اور خوشحال بنائیں۔

غلام قادر خان فصیح

(ماخوذ از پنجاب جرنل - سیالکوٹ)

قومی شاعری

جب کوئی شعر کسی وطن پرست شاعر کے دماغ سے نازل ہو کر عالم وجود میں آتا ہے، تو وہ دنیا میں ایک نئی چہل پہل پیدا کرتا ہے، نوع انسان کی روحوں کو ترقی کی بلندی پہنچاتا ہے اور خوبیوں اور نیکیوں کو کرۂ زمین کی سطح پر پھیلاتا ہے۔

بدیوں اور گناہوں کی فوجیں اُسکے سامنے سے شکست کھا کر بھاگ جاتی ہیں، مصیبتوں اور تکلیفوں کو وہ جلاوطن کرتا ہے اور ناامیدی اور ناکامی کے اسباب سے لڑتا اور اُنکو ذبح کر ڈالتا ہے۔

وہ ایک روشنی ہے! مگر اس دنیا کی روشنیاں اُسکے سامنے ماند ہیں؛ اُس کی زبان مادی اور جسمانی دنیا کی زبانوں سے بالکل جدا ہے، وہ روحوں پر جمال الٰہی کی جھلکیاں ڈالکر اُن کو جنبش میں لاتا ہے اور انسان کو تمام آسمانوں کی سیر کراتا ہے۔

تم اُسکو دیکھتے ہو! مگر ان آنکھوں سے نہیں، تم اُسکو سنتے ہو؛ مگر ان کانوں سے نہیں وہ ایک نور ہے، جو تم پر خدا کی طرف سے نازل ہوتا ہے اور تم کو خدا کے قریب لے جاتا ہے، اُسکی مدد سے تم خداشناسی کے سمندر میں تیرنے لگتے ہو، جمال الٰہی کو پہلے سے زیادہ پہچاننے لگتے ہو اور خدا کے اسرار سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہو، تم جب شعر کے دریچے سے جھانک کر دیکھتے ہو، تو زندگی تم کو سراسر بہار نظر آتی ہے اور دنیا کے لوگ فرشتوں کے لباس میں دکھائی دیتے ہیں اور دنیا کی تمام چیزیں اُن پر لطف جذبات کے مطابق نظر آتی ہیں، جو اس شعر سے تمہارے دل میں موجزن ہوئے ہیں!!

زندگی خوشگوار نہیں ہو سکتی، جب تک کہ شعر اُسکو خوشنما کر کے نہ دکھائیں، نیچر کی خوبیاں تمہارا دل نہیں لبھا سکتیں، جب تک کہ شعر اُسکے حسن و جمال کی تصویر کھینچ کر نہ دکھائیں، قوم کی محبت تمہارے دلوں میں پیدا نہیں ہو سکتی، جب تک کہ شعر تمہارے اندرونی جذبات کو نہ اُکسائیں۔ بلاشبہ قومی شعرا دنیا کے لوگوں کے پیشوا اور ہادی ہوتے ہیں۔

(ترجمہ الّلوا ماخوذ از انسٹیٹیوٹ گزٹ)

ایک خط ایسے مصنف کے نام جو سخت دماغی محنت کا عادی تھا (نمبر ۱)

(ترجمہ از پی۔ جی۔ ہمرٹن)

ممکن ہے کہ دماغی محنت کے بہترین نتائج کا اظہار براہ راست نہو۔ یعنی خود اُس کام کے ذریعے سے تکلیف نہ پہونچے۔ تاہم ہر وقت کا بیٹھا رہنا، ورزش یا کام میں ردّ و بدل اور تفریح کا نہونا بھی ضرر پہنچانے کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔

ایسا کم دیکھنے میں آیا ہے کہ دماغی محنت کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی صحت بھی قائم رہے۔ البتہ خواہشوں اور ارادے کی کوشش سے بعض اوقات ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ ورڈس ورتھ کشادہ اور ہوادار مقام میں چہل قدمی کرتے ہوئے شعر کہتا تھا اور اس طرح اُسنے اپنے کو میز کے پاس قید رہنے کی مضرت سے محفوظ رکھا۔ مسٹر ڈبلو۔ ایف۔ اے۔ ڈی لین۔ جب خبار ٹائمس کے مہتمم تھے تو اُسکے لیے لندن اور اُسکے نواح سے مقدمات کی رپورٹیں لایا کرتے تھے۔ اُنکے اور ہم پیشہ لوگ اُن کو نہایت تندرست دیکھکر حیران ہوتے تھے۔ لیکن وجہ اُسکی یہ تھی کہ وہ عدالتوں میں بیٹھکر کام کرنے اور خراب ہوا کی تلافی کے لیے ایک قصبہ کی عدالت سے دوسرے قصبہ تک گھوڑے پر سوار ہو کر جایا کرتے تھے۔ نیز یہ کہ وہ اپنی زندگی معمول سے زیادہ اعتدال کے ساتھ بسر کرتے تھے کیونکہ وہ قانون پیشہ لوگوں کی دعوتوں سے بالکل پرہیز کرتے تھے۔ اور صرف وہ چیزیں کھانے پینے میں رکھتے تھے جلسے صحت قائم رہے۔ اگر وقتاً فوقتاً ورزش ہوتی ہے اور پرہیز کی عادت ہو تو آدمی مضر صحت مشقت بھی برداشت کر سکتا ہے۔ عام طور پر جو یہ طریقہ رائج ہے کہ چند روز کی ورزش سے سال بھر کی صحت کا انتظام کیا جاتا ہے اس سے مسٹر ڈی لین کا طریقہ صحت وری بدرجہا بہتر ہے کہ ہر ہفتہ کی صحت کا سامان اُسی ہفتہ کے اندر فراہم ہوتا چلا جائے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کسی اخبار کے مہتمم نے جارج سینڈ کا ایک ناول بہت ہی جلد طلب کیا یہ بڑے اطمینان کے ساتھ کام کرنے کی عادی تھیں اور ہمیشہ انھیں یہ خواہش رہتی تھی کہ

کتاب کی تیاری میں ضرورت کے موافق پوری محنت کیجاے - چنانچہ جیساکہ ایمانداری سے کام کرنیوالونکا قاعدہ ہے، ان کو بھی تقاضے کی برداشت نہیں ہوتی تھی - بہرحال اس موقع پر مقررہ اوقات سے زیادہ کام کیا لیکن اس کثرت کار کی وجہ سے وہ کچھ کام رات کو کرلیتی تھیں - تاکہ دن کے کئی گھنٹے وہ اپنے سکونت کے دیہات میں چہل قدمی میں صرف کرسکیں - ایسے وقت پر کوئی اور مصنف ہوتا تو کچھ روز کے لیے ورزش ترک کردیتا - لیکن جارج سینڈ نے اُس زمانے میں اور بھی زیادہ ورزش کا لحاظ رکھا کیونکہ اسوقت اُن کو تندرست رہنے کی خاصکر ضرورت تھی - اسی طرح سروالٹر اسکاٹ بھی نشستی کام کے نتائج کی تلافی کے لیے بڑے شوق سے میدانی کھیلوں میں شریک ہوتے تھے - یہ بھی خیال کیا گیا ہے کہ اُن کی اس میدانی ورزش سے، جو کمزور آدمیوں کے نزدیک بہت زیادہ تھی، اُنکے لقوے میں اعانت ہوئی ہو جس سے وہ اخیر میں بیکار ہوگئے - لیکن حق یہ ہے کہ جب اُن کو لقوے نے مارا ہے اسوقت وہ اور کاموں کو ضروری سمجھکر اپنے عادات کو بدل چکے اور سابق کی تفریحوں کو ترک کرچکے تھے - میرا یہ خیال ہے کہ اسقدر ورزش کو اُنکا توانا جسم بلا کسی مضرت کے ضرور برداشت کرنے کے قابل تھا - بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جب وہ اسقدر محنت تصنیف و تالیف میں کرتے تھے تو اُنکے نظام اعصاب کی صحت کے لیے اسقدر ورزش غالباً لابدی تھی - ابتک جسقدر تحقیقات ہوئی ہے اُسکی رو سے اگر مزاج میں برداشت کی کافی قوت ہو تو ورزش جسمانی سے بہتر نظام اعصاب کی تسکین دینے والی کوئی دوسری چیز نہیں ہے - اور اس لحاظ سے سروالٹر کا جو طرز زندگی مقام ایبٹس فورڈ میں تھا وہ بود و باش کے اصلی فلسفے پر مبنی تھا - فرانسیسی انسانہ نویس یوجین سو دس بجے دن تک لکھتا تھا - باقی سارا دن گرگاؤں والے مکان پر ہوتا تھا تو سواری میدانی کھیل یا باغبانی میں صرف کرتا تھا - اور اُن تمام باتوں میں اُسکا شوق خبط کے درجے تک پہنچا ہوا تھا - شیلی کو کشتی رانی کا شوق تھا جسمیں اُسکے پٹھوں کی ورزش فوراً ہوجاتی تھی - اور ہر وقت کی ایجاد اور تصور کا تکان دل سے جاتا رہتا تھا - عام طور پر یہی دیکھا جائیگا کہ اگر کسی عالی دماغ شخص کے قوی پوری مستعدی کے ساتھ درست ہیں تو یہ ضرور ہوگا کہ وہ ہر وقت کے بیٹھے رہنے کے مضر نتائج سے پرہیز بھی رکھتا ہوگا -

مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر کوئی شخص قدرتاً توانا ہو اور قوی اور روشن دماغ بھی رکھتا ہو تو وہ مسلسل کئی سال تک بارہ چودہ گھنٹے روزانہ کام کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسقدر کام کے بعد اپنی تفریح ورزش اور سونے کیلیے بھی کافی وقت نکال لے۔ لیکن ورزش کے نہونے سے قوائے ہاضمہ وجاذبہ کمزور ہو جائینگے جنکی وجہ سے صالح خون دماغ تک نہ پہنچ سکیگا۔ اور دماغ کو بہت زیادہ خون کی ضرورت ہوتی ہے، خاصکر جبکہ دماغی محنت میں اسکا صرف زیادہ ہو۔ اس خرابی سے ضعف اعصاب کی شکایت عموماً پیدا ہو جاتی ہے جو حد سے زیادہ دماغی کام کرنیوالوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہ بھی قدرت کی بڑی عنایت ہے کہ وہ اس ضعف اعصاب کے ذریعہ سے ہم کو آگاہ کر دیتی ہے تاکہ اگر وقت پر توجہ ہو جائے تو ہم بہت سے خطرناک نتائج سے محفوظ رہیں۔ اس کی سب سے بہتر روک اور علاج یہ ہے کہ اعتدال کے ساتھ خوب ورزش کیجائے

جن لوگوں میں قوت تخیل بہت زبردست ہوتی ہے وہ عموماً ایک نہایت خطرناک عادت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ ان کا کام گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کا سا ہوتا ہے۔ یعنی کم وقت کے اندر بے انتہا کوشش جس سے اُنکے تمام قوی پر بیحد زور پڑتا ہے۔ بلفورڈنے ویتھلک کا عجیب و غریب افسانہ تین دن اور دو راتوں کی ایک نشست میں لکھا۔ اُسوقت اُس کا سن ... برس کا تھا۔ اس محنت کا اثر اُس کی صحت پر نہایت خراب پڑا۔ اور وہ ایک نہایت سخت مرض میں گرفتار ہو گیا۔ بائرن کی بھی بعض بہترین نظمیں اسی قدر تیزی کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔

ایسی حالت میں فطرت کی طرف سے خود علاج ہو جاتا ہے یعنی قوتِ خیال کے کاہل ہو جانے سے گویا اُسے اتنے دن کے لیے تعطیل ہو جاتی ہے اور زائل شدہ طاقت عود کر آتی ہے۔ گوشتخوار جانوروں کی جسمانی مستعدی بھی اسی قانون کی پابند ہے۔ یعنی اُن کی غیر معمولی کوشش کی حالت کے قائم رہنے یا زائل شدہ قوت کے واپس آنے کے لیے ضروری ہے کہ درمیان میں انکو بالکل سکون بھی حاصل ہوتا رہے۔

جب دماغ کو آرام کرنیکا طویل وقفہ ملتا ہے تو اُسوقت کے اندر تخیل کی تازگی تفریح کے ذریعے سے ہوجاتی ہے۔ چنانچہ انگلستان میں اسی قسم کی تفریح میں جسمانی ورزش ہی شامل سمجھی جاتی ہے۔ صاحب دماغ لوگوں کی اس دماغی کاہلی سے بسا اوقات اُنکی صحت محفوظ رہتی ہے بشرطیکہ ضرورت اُن کو میلان طبیعت سے زیادہ کام کرنے پر مجبور نہ کرے۔ تھکا ہوا دماغ سخت محنت کا مزید تکان کبھی از خود نہ مول لیگا۔ آدمی کو اپنا تکان معلوم ہوجاتا ہے کہ اُسوقت طبیعت خود بخود آرام اور تفریح کی خواہاں ہوتی ہے۔ اسلیے انسان کو چاہیے کہ اپنی زندگی کے لیے ایسے قواعد مرتب کرے کہ کبھی کبھی دل کی قدرتی خواہش پر بھی عمل کیا جائے۔ اور کم از کم تھوڑی دیر کے لیے اس محنت کا خیال ہی دل سے نکالدیا جائے جس سے سخت تکان پیدا ہوتا ہو۔ یہاں تکان سے مراد وہ جسمانی تکان نہیں ہے جو گہری نیند کا پیش خیمہ ہوتا ہے بلکہ دل و دماغ کی وہ خستہ حالت مراد ہے جبکہ ہجوم خیالات باعث تکلیف ہوجاتا ہے۔ یعنی نہ تو اُن خیالات کا اظہار ہو سکتا ہے اور نہ وہ فراموش ہو سکتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام رات جاگتے اور پریشان خیالی کا مقابلہ کرتے گذر جاتی ہے۔ فقط

اضطراری فوائد کا شکریہ ضروری نہیں ہے

ہم اس آرٹکل میں یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ اگر برٹش حکومت ہند سے کچھ فوائد مترتب ہوئے بھی ہیں تو اُن کی حیثیت محض اتفاقی یا اضطراری فوائد کی ہے جنکی بابت کسی پارٹی یا گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ انگریزی تعلق سے ہندوستان کو کیا کیا فائدے پہنچے ہیں۔ بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا اہل ہند کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کا برتاؤ نیک نیتی پر مبنی تھا یا نہیں۔

مثال

کے طور پر فرض کیجیے کہ زید عمر سے کسی خاص وقت اور مقام پر ملنے کا وعدہ کرتا ہے۔

اور بغرض ایفائے وعدہ جب وہ مقام مقررہ کو جاتا ہے تو اثنائے راہ میں اُسے خوش قسمتی اشرفیوں کی ایک تھیلی پڑی ملتی ہے۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر زید نے عمر سے ملنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا تو اُسے تھیلی نہ ملتی لیکن کیا اپنی اس خوش قسمتی کے لیے اُسے عمر کا شکرگزار ہونا ضروری ہے۔

دوسری مثال لیجیے کہ زید۔ عمر کو ایک پُرتکلف دعوت میں مدعو کرتا ہے لیکن اسکا ارادہ یہ ہے کہ عمر کو زہر دیدے۔ عمر دعوت کو قبول کر لیتا ہے لیکن غلطی سے زہر والی رکابی اُسکے سامنے نہیں آتی۔ وہ واقعی خوب سیر ہو کر کھانا کھاتا ہے اور آخر میں نہایت بہ نیت میزبان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

لیکن اگر عمر کو زید کے ارادہ فاسد کا حال معلوم ہوتا تو کیا اُس وقت بھی اسے عمر کا ممنون ہونا لازمی تھا؟

تیسری مثال یہ لیکر۔ راستے میں بجائے تھیلی پانے کے زید ناگہانی طور پر ٹھوکر کھا کر گر پڑتا اور اُسکا پیر ٹوٹ جاتا تو اس حادثے کا الزام بھی وہ عمر پر نہ رکھتا۔ غرضکہ اتفاقیہ امور میں شکرگزاری یا الزام کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔

تعلیم اور ریلوے وغیرہ سب اتفاقیہ فوائد ہیں

کہا جاتا ہے کہ اہل ہند اس تعلیم کے لیے ممنون ہیں جو برٹش حکومت نے انکو دی ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ مدعا گو یہ گمان ہرگز نہ تھا کہ اسکے طرز تعلیم سے لوگ ہندوستان میں اسکی اقتدار کے دشمن پیدا ہو جائیں گے اگر اس طرز تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے تو یہ ایک محض اتفاقی امر ہے جو انکی منشاء کے بالکل خلاف نکلا کیونکہ وہ ہندوستان کو ہمیشہ ماتحتی کی حالت میں رکھنا چاہتے ہیں۔ برٹش سلطنت جو اہل ہند کو انگریزی طریقے پر تعلیم دیتی ہے اسکی ظاہری وجہ یہ ہے کہ صرف تھوڑے سے چند انگریز ہندوستان کے سے وسیع ملک پر بلا اعانت اُن ہندوستانیوں کے حکومت نہیں کر سکتے جنکی تعلیم اپنے اجنبی آقاؤں کے خیالات کے مطابق

ہوئی ہو۔ مگر اس قسم کی تعلیم سے ہی طبیعتوں میں اغیار کی محکومی سے برگشتگی ضرور پیدا ہوگئی ہے اسلیے جو نفع اس تعلیم سے پہنچا وہ محض اتفاقی ہے۔ اسکی وہی مثال ہے کہ خالد بکر پر طپنچہ فائر کرنا چاہتا ہے۔ اتفاق سے طپنچہ خالد کے ہاتھ سے چھوٹ پڑتا ہے اور بکر اسکو اُٹھا کر خالد ہی پر سیدھا کرتا ہے تو بکر خالد کی اس عنایت کا ممنون نہیں ہوگا کہ اُسنے بکر کو طپنچہ دے کر اُس کی جان بچائی۔

ریل اور تار بھی اسی قبیل کی نعمتوں میں سے ہیں جو ہندوستان کو انگریزی عہد میں نصیب ہوئی ہیں۔ جس شخص نے تاریخ ہند کا مطالعہ کیا ہے اُسکو معلوم ہے کہ ریلوے کے اجراء میں لارڈ ڈلہوزی کے دو مقصد تھے۔ اوّل تو یہ کہ فوج کی آمد و رفت بآسانی ممکن ہو۔ دوسرے یہ کہ انگریزی تجارت کو فروغ ہو۔ سر ولیم ہنٹر نے "امپیریل گزیٹیر آف انڈیا" میں لکھا ہے کہ لارڈ ہنڈ کور کی تجویز یہ تھی کہ عمدہ عمدہ سڑکیں تیار کردی جائیں کہ جنسے تمام بڑے بڑے شہروں اور تمام چھاونیوں کا سلسلہ ملجائے۔ اب اگر اس ریل اور تار سے ہندوستانیوں کو بھی کچھ نفع پہنچتا ہے تو وہ محض اتفاقی یا اضطراری ہے۔ خاصکر اس لحاظ سے کہ اگر ہندوستانی ریل سے محروم رکھے جائیں تو ریلوے لائنوں کی آمدنی اُنکے اخراجات کے لیے ہرگز کافی نہ ہو۔

انگلستان میں اٹھائیس ہزار میل ریل ہے۔ ان میں سے ایک میل بھی سرکاری نہیں ہے اسلیے اہل انگلستان سے ریل کے حساب میں کچھ ٹیکس نہیں وصول کیا جاتا۔ برخلاف اسکے ہندوستان میں ہر شخص ریلوے کے قیام کا ذمہ دار ہے خواہ اُسنے کبھی ریل کی صورت بھی نہ دیکھی ہو اور پھر ریل سرکاری ملکیت۔

انگلستان کی بدنیتی

ایک اینگلو انڈین افسر۔ ڈپٹی سرجن جنرل بالسکے کا یہ قول صحیح ہے کہ "انگلستان کے تمام فتوحات و الحاقات کی بنا دنائت و خود غرضی پر ہے"

اس حالت کو مسٹر دادابھائی نوروزجی سے زیادہ صفائی کے ساتھ کسی نے نہیں بیان کیا ہے۔ آپ نے دسمبر ۱۹۰۵ء میں بمقام والورتھ اپنی اسپیچ میں بیان کیا کہ انگریزوں نے لوگوں کو ایک دوسرے کو لوٹنے سے اسیلیے باز رکھا کہ وہ خود سب کچھ لوٹ لیں۔ اور پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہم نے ہندوستانیوں کے جان و مال کے لیے امن پیدا کر دیا اور اُنکو ہمارا ممنون ہونا چاہیے بیشک اُنھوں نے اس قسم کا امن پیدا کر دیا لیکن اسی لیے کہ وہ بے دغدغہ سارا مال خود لیجائیں جان کی اماں کے بارے میں کہاجاتا ہے کہ مشرق کے قدیم خود مختار حکمراں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قتل اور رعایا کو پریشان کیا کرتے تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے تھے تو اُسوقت انگریزی حکومت بھی بڑی نفرت اور بے خطا اُصول کے ساتھ لاکھوں آدمیوں کو قحط و طاعون کے ذریعے سے فنا کیے دیتی ہے۔ اور کروروں کو فاقوں مارے ڈالتی ہے۔ اینگلو انڈین یعنی انگریز اُن ہوشیار سرجنوں کے مثل ہیں جو نہایت ہی تیز نشتروں سے دل تک شگاف دیجاتے ہیں۔ اور سارا خون اس طرح نکال لیتے ہیں کہ بظاہر خراش کا نشان بھی نظر نہیں آتا!"

ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزی حکومت ہند کے اغراض میں خلوص نیت ابتدا ہی سے نہیں ہے۔ کیونکہ ان اغراض کی بنا طمع زر اور ہوس اختیار پر قائم ہوئی تھی۔ اسلیے کوئی وجہ نہیں کہ اہل ہند کو اگر کوئی نفع برٹش حکومت سے اتفاقی طور پر حاصل ہو جائے تو وہ اسکے ممنون بھی ہوں۔ فقط — ترجمہ از انڈین سوشیالوجسٹ لندن

انتخاب بیاض خان بهادر میرزا ناصر علی صاحب رئیس فرخ نگر

میرزا جلال اسیر

از عکس تنت جیب قبا آئینه زارست　　پیراهن از اندام تو لبریز بهارست

شوکت

دیگر دلم براه خرام کسی نشست　　رنگ از رخم پرید و ببام کسی نشست

اهلی شیرازی

چو دل بوصل نهم جور یار نگذارد　　چو یار رحم کند روزگار نگذارد

که آب خضر بهم طبع سلیم ماست　　ما و شراب کهنه که یار قدیم ماست

شوخی که می نخورده دل خلق خون کند　　آوازه دمی که چهره زمی لاله گون کند

سخن چه حاجت اگر دل مقابل افتادست　　زبان چه کار کند کار با دل افتادست

زمانه دشمن و من بی زبان بخت زبون　　تو رحم اگر نکنی کار مشکل افتادست

مرا ز محیط محبت همین نشان دیدم　　که استخوان شهیدان بساحل افتادست

بی تو چو شمع کرده ام گریه و خنده کار خود　　خنده بعهد سست تو گریه بروزگار خود

کاتبی

دارم گمان که او بمن ناتوان خوش است　　این قصه گرچه نیست یقین هم گمان خوش است

ضمیری اصفهانی

چه حیاست اینکه گاهی اگرم ز حال پرسی　　بهزار رنگ گردی بصد انفعال پرسی

میرزا جلال اسیر

هر عارض افروخته مشاطهٔ ناز یست　　هر جنبش مژگان چمن آرای نیازیست

گلزار نسب نامهٔ یاران عزیز است　　هر فاخته محمودی و هر سرو ایازیست

فقط

هندو مسلمان در هندوستان

نمبر ۱

بر روی زمین عدد مسلمین به سی کرور نفوس (۳۰۰،۰۰۰،۰۰۰) میرسد گویا مسلمانان پنجم حصهٔ افراد نوع بشر اند تقریباً زیاده از نصف این اعداد در حمایت حکومتهای غیر اسلامیه هستند۔ هیچ ملک در دنیا نیست که در آن عدد مسلمانان آنقدر باشد که در هندوستان است عدد مسلمانان در هندوستان هفت کروڑ (۷۰،۰۰۰،۰۰۰) میرسد۔ پس اصلاح و فلاح مسلمانان عالم منوط است باصلاح و فلاح مسلمانان هند۔ زیراکه چنین جم غفیر از ایشان در دیگر ملک در یکجا موجود نیست و نجات و حیات مسلمانان هند وابسته شده است باتحاد و مماشات با سایرین اهل وطن خود و شان از هنود و غیرهم۔ موضوع این مقاله که بالخصوص برای التفات اهل عظام و دیگر ارباب بصیرت از اسلامیان هند بزبان فارسی هیئت اجتماعی گرفته همین مسئلهٔ عظیم الشان است۔ در صفحات ذیل توضیح حسب اذعان و وجدان کمینه عرضه دارم

مسلمانان هند دو فرض واجب الادا بر ذمهٔ خود دارند۔ یکی فرض وطنی است دوم فرض دینی۔ حب وطن مقتضی است که انسان در خدمت وطن جان و مال را دریغ ندارد وکسی که حب وطن ندارد۔ بشهادت تاریخ هم از درجهٔ انسانیت خارج است۔ ؎

مشمار مرد کار را حب وطن نباشد   ننگ بشر همان است یعنی خدا برانیست

فرض دینی اقتضا میکند که مسلمانان هند بواسطهٔ اخوت اسلامیه مسلمانان دنیا هر کجا که باشند دوست باشند و وقت ضرورت اگر ممکن باشد اعانت کنند۔ و ادای این هر دو فرض منحصر است بیک مسلک و بس و آن مسلک عبارت است از اتحاد سیاسی با هنود هندوستان۔ حال یک سوال قابل التفات است۔ چرا اهل یورپ مردم آسیا را بنظر حقارت می بینند؟ بلکه ایشان را بهایم لایعقل می شمرند؟ سببش بودن اهل هند است۔ یک مشتی از انجا انگلیس بهندوستان آمدند۔ و ملک را باعانت اهل هند بدست آوردند و یک عده

و پنجاه سال ست که مال و متاعِ ہندوستان را بانگلستان می کشند۔ و ہر طور میخواہند قوانین اجرا می کنند و گران بارِ خراج بر سرِ مردم می نہند۔ اما اہلِ ہند ہنوز بعلمِ سیاست توجہ نکردند۔ و نکاتِ مالیات را نہ فہمیدند۔ و عادتِ کار کردن باتفاق نیاموختند۔ و شرفِ نفس ندارند۔ و دائم حکومت نگرانند و بذاتِ خود ہیچ چیزے را آغاز نمیکنند۔ لامحالہ اہلِ یورپ گمان میکنند کہ ایں مردم از تمدن بہرہ ندارند۔ بلے دریں نزدیکی زمان بعضے از سرکردگان ہنود پے برموزِ سیاست بردہ اند و مسلکِ قویم گرفتہ اند۔ ایشاں راہِ فلاح ہدایت می کنند و می گویند۔ کہ قوم را باید کہ تعلیم و تربیتِ ملت را بدستِ خود گیرد۔ و محتاجِ حکومت نباشد و زمامِ صنائع و حرف و تجارت و زراعت کہ منبعِ تمول ست نیز ملت بدستِ خود بیارد۔ و از خدماتِ حکومتِ ہند چہ ملکی و چہ فوجی احتراز باید نمود۔ و نیلِ ایں مرام موقوف است براتفاقِ ہر فرقہ و اربابِ ہر پیشہ کمپنی ہا باید ساختن۔ و اندک اندک پول را فراہم آوردن۔ و بدیانت و دلسوزی کار را پیش بردن۔ ہمیں نکتہ است کہ یورپ و امریکہ را دارائے عالم ساختہ است۔ پولِ مردم را فراہم آوردہ راہ ہای آہنی میسازند۔ و کشتیہای تجاری بنا می کنند و از بطنِ ارض جگر گوشہ ہائے معادن را بیروں می آرند و صاحبِ ثروت و دولتِ زائد الوصف می گردند۔

اگر مسلمانانِ ہند ہم ایں مسلک را اختیار کنند۔ لامحالہ ہر دو فرضِ وطنی و دینی را ادا کردہ باشند۔ وقتیکہ ہنود و مسلمانان متفق شوند۔ قوم انگلش کہ در انگلستان است زود قولِ ایشاں را بشنود۔ و استقلالِ ملک بایشاں دہد۔ چنانکہ کینڈا و اسٹریلیا را دادہ است۔ دراں صورت ہمہ اہلِ ہند چہ ہندو و چہ مسلمان مو فرگردند۔ و مسلمانانِ ہند را یارا باشد کہ برادرانِ دینی خود را کہ در دیگر ممالک ہستند اعانت کنند۔ اگر مسلمانان با ہنود تماشات نکنند۔ خود را در ورطۂ ہلاک اندازند۔ ہنود الآن در میدانِ معارف

سیاسیه و صناعیه و تجاریه قدم فرسا شده اند۔ هر چند که آهسته رو باشند هر روز تا شام از مسافت مرحلے طے می کنند۔ و مسلمانان چون جماد پا بگل افتاده هر آن از منزل دور تر می شوند۔ بے عملی و بے پروائی ایشان را بمغاک تسفل میکشد۔ و پیش از زمانِ دراز اولادِ امرا و شرفائے مسلمین را خدمتِ جاروب کشی بازارها مسلّم شود۔ نصارای یورپ کمر بر سرِ انتقام بسته و مار از روزگارِ مسلمانان بر می آرند۔ و هندوانِ وطن پرور۔ نیز از بے حمیتی ایشان بجان آمده لامحاله ایشان را دشمنانِ وطن خواهند شمرد۔ و این دشمنی آن بلاها بر سرِ مسلمانان هند خواهد آورد که مصائبیکه نصیبِ دیگر مسلمانان سرویه و بلغاریه و جزیرهٔ کریت‌ها از دستِ نصرانیان شده بمقابلهٔ آنها هیچ خواهد بود۔ اکنون وقت است که هنود و مسلمین دفاترِ جنگ و جدلِ پیشین را بآبِ نسیان بشویند۔ و مانند فرزندانِ رشید بحبلِ متینِ حبِ وطن تمسک زده پشت و پناهِ یکدیگر گردند ؎

برآ از خواب اکنون وقتِ تو سخت تنگ است — این لحظه گر نیابی تیرِ تو از کمان است

تاریخ هند درین عهدِ جدید سرچشمهٔ حیرت و عبرت است۔ چون بنیانِ سلطنت شاهی تیموریه متزلزل گشت۔ مدعیان از هر گوشه سر بر آوردند۔ و لولهٔ خود غرضی برافراختند۔ از وطن پرستی سهمے نداشتند و نه از دور اندیشی نصیبی۔ انگلیس که دوربین و مآل اندیش بود مرهته و ٹیپو سلطان و نظام الملک را از یکدیگر ببرید۔ و هر یک را تنها افگنده بشکست بر کند چنانکه مولوی رومی در مثنوی خویش قصهٔ "جدا کردنِ باغبان صوفی و فقیه و علوی را از هم" بیان فرموده است۔ در هندوستان بدست انگلیس بعمل آمد هر یک دولت را جداگانه نوبت بنوبت زبون ساخت۔ و بالآخر قهرمانِ همه هندوستان گردید ؎

"هر که تنها ماند از یاران خود — این چنین آید مر او را جمله بدن"

چون هندوستان بدست انگلیس افتاد همه روشِ عالم تبدیل یافت۔ چون بنوایا جزیرهٔ برطان بر کنوزِ غیر فانیهٔ هندوستان دارا شدند۔ همت ایشان بلند شد

دواعیهٔ جهانگیری در دماغ ایشان جاگیر گشت به پول هند لشکرها بیارآستند. واسطولهای
سفائن حربیه ساختند و بر بر و بحر کرة الارض تاختت و تاراج آوردند. اگر هندوستان
در تصرفِ انگلستان نمی بود. تسلط انگلیس بر اعظم افریقه از کیپ تا قاهره امکانی نداشت
و جزائر آسٹریلیا و بنادر چین و جزائر امریکی وغیرها بدست ایشان نمی آمد. بقوت خزائن هند
بر ملکِ مصر و سودان و یمن و خلیج فارس و ممالک اسلامیه در افریقای غربی و شرقی
قابض شده اند. همین ثروت هند هست که نخوتِ انگلیس را بآسمان رسانیده که اکنون
درپی بدست آوردنِ جزیرة العرب وارضِ قدس و ملکِ ایران پویان هست. ندیدی
که در موسمِ بهار امسال بسلطان عبد الحمید خان خلد الله ملکه پیغام تهدید فرستاده بود
که اگر سلطان معظم عسکرِ خویش را از مقام طابه باز نطلبد. حکومتِ انگلسیه بر ممالک عثمانیه
حمله آور شود. این حیله بود برای تغلب بر ملک عرب پیش از تکمیل سکة الحدید بولایت حجاز
و دیگر سکة الحدید تا بغداد. اگر شهنشاه المان. ولیم دوم بخلاف مسلک انگلیس بمعرفت کار
از دست رفته بود. حال ملاحظه فرماکه هنگام نزاع میانِ حکومت انگلسیه و حکومت
عثمانیه بر مسئله سرحدِ جزیره نمای سینا مطبوعات انگلستان چه لاف و گزاف از راه
تعلی زده بودند. نوشته بودند که حکومت برطانیه را لازم است که از علمای اسلام
در هند و مصر در بابِ حقِ خلافت بسلطان روم فتوی بگیرد. اگر سلطان عبد الحمید را
از خلافت عزل کنند. یک مسلمانی را که در حمایت انگلیس باشد خلیفه قرار دهند و نیز
اماکنِ مقدسهٔ اسلامیه را از مکه و مدینه و بیت المقدس دولت انگلسیه حامی باشد
و طرقِ حج هم در نگهبانی انگلیس باید. كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ
أَكْبَرُ دیگر نشنیدی که بیچاره بیگناهان مصری را در ماهِ جون گذشته چه بیرحمی و
وحشی گری بچوب کشیدند و بجنب معلقین بدار دیگران را بضرب سه ده تعذیب نمودند
چون مسلمانانِ مصر اظهار غضب نمودند. وزیر امور خارجیهٔ انگلستان در بابِ جوش

وخروشِ وحشیانهٔ مسلمانان افریقائے شمالی خطبه کرد۔ ولشکرِ انگلیس در ملکِ مصر ازدیاد نمود. همچنین
صد بهادرانِ اسلام را در ملکِ سقاطوانهٔ افریقائے غربی در ماهِ مارچ گذشته بشهادت رسانید
این قوت با نگلیس از کجا آمد؟ از تسلطِ ایشان بر مالیاتِ هندوستان۔ اگر امروز مالیهٔ هندوستان
از دستِ ایشان خارج شده باهتمام وضیاعِ هندوستانیان در آبادیِ هندوستان بصرف رسد
دولتِ انگلیس مانندِ بلجیک یا هالنڈ از دولت هائے کوچک گردد۔ وتسلطِ انگلیس بر مالیه
هندوستان از چیست؟ از جهتِ خلافِ میانِ هندو ومسلمان۔ ومادام که مسلمانان و
هنود بجادهٔ وفاق نمی گرایند۔ استقلالِ ممالکِ عثمانیه وایرانیه وافغانیه ومراکشیه را در معرضِ
خطر می اندازند۔ اگر بنظرِ انصاف ملاحظه کنیم همه خطا خطائے اهلِ هند است که بجهالت و
وتعصب فارغ شده سائر عالم را از ترقی باز داشته اند۔ مادام که پنجم حصهٔ نوعِ بشر به بندگی تن در
داده مشتے مردم را قدرت بفساد وغضب وجفاکاری بخشیده اند۔ حریتِ هر فردِ بشر در خطر است
اگر بجائے انگلیس قومے دیگر بودے۔ بندهٔ منشیِ اهلِ هند مر آن قوم را نیز مختل الدماغ وفاسد
الاخلاق ساخته بودے۔ در نفس الامر گناهِ انگلیس نیست۔ زیرا که پادشاهِ انگلیس در سنه ۱۸
۵۸ء بسوگندِ موکد وعده کرده است که اهلِ هند حق دارند که ادارهٔ ایشان بدستِ
ایشان باشد۔ اما چون هندیان از علمِ سیاست عطفِ عنان کرده در مغارهٔ انهماک
بفضولیات افتاده اند وبزبونی راضی شده۔ لامحاله آن حکام که برائے حکومتِ هندوستان
می آیند حسبِ اقتضای وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ (همه جانها آلودهٔ حرص وهوا
هستند) از نادانیِ هندیان انتفاع میگیرند۔ ومنفعتِ خویش را بر منفعتِ هندیان مرجح
دارند واین محض طبعی است۔ چنانکه شاعرِ جاهلیت این قانونِ فطرت را بکمال خوبی ادا کرده
است۔ میگوید:۔ وَمَنْ لَمْ يَذُدْ عَنْ حَوْضِهِ بِسِلَاحِهِ۔ يُهَدَّمْ + وَمَنْ لَا يَظْلِمِ النَّاسَ۔
يُظْلَمِ۔ (هر کس که حوضِ آبِ خویش را بزورِ شمشیر محفوظ ندارد لامحاله آن حوض بدستِ
غنیم شکسته خواهد شد۔ وهمچنین ظلمِ مردم را اگر کسی بزورِ شمشیر از خود رد نکند۔ لامحاله مردم بر و

ظلم خواهند کرد). همین قانون را وحی الٰهی هم تقریر فرموده است. وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (و از بهر مدافعهٔ ایشان (دشمنان) بقدر استطاعت خویش قوت مهیّا دارید. و اسپان را برای جنگ تربیت کنید. و این قوت شما و تهیه برای جنگ در دلِ دشمنانِ خدا و دشمنان شما رعب و هیبت خواهد انداخت (و بر شما حمله نخواهند کرد) پس اگر انگلیس همه اراضی هند را ملکِ حکومت قرار داد و بر زمین خراج گران بار نهاد یا صنائع هند را خراب نموده بر تجارتِ خارجهٔ هندوستان حاوی گشت یا بر مناصبِ جلیلهٔ ملک مردم انگلیس نژاد را تعین کرد و خدمات رذیله بمردم هند داد. یا در محکمهٔ قضا قاتلانِ انگلیس پاداش جرم نمی یابند. بالجمله این همه جور و جفاها که هندیان از انگلیس می بینند. در حقیقت نتیجهٔ جهالت و غوایتِ ایشان است. نه خطای انگلیس.

درین عصر علمِ تمولِ قومی با صولِ حکمت مضبوط شده است. اُصولِ تجارت ما بین الدول و ترقیِ صنائع و حِرَفِ ملیه بدرجهٔ غایت پیچیده و دقیق گشته. مونتگا فی فیلسوف لازم است برای پی بردن بکنه مداخل و مخارجِ اقوام. و تحقیق و تدقیقِ حکیم باید تا با سرارِ تجارتِ دنیا امروز پی برد. معدودی چند در یورپ و امریکه بر ثروتِ عظیمهٔ عالم قابض شده اند و اکثر ایشان یهودیانند. و این تمولِ مافوق العادت ایشان را دارای تجارت و صنائع همه گیتی کرده است. بقوتِ زر ممالک را زیر و زبر می کنند. حکومت های یورپ بصوابدید ایشان رفتار می نمایند. روزنامهای دنیا همه در تصرفِ ایشان است هر ملک را یابند که زرخیز است و پر از معادنِ جواهر ثمینه. یکی را از دولِ یورپ بواسطهٔ نفوذِ روزنامها بر تسخیرِ آن ملک مجبور می کنند. عوام خلق خون می ریزند. و یهودیان زر می گیرند. حیله هاے ایشان برتر از خیال و گمانِ عوام الناس است. مثلاً چون این سود خوارانِ دنیا خواستند که بر معادنِ ذهبیهٔ ترانسوال متصرف شوند. بذریعهٔ لندنِ

حاصل کرد. ترانهٔ یهودیان است ملت انگلیس را هیجان آورده. میان انگلستان و ترنسوال نائرهٔ حرب افروختند. بیچاره انگلیسیان در جنگ جانهای خویش فدا کردند. و دو صد ملیون پوند بر نسلهای آینده بارِ قرض نهادند. اما آن معادنِ ترنسوال امروز در دست یهودیان است. همچنین چون ایشان خواستند که بر ثروتِ ملک مصر حاوی شوند اول خدیو مصر را چند ملیون پوند بصد فریب قرض دادند. من بعد دسیسه در مصر شورش پیدا کرده. حکومت انگلیس را برای محافظهٔ سودِ غاصبانهٔ خویش بر آن ملک مسلط کردند. اکنون درین فکر هستند که دولتِ فرانسه را بر ملکِ مراکش از غرب اقصیٰ مستولی گردانند. تا مانند توده حیات آن ملکِ زرخیز و معادنِ ثمینه را بکشند. پیش از محاربهٔ کریمیا دولتِ عثمانیه هیچ قرض نداشت. همین خونخوارانِ انسانی انگلیس و فرانسه را با دولتِ ترکیه فراهم آورده. ایشان را بخلاف روسیه بجنگ انداختند. از آن زمانه ترکان بچنگالِ دام این گرگانِ آدمی صورت گرفتار شدند. و در هر جنگ یا بغاوت دام در گردن حکومتِ ترکیه تنگ تر میشود. ولیکن جاپان را ملاحظه کن که چگونه رموزِ تمولِ ملی آموخت و کارخانهٔ صنائع و حرف را بر اصولِ نو بنا نهاد. و در میان تجارت عالم با اقوام یوروپ همدوشی میکند. درین نزدیکی زمان فرزندِ آسمانی هم به تتبع شهنشاهِ مملکتِ آفتابِ درخشان مبعوثان را بیوروپ و امریکا فرستاده بود. تا اصولِ ادارهٔ مالیاتِ ملیه حسب قرارِ جدید آموختند و در ملکِ چین اجرای آن اصول آهسته آهسته می کنند.

بازگردیم بحکایتِ تطاولِ صرافانِ یهودی نژاد و زبونیِ ملت انگلیس بدست ایشان. جزیرهٔ برطانیه یک خاکپارهٔ ایست کوچک. بر سطح بحرِ شمالی در گوشهٔ غرب و شمال برِ اعظم یوروپ ایستاده. رقبهٔ اراضیش بعد یک حصهٔ هندوستان نیز نرسد و اهالیش هم بچهل ملیون نمی رسند. همه عقار و زمینِ جزیرهٔ برطانیه ملک چند نفر

از امرای آن سرزمین است. این اُمرا همه ملک را بالقطعات قسمت کرده اند. و مرغزار
و باغها های باتجمل و فضا و با ابنیهٔ روح بخش و دلکشا دران قطعات پیراسته. زراعت
و فلاحت که در ایام قدیم انگلستان را شهرهٔ آفاق کرده بود. گویا اکنون از جزیرهٔ برطانیه
مفقود شده. بجای آن کارخانهای کلان که هم ملک این مردم متمول است
در چند مرکزها پیدا شده. عوام خلق از مرد و زن و بچه از قُری بشهرها برای طلب معاش
فراهم آمده. مانند بندگانِ زرخرید شب و روز مبتلای رنج و تعب گشته. مردم طبقهٔ وسطی
یا در خدماتِ حکومت یا در چاکری تجارت خانها که نیز از اهل ثروت است در جنگ
و جدل برای هستی اُفتاده. مصارف بسیار و مداخل کم. کمتر مردمانند که خانه از ملک
خود شان داشته باشند. عموم خلائق در مکانهای کرایه زندگانی میکنند. بالجمله قلیلی
معدود هستند که در نعیم مقیم حظ از حیات می گیرند. و سائر الناس در عذابِ الیم مبتلا
مردم طبقهٔ علیا برای این فلک زدگانِ خمرخانها کشاده اند تا به نشهٔ شراب غم را
فراموش کنند. با این همه تدبیر جنون در ترقی است و خودکشی در ازدیاد. دیگر تدبیر برای
ترضیهٔ این مفلوکین تسخیر ممالک است در برّ اعظم آسیا و افریقا. اگرچه حصهٔ بزرگ
از نهب و غارتِ ممالک بطبقهٔ علیا میرسد. اما برای دیگر طبقات هم ابوابِ خیر و فلاح
کشاده میشود. این نظام بدیع نتیجهٔ تعلیم باطل در مدارس است و نفوذ روزنامها
و رسائل که دائماً عظمتِ نسلِ انگلیس و حقارت دیگر نسل های بنی آدم بر دلِ بچگان
انگلیس نزاد ثبت می کند. در پارلیمنٹ و هاؤس آف لارڈز هم همین متمولین هستند
قانون را حسبِ مصلحتِ خویش میسازند. و بیچاره خلائق گمان می کنند که قانون برای
منفعتِ عام است. حقا که نظام معاشرتِ ممالکِ متمدنه عموماً و ممالک برطانیه
خصوصاً یک طلسمی است پیچ در پیچ و معمای است لاینحل. هر کس بشدت است
د عذاب. اما سلسلهٔ جنبانِ جور و جفای عمومی غیر مرئی

ہاں در زمانِ باستان اشخاص بُده بندگان ؛ اقوام را این غربیان بنده کنند از مکر و فن ؛

چون این صیادانِ مردم بشیادی خویش خلائق انگلستان را بدامِ تزویر در گرفته اند آیا عقلِ سلیم باور کند که اہلِ ہند را بمحض فریاد و زاری از سلاسلِ عبودیت رہا کنند حاشا و کلا تدبیرِ خلاص ہماں ہست که دانشوران ہنود دریں ایام دریافته اند ـ سَوَدیشی یعنی برپا کردنِ صنائع و حِرَفِ وطنیه ـ واقامتِ دار العلومِ ملّیه بدونِ تصرفِ حکومتِ اجنبیه ـ و بدست آوردنِ تجارتِ ملک بدستِ قوم ـ ہمین ہست کلیدِ بابِ نجاح . این رفتارِ اہلِ ہند بسلکِ عاشگرانِ انگلستان از دوف شماتت می نهد ـ نخستین چون مصنوعاتِ انگلستان در ہندوستان کساد بازاری یابد ـ لامحاله کارخانہاے انگلستان معطل ماند ـ و فرقهٔ عمله بیکار شوند ـ زیرا که تجارتِ انگلیس در ملکِ چین در زمانِ پیشین ہشتاد و پنج حصه در صد از تجارتِ ہمه اقوام با چین بود ـ اما دریں روزہا تجارتِ انگلیسیه در شرقِ اقصے از ہشتاد و پنج تا پنجاه و دو در صد نازل شده ـ و این زیانِ انگلیس سودِ جاپان و جرمنی و امریکه گشت ـ نه در چین تنها بلکه در ہمه بازارہاے دنیا مصنوعاتِ جرمنی و امریکی و جاپانی گرم بازاری دارد ـ و مصنوعاتِ انگلیسی کساد بازاری ـ پس اگر در ہند ہم ابوابِ تجارت بر انگلیس مسدود گردد ـ در انگلستان انقلابے عظیم و بلواے شورانگیز برپا شود ـ و آن گرگانِ آدمی صورت که از آسیبِ شان ہیچ قومے در دنیا ایمن نیست ـ و ہم گلوی ملتِ انگلیس در دہانِ شان ہست ـ بپاداشِ عملِ سفاکانه خود خواہند رسید و اہلِ انگلستان و ہندوستان ہر دو از چنگالِ شان نجات خواہند یافت ـ

دویم چون تجارتِ انگلیس در ہند خسران یابد ـ حکومتِ ایشان بر بناے سفائنِ حربیه بسیار ہم قادر نباشد ـ و از فتنه انگیزی در عالم و تطاول بر اقوامِ ضعیفه نیز باز ماند ـ مثلاً ـ الحال ڈپلاسی یعنی حِیَلِ سیاسیهٔ انگلیسه در تبدیلِ علائق فیما بین دولِ معظمهٔ یوروپ سرگرم ہست ـ میخواہد که دولتِ اطالیه را از دوستئ آستریا و جرمنی باز کشد ـ و در سلکِ مودتِ انگلیس و فرانسه و روسیه در آرد ـ من بعد فرانسه بر ملکِ اسلامی مراکشیه قابض شود ـ و اطالیه بر طرابلس غرب افریقاے شمالی و بر البانیه ـ ہر دو از ممالکِ عثمانیه ـ تصرف نماید ـ و روسیه بر قسطنطنیه و ملکِ شمالی ایران

تسلط نماید. و انگلیس خودش ملک عرب تا صوریا و جنوبی حصۀ ایران و افغانستان را در دائرۀ مملکت برطانیه داخل کند. تبردیا و بلغاریا و مانتی نگرو را برخلاف آستریا که با جرمنی مماشات میکند بود گشته اند بامید تقسیم ولایات یوروپیۀ عثمانیه درمیان شان هنگام انفصال اجزاے مملکت عثمانیه. این منصوبه هنوز از قوت بفعلیت نیامد محض از ناقبول کردن روسیه. پس آن مسلمانان هند که تملق مانند گدایان پیش وائسراے هندوستان عرض حال کردند. و از هندو برادران وطنی جادۀ خلاف گزیدند. ندانستند که تیشه بر اصل استقلال ممالک مستقلۀ اسلامیه می نهند. و در نظر عالم متمدن مجرم غداری بوطن عزیز ملزم شدند. و براے مداومت نهب و غارت وطن رضی گشته و حکومت انگلستان را بهانۀ فراهم دادند تا حقوق همه اهل هند را تا زمان غیر محدود معطل دارد. این مسلمانان نمی دانند که در یوروپ و امریکا هیچ قومے و ملتے وحشی تر و بدتر از مسلمانان شمرده نمی شود امت مرحومۀ محمدیه را مانند خس و خاشاک در بوستان تمدن انسانی که انهی ر دو از باغ فطرت از نشو و نما بازدارد. می پندارند. بنابرین افنا و هلاک ایشان را عمل مبرور می انگارند. و میگویند که هرجا حکومت اسلام هست. انسان از ترقی باز ایستاده است. گویا مسلمانی سنگ آسیاب است در گردن انسانیت که همه نوع بشر را از صعود بمدارج رفعت تمدن حقیقی و حریت فاضله باز می دارد. براے هرکس رحمت و شفقت روا دارند. الا براے مسلمانان سه آنکه رحم از دل برد تاثیر فریاد من است + آنکه نسیان آورد خاصیت یاد من است ؛ این اثر مطبوعات انگلیسه است که از صد سال صورت اسلام و اسلامیان را بهمگین زشت ترین کشیده اند.

بحکم همه لوازمات حفظ ذات ملیۀ اسلامیه و مقتضیات بقاے ممالک مستقلۀ امم محمدیه و صوابدید وطن پروری همین است که مسلمانان مسلک صلح کل با ملل آسیائی عموماً و مذهب محبت کل با مردم هند خصوصاً اختیار کنند. الحال موهبت ایزدی براے حمایت همه اقوام بر اعظم آسیا ملت جلیلۀ جاپان را نصب فرموده است. پس نوجوانان هنود و مسلمین را باید در ... و دارالعلوم و الفنون جاپان براے تحصیل علوم و صنائع جدیده باید فرستاد. و جواهر شرف ذات و انوار عقل و حریت از معادن و مطالع شرق اقصی بدست آورد و تعصبات جاهلانه و نزاع و فرقه دینیه را از سر بیرون انداخت. . . . .

برهمنها بواسطهٔ کتاب دینی اش جهل غرض دین الٰهی و محبت خلق خدا باید تلقین کردن و تیرگی کوتاه فهمی بنور اشراق روحانی محو نمودن. و بنای حریت عامه نهادن است حریت خاصه بحریت عامه منتج گردد. از حریت افراد حریت قوم حاصل شود. و از حریت همه اقوام حریت عالم جلوه نماید. همچنین اگر هندوستان برای دوام بذلت عبودیت راضی شود. حریت عامه هرگز بظهور نیاید. اکنون جاپان قوم حر شد و چین هم اسباب حریت و بزرگی را آماده کردن گرفته. اگر هند هم درین راه قدم زنان شود. نجات براعظم آسیا. گویا متیقن الوقوع گردد. و نجات آسیا که مسکن نیمهٔ افراد نوع بشر است. ضامن نجات عالم خواهد بود. پس امروز فرض هندو و مسلمان است که در هر قریه و شهرے وضع مردم را منتظم بسلک انجمنها سازند. و اعداد سکان را ضبط نمایند. و در شادی و غم مواسات باهمی ملحوظ دارند. و تعلیم و تن پروری و اصول سیاست را از جملهٔ واجبات دین انگارند. و در هنگام ظلم بر یکے همه جماعت بنصرت قائم شوند. و کسانے را که غدر بوطن روا دارند و برائے خدمت اجانب اهل وطن را مورد جور و جفا سازند. از جماعت برون باید انداختن

حب وطن همین است مردانگی چنین است حکم خدا بس این است این کار دینیان است

حکومت چیست! انسان بالطبع مدنی است و نمی تواند که تنها زندگی کند. و هم طلب مفید و دفع مضر در هر ذات طبعا موجود است. پس هر کجا که چند افراد فراهم آیند نزاع درمیان شان متوقع باشد. هر چه که مردم یک بقعه یا یک ملک برائے فیصلهٔ نزاع میان شان قرار دهند قانون آن بقعه یا ملک باشد برائے فیصلهٔ قضایا قاضیان و برائے اجرائے احکام قاضی و اقامت امن و امان در جماعت سرهنگان کوتوالی لازم. و برائے دفع حملهٔ اعدائے خارجه لشکر هم واجب. برائے خدمت جماعت، جماعت این خدام خویش را اجرت میدهد این مصارف حکومت از جماعت بصورت خراج گرفته شود. پس وضع قانون و نصب حکام برائے اجرائے قانون و تعیین مقدار خراج برائے مصارف هر دو رتبهٔ ملک و ملت هم از مشیت و ارادهٔ قوم موجود باشد. و هر ملکے که چنین نظام ندارد. حکومت غیر طبعی دارد حکومت هندوستان چنین است. مشتے از انگلیسیان که بیگانه هستند و میخواهند که دائما

بیگانہ مانند۔ ہم قانون برائے اہل ہندی سازند۔ وہم حکام برائے اجرائے آں قانون میگمارند۔ وہم خراج بر ہندوستان تعین میکنند۔ ولشکر برائے تسلط و تغلب بہندوستانیان دست خود دارند۔ برائے رفع این نظام فاسد و حکومت باطل لازم ہست کہ ہنود و مسلمانان متفق شوند۔ و بانگلیس بگویند کہ اکنوں وقت آمدہ ہست کہ انگلیس مردم ہندرا در ہمہ حقوق و فرائض با خود مساوی گیرند و در ہمہ ممالک برطانیہ برائے ہندیاں ہماں امتیازات باشد کہ برائے انگلیس ہست۔ والا قانون فطرت کہ حاکم بحفظ ذات ہست۔ البتہ ہندوستان را مجبوراً ملکے مستقل مانند ممالک متحدہ امریکہ خواہد کرد۔

برائے انصرام این مرام زبغاوت لازم باشد۔ نہ لشکر و نہ اسباب حرب از توپ و تفنگ وغیرہ۔ صرف این قدر کافی ست کہ ہر ہندی نژاد یکبارگی در ہمہ طول و عرض ہندوستان از خدمت حکومت دست بکشد۔ وہمہ کاروبار در تمام ملک دفعتہً معطل شود و ہر انگریزے بجائے خود اسیرے گردد۔ اگر این کثرت اعداد مردم راکہ مانند مور و ملخ فراوان ست پیش روان ملت در نظم اجتماعی آرند۔ تو تشش فوق الوصف خواہد بود و احتیاج بچیزے دیگر ندارند۔

اے قوم خفتہ برخیز ایں خواب بس گراں ست — تاکے چنیں تغافل آتش بجان دماں ست
شو مجتمع چو پرویں برآ بہ چرخ رفعت — چوں ذرہ شو پریشاں خاکت اگر مکاں ست

کتبہا

محمد برکت اللہ البھوفالی الہندی
نیویرک ممالک متحدہ امریکہ

بے چینی کے آثار

جنکا ظہور آجکل عام طور پر سارے ہندوستان میں اور خاص طور پر پنجاب و مشرقی بنگال میں حاکم و محکوم دونوں کی تشویش کا باعث ہو رہا ہے، ہمارے خیال میں زیادہ تر خود گورنمنٹ اور اسکے ماتحت حکام یا منظور نظر اینگلو انڈین حضرات کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً پنجاب میں قابل اعتراض قانون نوآبادی کے ساتھ ہی ساتھ باری دوآب میں محصول آب کا دفعتہً

دونے سے زیادہ کردیا جانا اور راولپنڈی میں محاصل زمین کا غیر معمولی اضافہ رعایا پر اسدرجہ شاق گذرا کہ عنان صبر و اختیار اُنکے ہاتھ سے جاتی رہی اور جب ان کی عرض و معروض کی بھی کچھ شنوائی نہ ہوئی تو بحالت ناامیدی کہیں کہیں انکا طرز عمل حد ادب سے گذر گیا۔

جن قوانین کا ہمنے اوپر ذکر کیا ہے انکا اثر عوام پر خواص سے زیادہ پڑا کیونکہ عوام ہی اکثر انسے بلاواسطہ دوچار ہوئے۔ خواص کو جس مصیبت کا بلاواسطہ سامنا ہوا اُسکا اندازہ جداگانہ تھا مثلاً اخبار پنجابی پر گورنمنٹ کی حد سے زیادہ سختی اور تعلیم یافتہ گروہ پر دشمنان ہند یعنی اخبار سول ملٹری گزٹ ٹائمز آف انڈیا انگلشمین اور پاینیر کے قابل نفرین حملے۔ قصہ مختصر کسی نہ کسی طرح پر خواص و عوام دونوں حکومت کی جابرانہ کارروائی سے برداشتہ خاطر ہوگئے جسکا نتیجہ

شورش لاہور و راولپنڈی

کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن ان شورشوں سے تعلیم یافتہ گروہ کا عملی طور پر کوئی تعلق نہ تھا کیونکہ اول تو قانون داں اصحاب سے ایسی کارروائیوں کا سرزد ہونا ہی خلاف قیاس ہے۔ دوسرے خود ان ہنگاموں کی صورت حال کہے دیتی ہے کہ کوئی واقف کار اور تعلیم یافتہ شخص کے تحت میں نہ تھے ورنہ صاف ظاہر ہے کہ راولپنڈی میں انگریزوں کے علاوہ امریکن مشن کے بقصور پادریوں کو نقصان پہنچانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ہم ان ہنگاموں کو مستحسن نہیں خیال کرتے لیکن اسکے ساتھ ہی اہل ہنگامہ کو بھی سراسر قابل الزام و سرزنش نہیں سمجھتے کیونکہ جب بحالت اضطراب دنیا میں کوئی شورش برپا ہو جاتی ہے اُسوقت بمصداق "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" ہر شخص وہی روش اختیار کرتا ہے جہانتک اُسکے فہم کی رسائی ہوتی ہے۔ مثلاً بنگال پراونشل کانفرنس کے منتشر ہونے پر تعلیم یافتہ بنگالیوں نے مقدمہ بازی ہی کو کافی سمجھا تھا لیکن لیڈران راولپنڈی کی توہین کا عوض عوام راولپنڈی نے بحیثیت نیم تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ ہونے کے زد و کوب سے لیا۔ کیونکہ ان کی سمجھ میں بدلہ لینے کا یہی طریقہ مناسب معلوم ہوا۔ یہاں پر قدرتی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بلحاظ نادانی عوام پر پورا الزام عائد نہیں ہوتا تو پھر خمیازہ

ان ہنگاموں کا ذمہ دار کون ہے؟

گورنمنٹ اور اسکے راز دار اخباران تمام شورشوں کا ذمہ دار تعلیم یافتہ گروہ کو قرار دیتے ہیں چنانچہ اسی اصول پر بلا ثبوت جرم پہلے راولپنڈی کے پانچ معزز بیرسٹر اور وکیل گرفتار کیے گئے اور آخر کار فخر ہند لالہ لاجپت رائے کی جلاوطنی عمل میں آئی۔ ہم کو اس کارروائی پر مطلق اعتراض نہوتا اگر تعلیم یافتہ گروہ کو جمہور کا قائم مقام سمجھنے میں گورنمنٹ کا طرز عمل ہمیشہ یکساں نظر آتا۔ لیکن

طرفہ ماجرا

تو یہ ہے کہ سزا دینے کے وقت وہ لوگ بلا تحقیق و تفتیش عوام کے سرغنہ اور قائم مقام ان لیے جاتے ہیں مگر جب کبھی جمہور کے حقوق اقتدار و آزادی کا سوال پیش ہوتا ہے تو اُن کی رائے محض اس بنا پر نظر انداز کر دیجاتی ہے کہ وہ صرف تعلیم یافتہ گروہ کی مصنوعی شورش ہے جو جمہور کی خواہشوں کا آئینہ نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ لارڈ کرزن اپنے عہد نامسعود میں کانگرس کی تحقیر و تردید برابر اسی فریب آمیز دلیل سے کرتے رہے اور اب بظاہر صورت مسٹر مارلے اور لارڈ منٹو بھی انہیں کی پیروی میں بڑی سرگرمی کے ساتھ مصروف ہیں۔ بھلا اس زبردستی کا بھی کچھ ٹھکانا ہے کہ جب سرغنایان قوم کے دعووں کی عوام کی جانب سے عملی تائید نہیں ہوتی تو اُنکے دعوے ہی ناقابل شنوائی قرار دیے جاتے ہیں لیکن جب آبادی نہر چناب و راولپنڈی کے مانند پبلک بھی تعلیم یافتہ گروہ سے متفق اور ہم آواز ہوتی ہے اسوقت انصاف و حق پسندی کو خیرباد کہکر اور اپنے تمام اقوال کو فراموش کر کے اینگلو انڈین حضرات سڈیشن سڈیشن اور بغاوت بغاوت کا شور مچانے لگتے ہیں حتی کہ انکی اس مصنوعی فریاد سے متاثر ہو کر وزیر ہند بھی مرعوب و مجبور ہو کر

روسی طرز حکومت

پر اُتر آتے ہیں۔ اور سرگروہ پنجاب و سرمایہ ناز ہندوستان لالہ لاجپت رائے کی جلاوطنی کو جائز قرار دینے کے لیے ۱۸۱۸ء کے ایک کہنہ ریگولیشن سے مدد لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس بات کا لحاظ رہے کہ یہ ریگولیشن اُسوقت وجود میں آیا تھا جبکہ مرہٹوں

اور ہندیوں سے جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور جابجا چند مسلمان طاقتوں نے علاوہ علاقہ پنجاب کی بھی آزادی قائم تھی۔ ہمیں تو مسٹر مارلے کو ایک لبرل مدبر کی حیثیت سے ایسے جابرانہ قانون سے فائدہ اُٹھانے سے احتراز کرنا چاہیے تھا۔ جو صورتحال ایسی حالت میں کہ قانون اسلحہ نے تمام ہندوستانیوں کو بالکل بے دست و پا کر دیا ہے اور ایسے ۱۸۵۷ء کے سے ہنگاموں اور لڑائیوں کا آجکل گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ معاملات ہندوستان کے حق میں لبرل اور کنسرویٹو فریق کے طرز عمل میں ذرا بھی فرق نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اہل ہند مسٹر مارلے کے فیصلے پر صرف ناراض ہیں متعجب بہت کم ہیں۔

مذکورہ بالا پریس قانون کے علاوہ لارڈ منٹو نے چند نئے احکام بھی جاری کیے ہیں جنکا منشا یہ ہے کہ (۱) اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم پالیٹکس اور پروفیسر ملکی معاملات میں حصہ نہ لیں (۲) پنجاب، مشرقی بنگال کے مخصوص اضلاع میں جلسوں سے آزادی تقریر کا حق چھن جائے۔ شاید گورنمنٹ ہند کا یہ خیال ہے کہ اس کی ان کارروائیوں سے ہندوستان کا نیشنلسٹ فریق مرعوب و مغلوب ہو کر طلب حقوق و کوشش آزادی سے دست بردار ہو جائیگا لیکن ہماری دانست میں یہی ان کی غلطی ہے

جبر سے تحریک حریت کی اعانت

ایسے طریقے برتے جا رہے ہیں جسکا غالباً انگریزوں کو وہم و گمان بھی نہیں ہے مثلاً لبرل گورنمنٹ کی سختی سے اسوقت تک جو لوگ فریق نرم کے پیرو ہیں وہ بھی اغلب ہے کہ باضابطہ ایجیٹیشن اور برٹش انصاف سے ناامید ہو کر کم از کم ذہنی طور پر ضرور فریق گرم میں شامل ہو جائیں گے اور آیندہ فلاح ملک و ملت کی خاطر حکومت پر بھروسہ کرنیکے بجائے صرف اپنی ذاتی کوششوں پر اعتماد کرینگے اور یہی فریق گرم کا سب سے پہلا مقصد ہے

طالبعلموں و معلموں کو ملکی معاملات سے بے خبر و علیحدہ رکھنے کا نتیجہ غالباً یہ نکلیگا کہ رفتہ رفتہ تمام غیور اور با قسمت لوگوں کے بچے سرکاری مدرسوں کے بجائے نیشنل کالجوں اور قومی درسگاہوں میں تعلیم پانے لگیں گے اور یہ بھی فریق گرم کا ایک مسلمہ مقصد ہے چنانچہ اسی بنا پر اخبار بندے ماترم کلکتہ نے حکومت کے اس تعلیمی سرکیولر کا بڑی خوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے

اس آزاد اخبار کی رائے میں جن اضلاع میں پبلک جلسوں کی حسب قانون جدید ممانعت کی جائے ۔ وہاں سرغنایان ہند کو چاہیے کہ خاص طور پر جاکر لکچر دیں اور گورنمنٹ کے بیضابطہ سرکلر کی بالکل پروا نکریں ۔ اور اگر پولس ان جلسوں کو بزور منتشر کرے تو پھر علیحدہ علیحدہ ہر ہر شخص کے مکان پر جاجاکر قومی تحریک کا وعظ کہا جائے جسکو حکومت کسی طرح روک نہیں سکتی ۔ حقیقت میں آزادی تقریر کو روکنا مقاصد حکومت کے لیے خطرناک ہے ۔ کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ جب لوگ اپنا مدعاے دلی علانیہ طور پر ظاہر نہ کرسکیں گے تو بہت ممکن ہے کہ وہ خفیہ سوسائٹیاں قائم کریں یا غصہ و غم کی آگ انکے دلوں میں سلگا کرے جسکے بھڑک اُٹھنے کا ہر وقت امکان ہوسکتا ہے

بندے ماترم کی مندرجۂ بالا راے بعض لوگوں کو بہت سخت نظر آئیگی ۔ لیکن کسی شخص کو بلا اظہار جرم و قصور آزادی سے محروم کردینا درحقیقت ایک ایسی بے انصافی ہے جسکے خلاف رہنا بجا اور انصاف پسند انگریز بھی ایسا ہی بلکہ شائد اس سے زیادہ سخت فیصلہ کرچکے ہیں چنانچہ مشہور وہابی کیس کے دوران میں اُس زمانے کے معروف بیرسٹر مسٹر انسٹی نے اپنے مظلوم موکلوں امیر خاں و ہاشم داد خاں کی بیضابطہ گرفتاری کے خلاف لارڈ میو کو بہت کچھ سخت دست کہنے کے علاوہ ایکٹ ۱۸۱۸ء کی نسبت یہ زوردار فقرے بھی استعمال کیے تھے کہ "یہ ایکٹ تاج و کانسٹیٹیوشن کے منافی، خلاف قانون اور سراسر بے معنی ہے ۔ اس سے ایک ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے جس میں فراحمت و مخالفت جائز ہی نہیں بلکہ فرض ہوجاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور سمجھہ میں نہیں آتا کہ یہ ریگولیشن اور ملکہ کا اشتہار دونوں ایک ہی وقت میں کیونکر قائم رہ سکتے ہیں"

شورش بنگال

شورش بنگال کا افسانہ پنجاب کے قصے سے بھی عجیب تر ہے کیونکہ اس ہنگامے کو فرو کرنے میں پنجاب کی مستعدی کے خلاف حکام کی جانب سے جس بیدلی اور بیدست و پائی کا اظہار ہو رہا ہے اُسپر نظر کرکے بنگالی اخباروں کا یہ دعوے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا جھگڑا زیادہ تر خود غرض حکام کا پیدا کیا ہوا ہے جنھوں نے بوائکاٹ کو ان شورشوں کا اصلی سبب

بیان کر کے اس تحریک کو دبا دینے کا حیلہ پیدا کرنا چاہا ہے۔
ہمکو انگلو انڈین اخباروں کا یہ بیان بالکل خلاف واقعہ نظر آتا ہی کہ جاہل مسلمانوں نے ہندوؤں پر اسوجہ سے حملے شروع کیے ہیں کہ ہندو ان کو بوائیکاٹ پر مجبور کرتے تھے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ اول تو گاؤں کے باشندے ولایتی چیزیں ہی کم استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے قریب قریب تمام دیسی دستکاریاں مسلمان کاریگروں کے ہاتھ میں ہیں اسلیے سودیشی و بوائیکاٹ سے ان کو نقصان کے بجائے فائدے کی امید ہونا چاہیئے تھی۔ چنانچہ مسلمان جلاہوں کو اس تحریک سے مسلسل طور پر فائدہ پہنچا بھی ہے۔ ایسی حالت میں بنگالیوں کی یہ بدگمانی بالکل بیوجہ نہیں معلوم ہوتی کہ فساد کا اصلی باعث یہ ہے کہ غیر تعلیم یافتہ اور کم درجہ مسلمانوں نے گورنمنٹ کی بے پروائی کو اس امر پر محمول کر لیا کہ ہندوؤں پر زیادتی کی انسے کچھ بازپرس نہوگی اور نواب صاحب ڈھاکہ ہر حالت میں ان کی اعانت پر موجود رہیں گے۔ ابتدائی فساد کے بعد باہم زیادتیاں ہی ہوئیں لیکن اس باب میں ہندوؤں یا مسلمانوں کو الزام دینا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ صاف ظاہر ہی کہ جب ایکبار ہنگامہ شروع ہو جاتا ہی تو بعد کو بے تعصبی، مروت اور مصلحت باہمی کا لحاظ رکھنا قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہی۔ خیر دنیا میں کوئی چیز نفع سے بالکل خالی نہیں ہوتی اور اسیلیے

شورش بنگال سے کچھ فائدے

بھی ضرور مرتب ہوئے ہیں۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ جھگڑے اور فساد سے سخت نقصان اٹھا کر ممکن ہے کہ ہندو مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور آیندہ دوسروں کے نفع کی خاطر دونوں آپس میں لڑنے کی بیوقوفی سے باز رہا کریں۔ دوسرا فائدہ جو ظاہر بھی ہونے لگا ہی یہ ہی کہ واقعات و حالات زمانہ نے بنگالیوں کو اپنے سر سے بزدلی کا الزام اٹھانے پر مجبور کر دیا ہی اور بہت ممکن ہی کہ اُن کی آیندہ نسلیں دماغی قابلیت کے ساتھ جسمانی خدمات کو بھی پورا کرنیکے قابل ہو جائیں۔
تیسرا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہی کہ بنگالیوں کو اور اُنکے ساتھ تمام ہندوستانیوں کو اپنی موجودہ حالت اور بیسروسامانی کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہی اور ہر ہوشمند شخص نے تسلیم کر لیا ہے کہ قومی اور ملکی ترقی کے لیے حکمران اغیار سے اعانت کی امید رکھنا فضول ہی نہیں بلکہ مضر بھی ہے کیونکہ یہ بات ترقی کے اصلی اور صحیح اصول سلف ہلپ کے بالکل خلاف ہی۔ شورش پنجاب

دبنگال سے غالباً ملک کو ایک فائدہ اور بھی پہنچا ہے کہ اُسکے دور دورے میں

کھوٹے کھرے کا امتحان

بخوبی ہوگیا اور صاف طور پر معلوم ہوگیا کہ تحریک آزادی کا دوست کون ہے اور دشمن کون
غیرت وحمیت کا مادہ کس میں ہے اور کس میں نہیں اخبار اسٹیٹسمین کلکتہ کے مانند بعض انگلو انڈین
اخبار جو اپنے کو خواہ مخواہ ہندوستان کا دوست قرار دیکر لوگوں کو دھوکا دیا کرتے تھے انکی قلعی
پورے طور پر کھل گئی۔ اسٹیٹسمین اگرچہ ایک لبرل اخبار تھا پھر بھی چونکہ اسکے مالک و ایڈیٹر انگریز تھے
اسلیے اس کی غیر ہمدردانہ پالیسی کچھ زیادہ تعجب انگیز نہیں ہے۔ دنیا تو اس بات کا ذکر بدنام کنندہ
نکو نامے چند۔ بعض ہندوستانیوں کے اخباروں نے بھی غیرت وحمیت کو بالائے طاق رکھکر
لالہ لاجپت رائے کو زشت نہ طعن وملامت بناکر پرلے درجے کی سفاہت اور کمینگی کا اظہار کیا ہے۔
مثلاً اخبار ٹریبون لاہور کے بعض کارکنوں کو اگر لالہ لاجپت رائے سے کسی بات پر رنجش تھی تو
اُسکے عوض لینے کا یہ موقع ہرگز نہ تھا علی ہذا القیاس جن بعض مسلمانوں نے لالہ صاحب کی گرفتاری
پر سول وملٹری گزٹ کو مبارکباد دیکے تار بھیجے یا جلسے کرکے خوشنودی کا اظہار کیا ان کا وجود
ہماری رائے میں

اسلام کے دامن حُرمت وحریت پر ایک سخت بدنما داغ

ہے کیونکہ اگر بفرض محال لالہ لاجپت رائے مسلمانوں کے دشمن ہی مان لیے جائیں تو بھی شکست خوردہ
دشمن کی بے بسی اور مصیبت پر علانیہ اظہار مسرت کرنا انتہا درجے کی بزدلی وسفلہ پن ہے

زینہار بر جنازۂ دشمن چو بگذری   خرم مشو کہ با تو ہمیں ماجرا رود

ہم کو افسوس ہے کہ ایک دشمن ملک وطن اخبار نے جو بمصداق "برعکس نہند نام زنگی کافور"
وطن کے نام سے موسوم ہے ایک ملکی جاں نثار کے مصائب کا ذکر فخریہ طور پر ایسی حقارت کے ساتھ
کیا ہے کہ گویا حکومت ہندوستان اُسی کی ملکیت تھی اور لالہ لاجپت رائے نے اُسی کو سلطنت سے
محروم کرنے کا قصد کیا تھا۔ ممالک اسلامیہ سے پوری ہمدردی رکھنے میں چونکہ اڈیٹر صاحب
وطن خاص طور پر مشہور ہیں اور اس بات میں ہم بھی انکے مداح ہیں! اسلیے ہم اس موقع پر انسے
ایک سوال کرنا چاہتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ قومی تحریک مصر کے لیڈر حضرت مصطفیٰ کامل پاشا

کے ساتھ بھی صرف قصور حریت پسندی کی بنا پر یہی سلوک کیا جائے جو لالہ لاجپت رائے صاحب کے ساتھ کیا گیا ہے اُسوقت آپ کیا روش اختیار کرینگے۔ تاج برطانیہ کی وفاداری کا تو یہی مقتضا ہے کہ آپ مصطفیٰ کامل کو بھی باغی قرار دیں اور اُن کی بربادی پر بھی شادیانے بجوائیں تو حقیقت امر یہ ہے کہ خواہش حریت کو بغاوت سمجھنا اور فدائیاں آزادی کو مجرم خیال کرنا کسی حق شناس اور خدا ترس انسان کا کام نہیں ہے۔ اور ہم خوش ہیں کہ اس اصول کے خلاف آجکل بھی صرف وہی چند لوگ عمل کر رہے ہیں جن کی وفاداری جنون کے درجے تک پہنچ گئی ہے اور جو چاپلوسی و خوشامد کا کوئی موقع کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ مثلاً ہمارے صوبے میں حاجی محمد اسمٰعیل خانصاحب رئیس دتاولی اور نواب فرزل اللہ خانصاحب خان بہادر۔ اور پنجاب میں مرزا غلام احمد صاحب قادیانی اور نواب محمد علی خانصاحب قزلباش وغیرہ دنیاداروں کا اپنے اغراض دنیوی کے لیے طرز عمل اختیار کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ چنانچہ بعض ہندو رئیس بھی اسی کے پیرو بن رہے ہیں۔ حسرت و افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ جو لوگ اپنے کو مقتدائے دین سمجھتے ہیں انھوں نے بھی ریاکاری یا مصلحت پسندی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔

ایک ادنیٰ حاکم ضلع کی جا و بیجا خوشامد کرنا اور اپنے تئیں اسکا خادم سمجھنا ایک ایسا نظارہ ہے جسکے دیکھنے کے بعد ہمارے خیال میں میرزائے قادیان کے دعوائے مسیحیت کی کسی سمجھدار آدمی کے دل میں وقعت نہیں رہ سکتی اسلیے ہم ان کے تذکرے سے قطع نظر کر کے افسوس ان بزرگوں کی حالت پر کرتے ہیں جنکی وقعت ہنوز ہمارے دل میں باقی ہے مثلاً حضرت مولانا مولوی محمد حسین الہ آبادی قدس سرہ کے صاحبزادے مولوی ولایت حسین صاحب کا سودیشی تحریک کی مخالفت پر آمادہ ہونا کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ جو لوگ راہ فقر و فنا کے سالک بننے والے ہوں مناسب ہے کہ یا تو وہ دنیوی معاملات میں دخل ہی نہ دیں۔ و اگر دیں تو پھر ایسی روش اختیار کریں جس پر شہرت پسندی خوشامد حکام یا ریاکاری کا گمان نہو سکے یا کم از کم قرآن و حدیث کو اپنے مفید مطلب تاویلوں سے بدنام نکریں۔ کیونکہ ایسے معاملات میں

خدا و رسول کو درمیان میں لانا

بلاشبہ کمزوری ایمان کی دلیل ہے۔ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم

کا وعظ کہتے کہتے جن لوگوں کی زبانیں خشک ہوئی جاتی ہیں ان میں سے اکثر غالباً اس امر سے واقف ہی نہونگے کہ "اولوالامر" سے حاکم دنیا مراد لینے میں علمائے اسلام متفق نہیں ہے۔ نہ اس بات سے آگاہ ہونگے کہ "منکم" کی قید سے اگر "اولوالامر" کا اطلاق حاکم دنیا پر ہی ہوتا ہو تو صرف مسلمان حاکم کی اطاعت فرض قرار پاتی ہے کیونکہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں ہی سے خطاب کیا ہے۔ بظاہر صورت ہی خدا اور رسول کے بعد حاکم دنیوی کا ذکر قرین عقل نہیں معلوم ہوتا اور "اولوالامر" سے بقول علمائے "شیعہ" "امام وقت" اور بقول جمہور اہل سنت "اسلامی لیڈر" مراد لینا زیادہ صحیح ٹھہرتا ہے۔ گروہ سکھ میں سے ہی بعض غرض پرستوں نے تحریک آزادی کے خلاف یہ دلیل پیش کی ہے کہ حاکم وقت کے خلاف شورش کرنا سکھوں کے مذہب میں قطعی طور پر ناجائز ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ حاکم وقت کے خلاف خواہ مخواہ ایجیٹیشن پھیلایا جاوے نہ ہمارا یہ مقصد ہے کہ سرکشی کوئی اچھی چیز ہے۔ ہمارے اس تردیدی بیان کا منشا صرف اس بات کا دکھانا ہے کہ ان معاملات سے متعلق مذہب کو درمیان میں لانا کسی نہج پر مناسب نہیں ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ ان مذہبی احکام کو اپنے مفید مطلب ثابت کرنے کے لیے تاویل کے بغیر کام ہی نہ چلتا ہو۔

اس موقع پر جس طرح ہمنے اڈیٹر صاحب وطن سے ایک سوال کیا تھا اسی طور پر اپنے سکھ دوستوں سے بھی پوچھتے ہیں کہ جب سکھوں نے مسلمانوں کی حکومت سے سرتابی کی تھی اسوقت انکا یہ مذہبی حکم کہاں غائب ہوگیا تھا کہ حکمران جماعت کے خلاف شورش بہر صورت ناجائز ہے خیر۔ یہ افسانہ طول طویل ہے۔ اسوقت قابل غور یہ امر ہے کہ موجودہ حالت میں گورنمنٹ اور رعایا کو

کیا کرنا چاہیے

ہمارے خیال میں رعایا کو اپنی پولیٹکل دشواریوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے اور مسٹر بپن چندر پال کی طرح عین وقت پر فرار ہوجانے کی پالسی کو قابل احتراز سمجھکر ہم لوگوں کا فرض ہونا چاہیے کہ امر حق کے اظہار میں مطلق باک نہ کریں اور صداقت کی آخری فتح پر یقین کامل رکھتے ہوے راہ حق میں جو مصائب پیش آئیں انکو بکشادہ پیشانی برداشت کریں

اور خوب سمجھ لیں کہ آزادی کی دولت آسانی سے نہیں حاصل ہوا کرتی۔ یہ جو حکومت کے جبروت سے بظاہر تحریک حریت کو فاش شکست حاصل ہوئی ہے اسپر افسردہ و مایوس ہونیکی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ ابھی تک ہماری قوت نہ مجتمع ہے نہ منتظم اور اسلیے ہم کو ابھی کچھ دنوں تک ایسی ایسی بہت سی ناکامیوں اور شکستوں کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنا پڑیگا اور پھر ہر موقع پر اپنی حالت کے اندازے کے مطابق کامیابی کی نئی نئی تدبیروں پر اکثر اوقات بالکل از سر نو عمل پیرا ہونا ہوگا۔ سردست ہمارے نزدیک ہر محب ملک کو انگریزی تشدد کے مقابلے میں مزاحمت اندفاعی یعنی پیسو رسسٹنس؛) کی پالسی پر کاربند ہو کر انگریزی مال کے خریدنے بلکہ انگریزوں کو کسی قسم کی مدد پہنچانے سے قطعی انکار کر دینا چاہیے۔

رہی حکومت اسکا ہماری دانست میں فرض ہے کہ اس بات کو بخوبی سمجھ لے کہ تحریک حریت کو جسکا آغاز ایشیا کے ہر ملک میں ہو چکا ہے بزور نیست و نابود کر دینا انسانی قوت سے باہر ہے۔ اور اسلیے اس سے بکامیابی دوچار ہونیکی سوا اس کے اور کوئی صورت نہیں ہے کہ جمہور کے تقاضاے آزادی کو تسلیم کر کے کم از کم اسکے تدریجی رواج کی نیک نیت خواہش ظاہر کیجاے ورنہ تہدید و تشدید سے رعایا کا کچھ روز کے لیے مرعوب ہو جانا تو بیشک ممکن ہے لیکن ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جانا سراسر محال ہے۔ ہم اب اپنے اس تحریر کا

خاتمہ

اس امید پر کرتے ہیں کہ گورنمنٹ نے حال میں جتنے جبری احکام صادر کیے ہیں وہ سب دائمی نہیں ہیں بلکہ اسی طور پر عارضی ہیں جس طرح سے کہ لارڈ لٹن کا ہندوستانی اخبارات کی آزادی چھین لینے کا قانون تھا یا وہابی سرداروں کی گرفتاری کا حکم یا ناٹو برادرس پونا کا واقعہ نیز یہ کہ تشدد ہو یا ترحم ایک وقت وہ ضرور آنے والا ہے جبکہ اہل ہند کو حکومت خود اختیاری یقیناً نصیب ہوگی اور اسوقت بعض موجودہ قومی لیڈروں اور خوشامدیوں کی ہرزہ بانی کے باوجود لالہ لاجپت رائے کا نام تاریخ حریت ہندوستان کے سب سے پہلے صفحے پر نہایت روشن حروف میں درج نظر آئیگا۔ فقط

کلید حافظ

حافظ شیراز را در سخن ادای خاصی ست کہ مستمعان از آن بقدر ذوق لذت یاب می شوند و پیداست کہ مذاق و وجدان طبائع بر یک نہج نیست. گروہے دیوان خواجہ را مخزن جواہر حقیقت گفتہ اند. و جمعے قدم در وادی انکار زدہ. چنانچہ شبے مولانا عبدالحمید فراہی را با یکے از دوستاں کہ ربطے بسخن داشت اندریں معنی گفتگو رو دادہ. مخاطبے گفت کہ اشعار خواجہ منافی حقیقت ست و مولانا می فرمود کہ می تواند شد گفتارش در زمان آغاز سخن سرائے مانند دیگر شعرا با مجاز آشنا باشد. اما او در آخر حال این فن شریف را بر آسمان عشق و حقیقت کشید. اگرچہ خواجہ خود می فرماید کہ ہمہ اشعارش بزیور حقیقت و عرفان آراستہ ہست و از شاہد و شراب و ساقی و میخانہ پردہ بر روئے دلارائے اسرار معنی آویختہ اند چنانکہ گفتہ ؎ شعر حافظ ہمہ بیت الغزل معرفت ست ✦ آفرین بر نفس دلکش و طبع سخنش ✦ سخن کوتاہ بدین تقریب مولانا فراہی را گفتن این غزل فردای آن شب اتفاق افتادہ و بکلید حافظ موسوم شد۔

ثاقب (مدیر قند پارسی)

بصبح عید سنہ ۱۳۲۲ گفتہ شد

از نتائج طبع جناب مولانا عبدالحمید صاحب فراہی بی۔ اے پروفیسر عربی محمڈن کالج علیگڑھ

گوہر مقصد عشاق ز کانے دگرست — قبلۂ حاجت مستان ز جہانے دگرست
در رہ منزل جاناں کہ خطرہاست بسے — رسم و راہے دگر و نام و نشانے دگرست
مدعی گر نکند فہم سخن معذورست — زانکہ افسانۂ رنداں ز زبانے دگرست
نامہ در خون اگر آلودہ فرستم چہ کنم — شرح این واقعہ را کلک و بیانے دگرست
فاش تر ہرچہ بگویم ہماں پنہان ست — زانکہ در زیر نہاں نیز نہانے دگرست
ساغر دل بسوے بادہ فروشاں نبرند — کہ مے جام جہاں بیں ز دکانے دگرست
ما شکار مژہ و ابروے خوباں نشویم — ہر صید دل ما تیر و کمانے دگرست

انچہ آشفتۂ بے نام ونشانم کرد است
خم زلف دگر و موے میانے دگر ست

ہر دم از جلوۂ نو تازہ کنم ایمانے
کو پری پارہ کہ ہر دم بگمانے دگر ست

چشم بر شوکت شاہی نکشایم ہرگز
کز نگاہم بسوی شوکت و شانے دگر ست

ہر کہ ہشیار بود سود و زیاں اندیشد
ما کہ مستیم بما سود و زیانے دگر ست

چوں تہی از خود و از دوست لبالب شدہ ام
ہمچو نے ہر چہ سرایم ز دہانے دگر ست

ناوکے سخت مگر خوردہ فراہی دیشب
کایں تحسر زمزمۂ او بفغانے دگر ست

غزل جناب مولانا شاد خان بہادر عظیم آبادی

جو رات کٹ گئی ہے کیا آئیگی نہ اب کے
پھر شمع کیوں بحسرت منہ دیکھتی ہے سب کے

پیٹی بلا کی صورت آخر شب جدائی
کچھ آج شام ہی سے آثار تھے غضب کے

اے صبح خوف یہ ہے برپا کریں نہ محشر
نالے بچے بچائے سینے میں ہیں جو شب کے

ہستی بھی عاشقوں کی اسوقت تک نہیں تھی
ہیں مرنے والے ہم تو صورت پہ انکی جب کے

کیا بے مروتی ہے یوں جلد اٹھ کے جانا
دو حرف سن تو لیجے بیمار جاں بلب کے

اے شاد دیکھتے ہو کچھ شمع بجھ چلی ہے
دل سوز تھے پتنگے کیا جانیں اٹھے کب کے

غزل جناب سید شبیر حسین صاحب نسیم بھرتپوری

بہت وعدے سنے تیری زباں سے
تسلی اب نہیں ہے ہے نہاں سے

[illegible] سر بر فغاں سے
ملا دوں کیا زمیں کو آسماں سے

[illegible]
وہ ظالم مل گیا ہے آسماں سے

ہوئے جاتے ہو تم ناراض ناحق
میں شکوے کر رہا ہوں آسماں سے

تڑپتی پھرتی ہے اب ہر جگہ برق
الجھ کر میرے خار آشیاں سے

ہماری جان کا دشمن ہے صیاد
جلی پھرتی ہے بجلی آشیاں سے
ہوا تھا شک جو کچھ میری وفا کا
خفا بیٹھے ہیں وہ اپنے گماں سے
کیے یوں جمع ہم نے پارۂ دل
اُٹھالے کچھ یہاں سے کچھ وہاں سے
جناب داغ کے شاگرد ہیں آپ
نہیں واقف نسیم خوش بیاں سے

غزل جناب مولوی محمد ریاض حسن خانصاحب المتخلص بہ خیال رئیس سولپور

کڑیاں کچھ ایسی جھیلیں ہمنے قدم قدم پر
رو رو دیے ہیں چھالے راہ طلب میں ہمپر
رہ رہ کے تولتے ہو کیا خنجر دو دم کو
گردن یہ پھیر بھی دو اب آبنی ہے دم پر
بھڑکے ہوئے ہیں شعلے سینے میں دلمیں اپنے
آنکھ اُسنے کیا ملائی بجلی گرائی ہم پر
پھیلا ہے نور اُسکا سارے جہاں میں یکساں
اے کعبہ والو تم کو کیا ناز ہے حرم پر
دشوار ہو نہ کیونکر ملک عدم کی منزل
بار گناہ لے کر جاتے ہیں پشت خم پر
اے برہمن بتوں سے تو دل کی آس ٹوٹی
اب لو لگی ہے اپنی اللہ کے کرم پر
کس کے یہ نقش پا ہیں کوے عدو میں یا رب
سر جھک رہا ہے اپنا سجدے کو ہر قدم پر
اُس بت نے میرے دل میں گھر کر لیا تو کیا ہے
آخر بتوں کا قبضہ اک روز تھا حرم پر
جتنی کبھی ہے دیدے جو مانگے لیے ساقی
کمظرفوں کی نگاہیں ہوتی ہیں بیش و کم پر
اُس رہگذر کا عالم کیا پوچھتا ہے ہمدم
لاکھوں مٹے ہوئے ہیں جیسے قدم قدم پر
معشوق اور عاشق دونوں ہیں آن والے
ہم کو وفا کی ضد ہے وہ ہیں مصر ستم پر
رندی و مے پرستی ہے تا بقائے ہستی
موقوف عیش و مستی خسرو پہ ہے نہ جم پر
دیکھا ہے جب سے اُسکو اتنے نڈھال کیوں ہو
خود روتے ہو خیال اب ہنستے تھے پہلے ہم پر

غزل جناب نواب محسن جنابیر خلف حضرت محسن کاکوروی

[illegible] ہی یاد رہ نہیں سکتا — کہ جادوگر میں اعجاز پیمبر ہو نہیں سکتا
[illegible] دل میں اک تصویر ہے میری — ہر آئینہ میں اقبال سکندر ہو نہیں سکتا
سیہ دل میں اگر کیا خاک ہو پند و نصیحت کا — یہ بتخانہ کبھی اللہ کا گھر ہو نہیں سکتا
جلا کر آرزوئیں دل جلے کیا پھولتے پھلتے — کہ بجھکر شمع کا گل بھی گل تر ہو نہیں سکتا
نگاہ ناز کو عاشق ترے بدنام کرتے ہیں — کہیں میٹھی چھری کا نام خنجر ہو نہیں سکتا
سراپا ناز ہو جسے نیاز انہیں کہاں ممکن — خدا جا ہو تو کہہ لو بندہ پرور ہو نہیں سکتا
تسلی خاک ہو تیر کو تصویر خیالی سے — شبیہ گل میں انداز گل تر ہو نہیں سکتا

غزل حضرت راز لکھنوی

ختم ہو اور یوں ہے چرخ کینہ جو باقی — شتاب کر کہ نہ رہجائے آرزو باقی
غضب ہے دست ہو عجز کوئی ہلال ابرو — بس آج رہچکی اے دل رگ گلو باقی
شریک بزم ہے اک رند پارسا باقی — پلادے ہو جو ا جیوتا کوئی سبو باقی
عدم میں دھر میں کعبے میں دیر میں دیکھا — کوئی جگہ نہ رہی بہر جستجو باقی
کسی حسین کی تمنا رہی نہ اب دلیں
ہے کربلا کی فقط راز آرزو باقی

حکمت عملی

معنفہ

مولوی سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی

فلسفہ عملی پر مبسوط اور جامع کتاب ہے اسمیں افراد انسانی کی روحانی ارتقا کی تدابیر کیساتھ ساتھ قومی ترقی اور عزت حاصل کرنیکے اصول بھی بیان کئے گئے ہیں اور تہذیب اخلاق۔ تدبیر منزل سیاست مدن کے فروعات مضامین دیے گئے ہیں جو انسان کی ذات میں جوہر شرافت پیدا کرنیوالے اور اسکو زندگی کے مختلف مدارج۔ مختلف زبانوں اور مختلف حالتوں میں اصول حکمت پر کاربند رکھنے والے ہیں۔ عورتوں کی تعلیم اور حقوق کی نگہداشت کا ذکر بھی موقع بموقع کیا گیا۔ مضامین کے لحاظ سے بے نظیر ہے حجم ۵۰۰ صفحہ قیمت تین روپیہ۔

کتاب ملنے کا پتہ [سجاد مرزا بیگ۔ بازار عیسیٰ میاں حیدرآباد دکن۔

رجسٹرڈ نمبر ۲۱۱

اردوئے معلیٰ

نمبر ۶ | بابت ماہ جون سنہ ۱۹۰ء | جلد ۵

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلی علی گڈھ

علی محمد خاں کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڈھ میں طبع ہوا

قیمت سالانہ رسالہ فی نمبر ۳) | (۳) روپیے چار آنے مع محصول

نوٹس کتب

(۱) معین الشعرا مؤلفہ جناب میر محمد علی خاں صاحب ناظم حیدرآبادی۔

چھوٹی تقطیع کے ۱۱۲ صفحوں پر قواعد زبان اردو کے متعلق یہ ایک دلچسپ رسالہ ہے جس میں منجملہ دیگر مباحث تذکیر و تانیث و وحدت و جمعیت الفاظ کے قواعد مع امثلہ مفید تفصیل کیساتھ درج کئے گئے ہیں۔ "نے" کا بیان اور اسکے استعمال کرنیکے قواعد و مستثنیات نیز غیر فصیح اور متروک الفاظ کی فہرستیں بھی شائقین سخن کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔ کتاب [illegible] ۴ر میں مولف سے مطبع [illegible] صاحب دکن واقع چتہ بازار حیدرآباد دکن کے پتے سے مل سکتی ہے

(۲) زینت البنات مؤلفہ ا-م-خ عظیم آبادی اہلیہ محمد تمیز الدین خاں صاحب عظیم آبادی ٹیلیگراف انسپکٹر کالکا شملہ ریلوے تقطیع ۲۲×۱۸/۸ حجم ۸۰ صفحے قیمت ۴ر

مولف نے اس کتاب میں دو انگریز لیڈیوں سے اپنی ملاقات کا حال ناول کے پیرایہ میں لکھا ہے جسکے ضمن میں انتظام خانہ داری۔ ہندوستانی عورتوں کے زیور و لباس۔ رسم پردہ۔ تعلیم نسواں وغیرہ مسائل پر بھی دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ کتاب کی قیمت [illegible] سے حاصل کریں۔

(۳) رسالہ مادہ جمع الفاظ مصنفہ [illegible] الدین صاحب پروفیسر انجینئرنگ کالج پونا حجم حصہ اول ۴۰ صفحے حصہ دوم ۳۰ صفحے تقطیع ۲۲×۱۸/۸ قیمت ہر دو حصہ ۱۲ر اس رسالے میں طلبائے انگریزی سکول و کالج کے فائدہ کیلئے مولف نے قریباً تمام ضروری الفاظ کے مادے انگریزی معنی اور [illegible] درج کر دی ہیں۔ آمدنی کا [illegible] حصہ انجمن حمایت اسلام کو دیا جائیگا۔ کتاب مولف سے ملیگی۔

بسم اللہ

حضرت کاہش جونپوری

(از سنہ ۱۸۰۴ء تا سنہ ۱۸۶۴ء)

نام و تخلص | کاہش تخلص ۔ اولاد علی نام خلف اکبر حضرت مولانا شاہ عوض علی مرحوم وطن اصلی شہر جونپور ۔ محلہ حمام دروازہ ۔ حنفی مذہب کاظمی النسب قادری المشرب

ابتدائی حالات و شاگردی | دس برس کی عمر میں جونپور سے بغرض تحصیل علم لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہاں کے نامی گرامی علماء سے علم حاصل کیا بعض بزرگوں سے سننے میں آیا ہے کہ آپنے فارسی کی کل کتابیں مرزا محمد حسن قتیل سے پڑہی تھیں اور فارسی کی غزلوں میں بھی اُنھیں سے اصلاح لی تھی ۔ عربی کی کل کتابیں جناب مولانا مرزا حسن علی محدث لکھنوی سے پڑہی تھیں جن کو حضرت شاہ عبداللہ عزیز محدث دہلوی سے تلمذ تھا ۔ فن شاعری اردو مع عروض و قافیہ جناب شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے حاصل کیا تھا ۔

دیگر حالات زندگی | الغرض بائیس برس کی عمر میں تمام علوم سے آپ فارغ التحصیل ہو گئے تھے بعد فاتحہ فراغ آپنے قصد وطن کیا اور اپنے اُستادوں سے اجازت چاہی ۔ گو دوری اُستاد شاق تھی مگر طلبی والدین نے مجبور کر دیا تھا ۔ قصہ مختصر یہ کہ آپ اپنے اُستادوں سے اجازت لیکر مکان تشریف لائے اور اکر چندے قیام کیا اسی اثنا میں آپ متاہل ہوئے بعد اسکے بغرض سیاحت صاحب گنج ضلع گیا تشریف لے گئے اور یہاں آنیکے ساتھ ہی محکمہ عدالت ججی کے پیشگار ہو گئے ۔ اکثر برسر اجلاس فیصلہ حکام وبحث وغیرہ نظم میں لکھدیا کرتے تھے چنانچہ بعض بعض شاہد اُسکے ہنوز موجود ہیں ۔ کئی برس تک اس کام کو آپ نے سلامت روی کے ساتھ انجام دیا ۔ لیکن چونکہ آپ کو درس و تدریس کا بیحد شوق تھا اور کچہری کی وجہ سے اُسکا وقت نہ ملتا تھا بنا رعلیہ استعفا داخل کر کے درس دینا اور طبابت کرنا شروع کیا ۔ بیس برس تک بڑے زوروں کے ساتھ درس دیا ۔ طبابت میں بھی بہت

کچھ فروغ ہوا غرضکہ تیس برس سے زیادہ یہاں قیام رہا قریب غدر کے پھر اپنے وطن کو تشریف لے گئے اور وہاں بھی یہی سلسلہ تا حیات قائم رکھا۔

مصحفی کی رائے | مصحفی اپنے تذکرے میں آپ کو اس جملے سے یاد کرتے ہیں کہ "مولوی اولاد علی کاہش جوان چاردہ سالہ مسلم خواں است طبع رواں دارد و مزاج سلیم" مصحفی اور انشا سے جسوقت مقابلہ ہوا تھا اسوقت آپ وہیں تھے اور اپنے اُستاد کی طرف سے حق شاگردی ادا کیا تھا۔ میر مستحسن خلیق حضرت مظفر علی ضمیر مرثیہ گو کے مقابلے میں آپنے بزمانۂ قیام لکھنؤ اکثر مرثیے بے نقط و با نقط لکھکر مجلس عام میں پڑھے جنمیں سے چند مرثیے اسوقت کے منقوط وغیر منقوط راقم کے پاس موجود ہیں۔

انتقال | قصہ مختصر یہ ہے کہ سنہ ۱۲۷۱ھ میں آپ نے انتقال کیا۔ باعث انتقال گزیدگی مار ہوا۔ آپ کی تاریخیں بہت لوگوں نے لکھیں منجملہ اُن کے ایک تاریخ جسکے ہر شعر کے پہلے مصرعہ سے ایک ایک سنہ نکلتا ہے درج ذیل ہے۔

کرد رحلت بے گماں اُستاد من سوی ارم ۱۲۷۱ء	داشت شہرت در فن حکمت بہر شہر و دیار
عالم کامل حکیم حاذق اولاد علے ۱۲۷۱ھ	شد ذکائی و شفائی در غم او دل فگار
از فلک فرمود عیسیٰ سال فوت دیں پرست	بو علی سینہ فگار از مرگ آں عالی وقار ۱۲۷۱ھ

تصانیف | حضرت کاہش نے چند رسالے بزبان عربی فنون مختلفہ میں سات دیوان وقصاید و رباعیات ومخمس وترجیع بند ومراثی ونوحہ جات وغیرہ بزبان عربی وفارسی واُردو یادگار چھوڑی تھی جنمیں سے افسوس کہ اکثر ضائع ہوگئے۔ صرف چار دیوان اُردو کے نواب احمد علیخاں رئیس حسین آباد ضلع مونگیر کے صاحبزادوں کے پاس ہنوز موجود ہیں مگر کسی سبب سے وہ نہ تو انھیں خود شائع کرتے ہیں نہ اُنکے عزیزوں کو دیتے ہیں۔ بعد تلاش بسیار آپ کا مختصر کلام بطور نمونہ برائے ملاحظۂ ناظرین پیش کیا جاتا ہے۔

قفس میں بیٹھے ہیں جو چمن یاد آیا	غنیمت زدوں کو وطن یاد آیا

مرقع میں دیکھی جو مجنوں کی صورت
مجھے اپنا دیوانہ پن یاد آیا

ٹپک شیشۂ مے کو پیمانہ توڑا
ہمیں جب وہ پیمان شکن یاد آیا

اکڑتے ہوئے دیکھ سرو چمن کو
ہمیں بھی ترا بانکپن یاد آیا

ہے اسلام سے ابتو دل تنگ کاہش
یہ کس بت کا میم دہن یاد آیا

مجھے رنگ طلسمات جاں لینے یہ یقین آیا
کہ اپنا رنگ دکھلانیکو وہ غلو نقش آیا

افاقہ درد پہلو میں ہوا تو درد دل اٹھا
فراق یار میں کس رات غش مجکو نہیں آیا

اگر اس سودا ہی وصل یار کا کیونکر نہ سودا ہو
گئے جب آپ سے ہم ہاتھ تب وہ جبیں آیا

مجھے بیخود کیا ایسا تری شیریں بیانی نے
جو زہر تلخ کھایا تو مذاق انگبیں آیا

ستارا آسماں سے رات بھر ٹوٹا کیا کاہش
جبیں پر اپنے افشاں چن کے جب وہ مہ جبیں آیا

ناصحا میں کافر نہیں ہوں نہ دیندار دیں ہوں
جلوۂ دیدار جاناں کے طلب گار دیں ہوں

دیکھتا ہی ہر کوئی چشم حقارت سے مجھے
میں عجب اک جنس ناکارہ خریدار دیں ہوں

ہجر کی شب سے نگھبرا اے دل وحشی مزاج
تو میرا غمخوار ہی میں تیرے غمخوار دیں ہوں

دیکھ گرمی میرے آہ کی جہنم سرد ہو
بحر رحمت جوش مارے ان گنہگار دیں ہوں

کاہش اب صوت انا الحق وہ سکھاتا ہی مجھے
صورت منصور سر دینے کے سر دار دیں ہوں

پریشانی کا قسمت میں ہماری آب و دانا ہی
میں وہ طائر ہوں جسکا دام کاکل آشیانا ہی

میں اک رشک زلیخا کا عزیز کشتۂ غم ہوں
میری بالیں پہ لازم سورۂ یوسف پڑھانا ہی

تیرے آنکھوں میں سرمہ لگاتا ادب کافر
مگر یہ فتنۂ خوابیدہ کو گویا جگانا ہے

نہ خون اس سے نکلتا ہی نہ زخم اسکا نمایاں ہی
خدا جانے میرا دل کسکے تیروں کا نشانا ہی

غبار کارواں ہو کر تو کیا بیٹھا ہی یاں کاہش
عدم کو قافلہ یاروں کا مدت سے روانہ ہی

قفس پر برگ گل رکھنے سے اے صیاد کیا حاصل — گذشتہ صحبتوں کو پھر دلانا یاد کیا حاصل
کہاں وہ دن کہاں وہ سن گل مہوشی تعلق کیا — جوانی کے مزے پیری میں کرنا یاد کیا حاصل
رسائی اُسکے کوچہ میں پس مردن بھی مشکل ہی — صبا اب خاک میری تو نکر برباد کیا حاصل
نہ قاصد ہی نہ نامہ ہی نہ پیغام زبانی ہے — مجھے دیتا ہے تو ناصح مبارکباد کیا حاصل
نگر کاہش پر اتنے وار تو شمشیر ابرو کے — کسیکا خون کرینے سے اے جلاد کیا حاصل

قطعہ

وہ دردمند ہوں کہ کبھی میں نے آجتک — آزردہ دل کیا نہ کسی دل کباب کا
پروانہ کے حضور بجھایا نہ شمع کو — بلبل کے آگے پھول نہ توڑا گلاب کا

رباعی

اس ملک سے دنیا کی ہوس میں آئے — اب جائیں کہاں اجل کے بس میں آئے
مرکر چھوٹے تو کنج مرقد دیکھا — جب دام سے چھوٹے تو قفس میں آئے

فقط سید محمد ارادۃ الحق نبیرہ حضرت کاہش

مسلمانانِ ہندوستان کا پولٹیکل مستقبل

اگرچہ بظاہر حالات دیگر اقوام ہند کے مستقبل و حال سے بالکل غیر مشابہ نظر آتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہی اور ہمارے خیال میں بہت ممکن ہے کہ آج سے بیس برس بعد ملکی معاملات میں مسلمانوں کی وہی پالیسی ہوجائے جو اسوقت کانگرس کے فریق نرم کی ہی اور تیس یا چالیس سال کے بعد مسلمان بھی وہی روش اختیار کرلیں جو اسوقت کانگرس کے گرم فریق نے اختیار کی ہے۔

اسمیں شک نہیں کہ نظر بحالت موجودہ بعض لوگوں کو ہمارا یہ قیاس غلط معلوم ہوگا اور ہم بھی کہتے ہیں کہ غلط معلوم ہونا چاہیے کیونکہ مشرقی بنگال میں ہندو مسلمانوں کی باہمی کشمکش اور پنجاب میں ہندو لیڈروں کی گرفتاری پر مسلمانوں کا اطمینان یا کم از کم بے تعلقی یا سب سے بڑھکر مسلمانوں کی جدید سیاسی انجمن مسلم لیگ کے مقاصد کا نیشنل کانگرس کے مقاصد سے

بالکل متضاد ہونا یہ سب ایسی حوصلہ فرسا اور مایوسی افزا باتیں ہیں جن کے موجود ہوتے ہوئے بظاہر ہندو مسلمانوں کی سیاسی مصالح کا متحد ہو جانا بابت بعید نظر آتا ہے۔

اس موقع پر شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مقاصد مخالف کانگرس نہیں ہیں چنانچہ نواب وقار الملک بہادر نے اپنی ایک اسپیچ میں بمقام علیگڈہ فرمایا ہی تھا کہ حاشا وکلا۔ ہم مسلمان کانگرس کے دشمن نہیں ہیں۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ اپنی قوم کو اس نقصان سے محفوظ رکھیں جسکا انکو اندیشہ ہے۔ .... کانگرس کی کوشش سے مثلاً نمک کا ٹیکس جو ہلکا ہو گیا ہے اس سے تمام اہل ہند کو یکساں فائدہ پہونچا ہے۔ علاوہ اسکے انکی کوششوں سے ہندوستان کے خزانے پر سے مصارف کا بہت سا بار ٹل گیا ہے۔ وقس علیٰ ہذا ایسی کوششوں میں کوئی وجہ نہیں کی کہ ہم ان کی مخالفت کریں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کے احسانمند اور شکر گذار رہیں۔"

لیکن کانگرس کے ان معمولی اغراض کی مزاحمت نہ کرنے سے یہ کسی طرح نہیں ثابت ہو سکتا کہ مسلم لیگ کانگرس کی مخالف نہیں ہے۔ لاریب کانگرس کے مقاصد کو محصول نمک یا ملکی اخراجات کی تخفیف وغیرہ کے چند مسائل تک محدود سمجھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ یہ کہنا کہ ہندوستان پر حکومت برطانیہ کا منشا ریل کی سڑکیں بنانا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ انگریز سڑکیں ضرور بنواتے ہیں لیکن اُن کی حکومت کا اصلی مقصد سڑکیں بنانا ہرگز نہیں ہے۔ اسیطرح اگرچہ کانگرس کی کوشش سے محصول نمک میں ضرور تخفیف ہوئی ہو لیکن اس محصول کم کرانے کو کانگرس کا مقصد اصلی سمجھنا اول درجے کی غلطی ہے۔ کانگرس کا اصلی مقصد جسپر نرم و گرم دونوں کو اتفاق ہی حکومت خود اختیاری سلف گورنمنٹ یا سوا راج ہے اور جو شخص یا جو انجمن یا جو قوم اس مقصد کے خلاف ہی ہم اسکو کانگرس کا مخالف سمجھتے ہیں اگرچہ فروعی معاملات میں وہ اہل کانگرس کا ہمخیال ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس لحاظ سے

مسلم لیگ نیشنل کانگرس کی قطعی مخالف ہے

کیونکہ نواب وقارالملک بہادر کی جس اسپیچ کا حوالہ ہم ابھی دے چکے ہیں اسکا تقریباً ۳/۴ حصہ اسی مضمون پر مشتمل ہی کہ مسلمانوں پر من حیث القوم تحریک حریت و حکومت خود اختیاری کی مخالفت کرنا سب سے بڑا پولیٹیکل فرض ہی۔ چنانچہ نواب صاحب نے ختم تقریر پر مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کو جو نصیحت فرمائی تھی اسکا حرف حرف قابل ملاحظہ ہی کہ "تم فٹ بال کھیلنے میں مشغول ہو یا کرکٹ کے میدان میں کود پھاند کر رہے ہو یا رائڈنگ اسکول میں گھوڑوں پر سوار ہو کر چکر لگا رہے ہو یا ٹینس کے کھیلنے میں سرگرمی دکھا رہے ہو غرضکہ اس قسم کی ہر ایک حالت میں تم اپنے تئیں انگریزی فوج کے سولجر خیال کرو۔ تم تصور کرو کہ انگریزی پرچم تمہارے سروں پر لہرا رہا ہی۔ تم یقین کرو کہ تمہاری یہ دوڑ دھوپ اس لئے ہی کہ تم ایک دن تاج برطانیہ پر اپنی جانیں نثار کرو" اور اڈیٹر صاحب وطن اس سے بھی بڑھکر فرماتے ہیں کہ اگر ضرورت ہو تو انگریزوں کی طرف سے خلیفۃ المسلمین سے بھی جنگ کرنے میں دریغ نکرو۔ غرضکہ مسلمانوں کی موجودہ پالیسی کا رجحان بظاہر مقصد حریت کی جانب نہیں معلوم ہوتا۔ تاہم ان کی گذشتہ اور موجودہ پولیٹیکل حالت کا موازنہ کرنے سے صاف نظر آتا ہے کہ

قطعی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے

اسلئے کہ مسلم لیگ کا جو مقصد آخری (آئڈیل) نواب وقارالملک بہادر نے قرار دیا ہی اسکا ہمیشہ کے لئے قایم رہنا کچھ ضروری نہیں ہی بلکہ برخلاف اسکے گمان غالب یہی ہے کہ پولیٹیکل میدان میں در آنے کے بعد جسوقت اُن کے جذبۂ حریت میں تحریک پیدا ہو گی اُسوقت مسلمان کبھی محض انگریزوں کی اطاعت و خدمت کے افتخار پر قانع نرہ سکیں گے۔

مقام غور ہے کہ آج سے چند ہی سال قبل تک مسلمانوں کی مسلمہ پالیسی یہ تھی کہ ہمکو پالیٹکس میں مطلق حصہ نہ لیکر حکمران قوم کے انصاف پر کامل اعتماد رکھنا چاہیئے لیکن آج اس قسم کے خیالات کو تعلیم یافتہ مسلمان اپنے نام کے ساتھ منسوب کرنا بھی گوارا نہ کریں گے۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی کہ جسطرح زمانے نے پہلی حالت کو دور کر

حالت میں تبدیل کردیا اسیطرح سے دوسری حالت کو تیسری اور اس سے بھی بہتر حالت میں ضرور تبدیل کردیگا چنانچہ

نیشنل کانگرس کی مثال

بھی اس دعوی کی تائید کرتی ہے اسلئے کہ آغاز کانگرس کے زمانے میں حفاظت حقوق کے متعلق ہنود اور پارسیوں کے خیالات بھی بعینہ اسی انداز کے تھے جیسے کہ آجکل مسلمان لیڈروں کے ہیں۔ مثلاً دادا بھائی نوروزجی کو بھی انگریزوں کے انصاف وراستی پر ایسا ہی بھروسہ تھا جیسا اسوقت مسلمانوں کو ہے اور بنگالی پالیٹیشن بھی طلب حقوق وشکوہ جور کے لئے صرف رزولیوشنوں کا پاس کرنا اور ان رزولیوشنوں میں بھی اعتدال وادب کو سختی کے ساتھ ملحوظ خاطر رکھنا ایسا ہی ضروری جانتے تھے جیسا کہ آجکل مسلمان جان رہے ہیں۔ پس جب مسلمانوں کی حالت اسوقت ایسی ہی ہے جیسی کہ کانگرس کی بیس سال قبل تھی تو بیس سال بعد ان کے خیالات کا ویسا ہی ہوجانا جیسے کہ اسوقت فریق نرم کے خیالات ہیں بالکل قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ آیندہ ہمارے زیادہ آزاد خیال ہوجانے کی کیا دلیل ہے اور

مسلمانوں کی موجودہ پالیسی کیوں کمزور ہے

اس کے بہت سے اسباب ہیں مثلاً (۱) تعلیم کی کمی (۲) دولت کی کمی (۳) آغاز حریت کی قدرتی جھجک (۴) ملازمت سرکاری کا بآسانی ملجانا (۵) دیگر اقوام ہند کے ساتھ رقابت کا جوش وغیرہ لیکن بزمانہ آیندہ ان تمام

اسباب کمزوری کا دور ہوجانا بھی یقینی ہے

اسطور پر کہ موجودہ رفتار تعلیم کے لحاظ سے بیس سال کے عرصے میں مسلمانوں کا دیگر اقوام ہند کے برابر ہوجانا بہت ممکن ہے جس سے انکو حصول دولت میں بھی کافی مدد ملیگی علاوہ بریں کچھ تو گورنمنٹ کی عنایت سے، جسکو مسلمانوں کے

ادعائے وفاداری کا انعام سمجھنا چاہیئے، اور کچھ اسوجہ سے کہ فریق گرم کے موئد از خود خدمتِ حکومت سے بیزار ہوگئے ہیں آیندہ مسلمانوں کے لئے میدان ملازمت ضرور زیادہ وسیع ہوجائیگا اور ایک حد تک ان کی بے بضاعتی کی تلافی ہوجائیگی۔ اور جسوقت انکے پاس کافی سرمایہ جمع ہوجائیگا اُسوقت یقیناً وہ طلب حقوق میں زیادہ بیباک ہوجائینگے اور ابتدائی جھجک بھی جاتی رہیگی کیونکہ حرّیت کی خواہش ایک ایسی خواہش ہے جسکی ابتدا ضرور ہوتی ہے لیکن انتہا نہیں ہوسکتی یعنی ایک بار دلمیں پیدا ہوکر پھر وہ برابر بڑھتی ہی رہتی ہے گھٹنے کا نام نہیں لیتی۔ پالیٹکس سے مسلمانونکی بے تعلقی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی کمی تعداد کے باعث ابھی تک انپر عرصۂ ملازمت گورنمنٹ تنگ نہیں ہوا ہے اور ان کو بلا جد وجہد سامانِ فراغت میسر ہوجاتا ہی لیکن یہ حالت ہمیشہ قایم نہیں رہ سکتی ہے اور ایک حد معین کے بعد اُنکو بھی صنعت وحرفت وتجارت کی جانب متوجہ ہونا پڑیگا اور اُسوقت حکومت غیر کے جبر و بے انصافی کی انکو بھی ویسی ہی شکایت پیدا ہوگی جیسی کہ اسوقت دوسری آزاد قوموں کو ہے اور جب آشظر چران کی آنکھیں کھلجائینگی تو ہندو مسلمانوں کی باہمی رقابت اور بے اعتباری بھی بہت کچھ کم ہوجائے گی اور پولیٹکل حیثیت سے تمام باشندگان ہند ایک متحد قوم بنکر یقیناً اس حق کی دعویدار ہونگے کہ

ہندوستان صرف ہندوستانیونکے لئے ہے

اور اس دعوے میں ہندی مسلمان بھی یقیناً شریک ہونگے کیونکہ سلف گورنمنٹ حاصل نہیں ہوسکتی جب تک ہندو مسلمان متحد ہوں اور اسلئے جب کبھی انشاء اللہ تعالیٰ اسکا وقت آیگا اسوقت ان دونوں قوموںکے باہمی تعلقات ہرگز موجودہ تعلقاتِ رشک بے اعتباری کے مانند ہونگے بلکہ حصول آزادی کی کشمکش انکو خود بخود مراعات باہمی کی جانب مائل اور سلف گورنمنٹ کے قابل بنادیگی اور جب یہ حالت ہوگی تو علی الرغم نواب وقار الملک بہادر مسلمانونکو ہنود کی تعداد کثیر کی جانب سے اپنے حقوق کی پامالی کا اندیشہ بھی باقی نہ رہیگا۔ فقط

تاریخ اسلام پر ایک سرسری نظر

(۱)

دنیائے قدیم کے براعظموں میں ایک براعظم ہے ایشیا نام۔ اُسکے جنوب مغرب میں ایک جزیرہ نما ہے جسے عرب کہتے ہیں۔ کہنے کو تو ایک ملک ہے مگر پہاڑوں ریگستانوں۔ ویران اور بنجر زمینوں سے بھرا پڑا ہے جہاں موسم کا کوئی اعتبار نہیں۔ پانی اگر ہے تو کہیں کہیں کنوؤں یا نالوں میں۔ سورج کی چمک الگ آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اور ریگستان کی سوزش قدم نہیں رکھنے دیتی گرمی ہے کہ پسینہ ایڑیوں کو چلا آتا ہے۔ کبھی ہوا چلتی ہے تو لوؤں کی شکل میں کبھی آندھی آتی ہے تو طوفان کی شکل میں جسطرح سمندر کی موجیں اُٹھتی ہیں اور بادل کی طرح گڑگڑاتی ہوئی جہاز کے اوپر سے گذر جاتی ہیں اُسیطرح ہوا کی بھیانک آواز کے ساتھ آسمان پر ریگ کا ایک ابر چھا جاتا ہے اور پھر تھوڑی دیر میں جب سطح صاف ہوتا ہے تو قافلے کے قافلے دبے پڑے ہوتے ہیں۔ اسیطرح جاڑے کے موسم میں انتہا درجہ کی سردی پڑتی ہے یہاں تک کہ بقول ایک عرب شاعر کے "کتا اپنی دُم سے ناک بند کرلیتا ہے" کہ کہیں ہوا کی سردی اُسکے دل و جگر کو ٹھنڈا نہ کردے۔

ایک موسم ہی نہیں۔ باشندوں کی یہ حالت ہے کہ بات بات پر بگڑے جاتے ہیں اور قبیلے کے قبیلے کٹ مرتے ہیں۔ کبھی کسیکا گھوڑا دوڑ میں آگے نکل گیا تو سالہا سال تک لڑائی کی آگ سلگتی رہی۔ کبھی بنو بکر بنو تغلب سے کبھی بنو تغلب بنو بکر سے خواہ مخواہ چھیڑ خانی پیدا کرتے ہیں اور لڑتے مرتے ہیں۔ یہ لڑائیاں یہی نہیں کہ ایک دفعہ ہو کر ختم ہو جاتیں۔ انکا سلسلہ پشتہا پشت اور قرنہا قرن تک جاری رہتا ہے۔ قبیلے سے قبیلے اور خاندان سے خاندان الگ ہو جاتے ہیں۔ لوگوں میں تفرقہ پڑ جاتا ہے۔ آدمی کو آدمی سے نفرت ہے۔ خود

اپنے گھر والے خون کے پیاسے ہیں۔ بت پرستی ہر اک کی گھٹی میں ملی ہے۔ ظلم۔ بیرحمی شقاوت قلب۔ خونخواری ہر اک کی طبیعت ثانی ہو گئی ہے۔ انسان کو پتھروں کی مورتوں پر بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ[1] انسانی محبت کا پتہ نہیں۔ اگر ہے تو شہوات نفسانی کا غلبہ ہے۔ کسی کو یہ احساس ہی نہیں کہ امن و امان کے ساتھ کسطرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ شہوت پرستی کو عروج ہے۔ شراب خواری۔ جوا۔ چوری۔ بے ایمانی ہر طرف ہے۔ عزیز کو عزیز سے محبت نہیں۔ ہمسایہ کو ہمسایہ سے الفت نہیں اور زندگی ایسی خراب ہے کہ بیان نہیں کیجا سکتی

ایسے نازک زمانہ میں قبیلہ قریش میں بنو ہاشم کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس نے اپنی بھولی بھولی آنکھیں ۲۹ اگست ۵۷۰ء[2] کو شہر مکہ میں کھولیں۔ اسکی پیدائش کے چند ہی ہفتے پہلے باپ عالم جاودانی کو سدھار چکا تھا۔ اب ماں نے بھی ولادت کے چند ہی سال بعد رخت سفر باندھا۔ عزیز دادا اپنے پوتے کی یتیمی دیکھکر کھڑا ہو گیا اور اپنے آغوش شفقت میں لے لیا۔ مگر چند سال بعد دادا بھی گذر گیا اور اس دریتیم کی پرورش اُسکے چچا ابو طالب کی سپرد ہوئی۔

غرض اس طرح آپ اپنے چچا کی گود میں پلکر جوان ہوئے۔ آپ انتہا درجہ کے رحیم و کریم تھے۔ مکہ کی گلیوں میں سے جب آپ گذرتے تو بچے گھٹنوں سے لپٹ جاتے اور آپ انھیں پیار کرتے۔ وعدے کے آپ ایسے پکے تھے کہ کبھی یہ نہ دیکھا گیا کہ کوئی وعدہ خلافی آپ سے ظہور میں آئی ہو۔ چوبیس برس کی عمر میں آپ کی شادی حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے ہوئی اور چبیس برس تک آپکا اُنکا ساتھ رہا۔

---

[1] اور یہود کہتے ہیں کہ عزیز اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔

[2] گبن کے قول کے موافق آپ کی پیدائش جسٹنین کی وفات سے چار سال بعد ظہور میں آئی ہے۔ ابو الفدا، الکین اور ابو الفرافیث کے اقوال کے بموجب یہ سن ۸۸۲ اسکندری یا ۱۳۱۶ بخت نصری تھا۔ اس حساب سے ۵۶۹ء آپ کی ولادت کا سن قرار پاتا ہے۔ مسٹر ولیم اسیرزی اور راڈول وغیرہ نے بھی ۵۶۹ء تسلیم کیا ہے۔

آپ خاموش طبیعت پہلے ہی سے تھے۔ شادی کے بعد اور زیادہ تنہائی پسند ہو گئے۔ مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک غار ہے جسے غار حرا کہتے ہیں۔ وہاں اکثر آپ تشریف لیجاتے اور گھنٹوں مراقبہ کی حالت میں رہتے۔ یہاں تک کہ پندرہ برس اسی حالت میں گذر گئے۔ پھر ایک رات جبکہ آپ اسی حالت میں کوہ میں تشریف فرماہیں "ایک نور آسمان سے طالع ہوتا ہے اور ایک شاندار صورت سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ اور کہتی ہے 'اُٹھ تو خدا کا رسول ہے۔ جا اور اُسکے وحدت کا اعلان کر' وہ فرشتہ بتاتا ہے کہ کیا اعلان کرنا چاہئے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ کسطرح عالم پیدا ہوا اور انسان کسطرح خلق ہوا۔ وہ خدا کی وحدانیت۔ ملائک کا راز بتاتا ہے اور اس شئے کی تعلیم کرتا ہے جسکے انجام دینے کے لئے آپکا انتخاب کیا گیا تھا"۔ یہاں سے گھبراتے ہوئے آپ مکان تشریف لیجاتے ہیں اور چپکے سے ایک کمل اوڑھ کر لیٹ جاتے ہیں جیسے کسی کو جاڑا چڑھا ہو۔ بی بی خدیجہؓ پوچھتی ہیں کہ کیا ماجرا ہے۔ آپ دہشت وخوف کے ساتھ سب واقعہ بیان فرماتے ہیں۔ آپ اطمینان بخش لہجہ میں فرماتی ہیں "نہیں تم صادق ہو اور امین ہو۔ کبھی تم نے کوئی وعدہ خلافی نہیں کی۔ خدا کسی ایماندار کو دھوکہ نہیں دیتا۔ یہ تمہارے خدا کا حکم ہے۔ اسے سنو اور بجالاؤ"۔ بی بی کی اس طرح ہمت دلانے سے آپ ہمہ تن مستعد ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پھر چار دانگ عالم میں اک ڈنکا بج جاتا ہے کہ محمد الرسول اللہ (صلعم) زمین عرب میں مبعوث ہوئے اب چار طرف سے کفر کی ظلمت مٹ جائیگی اور خدائے واحد کا بول بالا ہوگا۔ عرب ایک حکومت بنجائیگا اور مسلمان علم وفضل کی مشعلیں یورپ میں لیجا کر روشن کرینگے۔

سب سے پہلے جو آپ پر ایمان لائے وہ آپ کے بہت قریب کے عزیز تھے۔ تین سال تک برابر نہایت خاموشی اور مستعدی کے ساتھ تبلیغ اسلام کرتے رہے اور صرف ۳۰ آدمی ایمان لائے اسکے بعد آپ نے علانیہ وعظ فرمانا شروع کیا کہ خدا کی ذات کو واحد جانو۔ انسان کی قربانی سے پرہیز کرو۔ شہوات نفسانی سے بچو۔ شراب مت پیو اور ناپاک زندگی سے کنارہ کرو۔ علانیہ اسطرح اپنے مذہب کے

خلاف مشرکین عرب کی غیض و غضب کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی اور مسلمانوں پر ایسی مظالم کئے جانے لگے کہ بیان سے باہر ہے۔ جب کسی مسلمان کو پاتے تو سلگتی ہوئی بالو پر چت لٹا کر سینہ پر بھاری بھاری پتھر رکھ دیتے اور کہتے کہ خدا و رسول سے انکار کرو۔ ڈر کے مارے مسلمان اسوقت تک چپکے چپکے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ مگر جب حضرت عمرؓ ایمان لائے تو نمازیں علانیہ ہونے لگیں اور کفار سے زیادہ جھگڑے شروع ہوئے۔ جب کفار کے مظالم حد سے گزر گئے تو مسلمانوں نے ہجرت شروع کی۔ کوئی حبش چلا گیا کوئی یثرب۔ ایک مرتبہ یثرب کے چند تاجر مکہ آئے تھے۔ یہاں وہ ایمان لائے اور رسول خدا کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس بیعت کو بیعۃ العقبہ کہتے ہیں جس نے یثرب (یعنی مدینہ) کا راستہ پیدا[15] کر دیا۔ بالآخر جب کفار نے اسقدر زیادتیاں شروع کیں تو رسول خدا نے بھی مدینہ کا ارادہ فرمایا۔ جمعہ کے دن جولائی سنہ ۶۲۲ء کی سولہویں تاریخ کو آپ نے مکہ کو خیرباد کہا مسلمان اسے سنہ ہجرت کہتے ہیں۔ اور اسی سال سے اپنے سنہ کا شمار کرتے ہیں۔

مدینہ میں آپکے تشریف لاتے ہی مسلمانوں کا دائرہ وسیع ہو گیا اور جوق جوق لوگ ایمان لانے لگے۔ مشرکین مکہ سے یہ نہ دیکھا گیا کہ آپ یہاں اطمینان کے ساتھ تلقین مذہب فرمائیں۔ مدنیوں کا رعب بھی مکہ والوں پر کچھ نہ تھا اور یہ لوگ انھیں ایسا ہی سمجھتے تھے۔ جیسا کہ آجکل ہم بنگالیوں کو سمجھتے ہیں۔ تاہم چڑھائی کرنے میں بہت اہتمام کیا گیا اور اسلام کی پہلی جنگ شروع ہوئی جو جنگ بدر کے نام سے ہمیشہ یادرہیگی۔ ہر دو جانب سے ایک ہولناک[16] کشمکش شروع ہوئی اور آندھی اور ریگ کے طوفان نے آکر کفار کو اندھا کر دیا اور مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ حضور پرنور صلعم کا یہ پہلا حملہ تھا جو محض ایک بیرونی حملہ کے مدافعت میں کیا گیا تھا مگر اب وہ زمانہ آتا ہے کہ لڑائیاں اور زیادہ ہوتی ہیں۔

---

۱۵ دیکھو اسپرٹ آف اسلام مصنفہ مسٹر امیر علی۔

۱۶ دیکھو اسپرٹ آف اسلام مصنفہ مسٹر امیر علی۔

یہ سال ۳ھ؁ ۶۲۴ء ہے اور اُحد کے پہاڑ پر یثرب (یعنی مدینۃ الرسول) سے ۶ میل کے فاصلہ پر شمال میں قریش بدر کا بدلہ لینے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ اور اسلام کی دوسری جنگ مدافعت شروع ہوتی ہے۔ اسمیں مسلمانوں کا بہت نقصان ہوتا ہے اور ستر جلیل القدر صحابی شہید ہوتے ہیں شروع میں مسلمان کسیقدر پیچھے ہٹتے ہیں مگر آخر میں کامیاب ہوتے ہیں۔ دوسرے سال پھر مدینۃ الرسول پر حملہ ہوتا ہے اور دس ہزار قریش ابوسفیان کی ماتحتی میں یثرب کا محاصرہ کرتے ہیں۔ اس جنگ کا نام جنگ خندق ہے کیونکہ اسمیں رسول خدا صلعم نے مدینہ کے گرد غنیم کے حملوں سے بچنے کے لئے ایک خندق کہودی تہی۔ بیس دن تک یہ لڑائی رہی اور بہت سے مشرک شیر خدا کی تلوار کے بھینٹ چڑہے۔ آندہی پانی اور اولوں کے طوفان نے دشمنوں کے خیموں کو الٹ پلٹ کر دیا۔ خود کفار میں آپسمیں تنازعات شروع ہوگئے اور قریش کے یار و مددگار ایک ایک کرکے الگ ہونے لگے اور مکہ والوں کو سوائے ہزیمت کے کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ یہودیوں کی ایک جماعت مدینہ کے قریب رہتی تہی۔ انسے رسول خدا اور مذہب اسلام کا عروج دیکھا نہ گیا۔ کفار کے ساتھ سازباز رکھکے انہوں نے مسلمانوں کو پریشان کرنا شروع کیا آپ نے انہیں اس حرکت سے باز رکھنا چاہا اور دعوت اسلام دی مگر اُن کی سرکشی برابر قایم رہی۔ بالآخر اُنکا استیصال ضروری معلوم ہوا اور پندرہ یوم کے مقابلہ کے بعد انہیں اپنی شرارت کا مزا چکھنا پڑا۔ بنو اسیر اِنسے بہی زیادہ سزا کے مستحق تہے کیونکہ انہوں نے آپ کو شہید کرنے کی تدبیریں کرنا شروع کی تہیں۔ مسلمانوں نے اس پاداش میں اُنکے قلعہ کو جو شہر سے تین میل کے فاصلہ پر تہا جا گھیرا اور اُن کے ظلم و ستم سے ملک کو پاک کیا۔ بنو قریظہ یہودیوں کا ایک قبیلہ تہا جنہوں نے جنگ خندق میں کفار کو بہت کچھ مدد دی تہی جب خندق کی لڑائی ختم ہوئی تو مسلمانوں نے قبل اسکے کہ ہتیار رکھیں اُن کے مقامات کو جا گھیرا پچیس دن کے محاصرہ کے بعد وہ مقامات مسخر ہوئے اور اُن کے حرکات کی انہیں سزا دیگئی۔ مدینہ کے شمال مشرق میں چہہ دن کے فاصلہ پر ایک بہت قدیم

شہر تہا خیبر نام جو یہود عرب کی طاقتوں کا مرکز تہا۔ ان سب کا استیصال ضروری معلوم ہوا کیونکہ جسقدر مزاحمتیں اشاعت اسلام میں یہودیوں کی تہیں مشرکین مکہ کے بعد کسی دوسری قوم سے ظہور میں نہیں آئیں اسلئے دو سو سوار اور چودہ سو پیدلوں کے ساتہہ رسول خدا صلعم نے ان پر حملہ فرمایا یہ محاصرہ نہایت سخت اور دقت طلب تہا سات مرتبہ پے درپے محاصرہ کیا گیا اور اُٹہایا گیا آخرکار حضرت علی کرم اللہ تعالے وجہہٗ سالار لشکر بنائے گئے اور آٹھویں مرتبہ محصورین پر اسقدر سختیاں کی گئیں کہ قلعہ فتح ہو گیا شیر خدا کے زبردست بازو نے قلعہ کو اکہاڑ کر پہینکدیا ابورافع رسول خدا کے خادم فرماتے ہیں کہ میں نے اور سات اور آدمیوں نے اُس پہاٹک کو اُٹہانے کی کوشش کی مگر ممکن نہ ہوا۔

فتح کے بعد خیبر کا سردار قتل کیا گیا باشندوں کو اماں دیگئی حج کعبا ور فتح مکہ کا آپ کو عرصہ سے خیال تہا اسلئے حج کے ارادہ سے حاجیوں کی ایک بہت بڑی جماعت کے ساتہہ آپ نے مکہ کا قصد کیا قریش سے دس برس کے لئے صلح کی گئی اور مسلمان حج کی خاطر مکہ میں داخل ہوئے اور تین دن میں عام مناسک پوری کر کے چوتھے روز مکہ کو چہوڑ دیا۔ اس زمانہ میں حضرت خالد ابن ولید اور عمرو بن العاص بہی ایمان لائے مگر کفار مکہ اپنے معاہدہ صلح پر قایم نہیں رہے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں اُن کے دشمنوں کی مدد کرنی چاہی۔ مسلمانوں کی جماعت میں اسوقت دس ہزار کے قریب سپاہی ہو گئے تہے۔ کفار نے بہی معاہدہ صلح کے خلاف ورزی کر کے اپنے تئیں پابند صلح نہیں رکہا تہا اسلئے آپ نے مستقل طور پر فتح مکہ کا ارادہ کیا۔ حضرت کا رعب اُسوقت ایسا بڑہ گیا تہا کہ ابوسفیان نے بلا لڑے شہر آپ کے حوالہ کر دیا تہا۔ باشندگان مکہ کے ساتہہ جو بیس برس سے آپ کے جانی دشمن تہے آپنے نہایت انسانیت کا برتاؤ کیا اور اسپر اکتفا کی کہ خانہ کعبہ کے تین سو ساٹہہ بتوں کو توڑ کر کعبہ اسلام کی وہ عمارت تعمیر کی جائے جو آجتک موجود ہے۔ اسکے بعد چند چہوٹی چہوٹی لڑائیاں حنین۔ طائف اور موتہ وغیرہ کی ہوئیں جن میں

مسلمانوں کو بے شمار فوائد حاصل ہوئے - اسلام کی قوت اب اعلیٰ درجہ پر پہونچ گئی تھی اور حضرت (صلعم) نے شام کی یونانی حکومت پر جس سے سرحدی حملہ کا خوف تھا چڑھائی کرنیکا ارادہ فرمایا مگر یونانی اپنی حرکات سے باز آئے اور لڑائی ہونے نہ پائی فتح مکہ کے پہلے حضرت (صلعم) نے شان اسلام کو بڑھانے کی غرض سے تمام اطراف وجوانب کے بادشاہوں کے پاس ایلچی بھیجے اور انہیں دعوت اسلام دی ہرقل روم اور خسرو ایران کے پاس آپ کے سفیر پہونچے تھے - اور تبلیغ رسالت جیسا چاہئے ہو چکی تھی۔

واقعہ ہجرت کو اب دس برس گذر گئے اور اخیر مرتبہ حج بیت اللہ فرماکر آپ مدینہ واپس آئے - یہاں سخت بیمار پڑ گئے حتیٰ کہ صحت کی طرف سے مایوسی ہو گئی اور پیغمبر خدا صلعم نے قصد رحلت فرمایا - رحلت سے تین دن پہلے آپ نے مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے لئے تشریف لیجانیکا ارادہ فرمایا مگر ضعف کی وجہ سے حرکت نہ فرما سکے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کو نماز پڑھانیکا حکم دیا - پندرہ دن آپ کی علالت کو ہو گئے تھے - پیر کا دن تھا اور ۶۳۲ء کے ماہ جون کی آٹھویں تاریخ تھی کہ حضرت عائشہؓ کے مکان میں اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف آپ نے کوچ فرمایا - انا للہ وانا الیہ راجعون۔

"اس وقت کل عربستان عمان تک اسلام قبول کر چکا تھا - عرب یہود و نصاریٰ سب مذہب جدید پر ایمان لا چکے تھے - تمام باشندگان عرب ایک ملت میں داخل ہو گئے تھے اور وہ دن قریب آگیا تھا کہ جوش ایمان میں سرشار عرب اپنے لائق و بہادر سپہ سالاروں کے جھنڈوں کے نیچے تمام عالم کو فتح کریں۔

حضرت کی وفات کے بعد ہی فوراً اختلاف آپ کے جانشین کے انتخاب میں شروع ہوا اس سے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ اسلام کی کشتی جسکا ناخدا ابھی دوسرے عالم کو سدھارا ہے آپس کی کشمکش سے ڈگمگا کر ڈوب نہ جائے - انصار ایک طرف

لہ دیکھو تمدن عرب از موسیو لی بان لہ ایضاً

ضد کر رہی تھی کہ ہم میں سے خلیفہ منتخب ہونا چاہیے۔ قریش کہتے تھے کہ ہم سوائے قریش کے اور کسی کی اطاعت نہ کرینگے۔ یہ وہ ملکی اتحاد جسکی بنا آنحضرت (صلعم) نے ڈالی تھی محض اتحاد دینی کے سبب سے تھا اور ممکن تھا کہ یہ اتحاد دینی آنحضرت کی وفات کے ساتھ ختم ہو جائے ...... مگر اصحاب رسول کی خوش تدبیری تھی جسنے انہیں ان موانع پر کامیاب کیا۔ اُنھوں نے خلافت کے لئے ایسے ہی اشخاص کو انتخاب کیا جن کی ساری غرض اشاعت دین محمدی تھی"۔ حضرت ابو بکر کے ہاتھ پر حضرت عمر کے فوراً بیعت کرلینے سے تمام لوگ داخل بیعت ہونے شروع ہوئے اور خلفائے راشدین کا زمانہ شروع ہوا۔

معشوق حسین خاں۔ بی۔ اے

حکمت عملی مولفہ مولوی سجاد میرزا بیگ صاحب دہلوی

فلسفۂ عملی پر یہ ایک مبسوط اور جامع کتاب ہے۔ اُردو میں اس فن پر کوئی کتاب ایسی جامعیت سے نہیں لکھی گئی ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو اس زمانہ اور اس ملک کی ضرورتوں کے قابل بنانے کی کوشش کی ہے اور افراد انسانی اس ملک کی روحانی ارتقا کی تدابیر کیساتھ ساتھ قومی ترقی اور عزت حاصل کرنیکے اصول بھی بیان کئے ہیں اور مشرقی و مغربی علماء کی کتابوں سے وہ مضامین اخذ کرکے درج کئے ہیں جو انسان کی ذات میں جوہر شرافت پیدا کرنے والے اور اسکو زندگی کے مختلف مدارج۔ مختلف زمانوں اور مختلف حالتوں میں اصول حکمت پر کاربند رکھنے والے ہیں تاکہ نفوس انسانی میں حکمت کی ماہیت کے بعد اُسپر عمل کرنیکی قوت پیدا ہو۔ چونکہ معاشرت اور تمدن کی اصلاح کے لیے عورتوں کی اصلاح اور حقوق کی نگہداشت ضروری ہے۔ لہذا موقعہ بموقعہ اسکا ذکر بھی کیا ہے۔ اسلئے اس کتاب کا مطالعہ مردوں اور عورتوں دونوں کو ضرور اور مفید ہے۔ اس کتاب کی عبارت نہایت صاف شستہ اور رواں ہے اور چونکہ مغربی و مشرقی خیالات کا مجموعہ ہے مضامین میں متانت و دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اگرچہ نہایت دقیق مسائل پر بحث کی گئی ہے لیکن طرز بیان ایسا شگفتہ اور دلنشین ہے کہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں۔ بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انسان کو آزاد، دلیر، غیر تند با حوصلہ، پرجوش ہونے اور جہات امور پر نظر رکھنے، جائز آرام اور لذائذ کا حظ اُٹھانیکی تعلیم دی گئی ہے، کیونکہ قوت فاعلہ کی ترقی سے انسان میں بلند حوصلگی پیدا ہوتی ہے اور اگرچہ قوت منفعلہ کی خوبیاں بھی جا بجا بیان ہوئی ہیں لیکن اس انداز سے ہیں کہ انکا میلان بست ہمتی کیطرف نہو۔ ان خصوصیات میں یہ کتاب دوسری اخلاق کتابوں سے فائق ہے۔ کتاب بلحاظ طبع کے لحاظ سے بھی عمدہ ہے۔ حجم۔ تقریباً ساڑھے چار سو صفحے قیمت ۲ پتہ۔ سجاد مرزا بیگ۔ بازار عیسے میاں۔ حیدرآباد دکن

ایک خط ایسے دوست کے نام جو بہت سے مضامین کا مطالعہ کرتا تھا

ترجمہ

(از پی - جی - ہمرٹن)

یہ امر اب بالکل ناممکن ہوگیا ہے کہ انسان اپنے آپ کو علم کے ایک ہی شعبے تک محدود رکھ سکے۔ غالباً آپ ہر طرح سے ایک ایسے شخص کا سچا نمونہ ہیں جسکی تربیت اور تعلیم زمانہ موجودہ کی تہذیب و شائستگی کے مطابق کامل طور پر ہوئی ہو۔ چنانچہ آپ نے اسقدر زیادہ اور اسقدر مختلف مضامین کا مطالعہ کیا ہے کہ صرف انکی فہرست سے آپ کے دادا کو استعجاب اور حیرت ہو اگر اونکی روح پھر اپنے قدیم مسکن تک آسکے۔ تاہم آپکے دادا جان ایک بڑے مہذب اور تعلیم یافتہ جنٹلمین خیال کئے جاتے تھے اور مطابق اپنے زمانہ کے خیالات اور ضروریات کے وہ ایک اچھے عالم تھے خاصکر زبان لیٹن میں۔ کیونکہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے گریک کو کبھی آسانی کے ساتھ نہیں پڑھا اور یونیورسٹی کی تعلیم کے اختتام پر تو اسے بالکل ترک ہی کردیا۔ انکی لیٹن روزانہ استعمال اور مشق سے (کیونکہ وہ کسی روز بلا کسی پرانے مصنف کے تصانیف دیکھے ہوئے نہ رہتے تھے) نیز بلحاظ انکی علمیت صحیح اور کامل ہونیکے کام کے لئے ہر وقت اسی طرح طیار رہتی تھی جیسے بکنگھم کے زین کسے ہوئے گھوڑے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس ایک زبان سے تربیت اور اسکے لٹریچر کے عمدہ ترین اثر کو اس سے کہیں زیادہ حاصل کیا تھا جتنا کہ بعض بہت سی زبانوں کے جاننے والے دس بارہ زبانوں سے حاصل کرسکتے ہیں۔ وہ کوئی نئی زبان نہ جانتے تھے ان کو فرنچ کے ناقص طور پر پڑھ لینے اور سمجھ سکنے کا دعوے بھی نہ تھا۔ جرمن زبان کو تو اسکے زمانے میں بہت ہی کم لوگ پڑھا کرتے تھے۔ انہیں کسی قسم کی سائنس کی تعلیم نہ ملی تھی بجز علم حساب کے جسکی نسبت بھی میں نے ان کو یہ کہتے سنا ہے کہ انہیں بچپن کبھی اس میں لیاقت کامل نہ ہوئی۔ فنون لطیفہ سے وہ بالکل بے بہرہ تھے۔ اسلئے سبب یہ ہے کہ میرا قیاس کہتا ہے کہ ان کو پیگاٹ اور سٹاٹس

میں تمیز کرنا بھی محال ہوتا۔ انتہا یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تمام عمر میں کسی قسم کے آلۂ موسیقی کا استعمال نہ کیا تھا۔ اپنی دراز اور پرامن زندگی میں جو فرصت ان کو ملی اسے انہوں نے لیٹن اور انگریزی زبان کے نذر کر دیا لیکن ان دونوں زبانوں میں سے ان کو لیٹن میں زیادہ لطف ملتا تھا۔ نہ اس وجہ سے کہ وہ ایک خود نما عالم تھے اور اس سبب سے اسے ترجیح دیتے تھے بلکہ اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ انھیں زمانۂ موجودہ سے بالکل باہر نکال کر ایک دوسرے ہی عالم میں پہونچا دیتی تھی اور اس سے ان کو ایک قسم کی تغیر کامل کی فرحت نصیب ہوتی تھی۔ ان کی نسبت ہر شخص کا جس سے ان کی ملاقات تھی، یہ خیال تھا کہ وہ ایک مہذب اور تعلیم یافتہ جنٹلمین ہیں جیسا کہ وہ فی الحقیقت تھے بھی۔

آپ میں اور اس لیٹن کے اچھے عالم میں صرف ایک پشت کا فصل ہے مگر آپ کے اور اُن کی علمی قواعد زندگی میں کتنا بڑا فرق موجود ہے؟ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے۔ میں اسکی ایک فہرست ہی نہ دیدوں لیکن شاید وہ بھی مکمل نہ ہوگی۔

گریک - لیٹن - فرنچ - جرمن - اٹیلین علم ہندسہ - علم کیمیا - علم معدنیات علم الارض - علم نباتات - نظریۂ موسیقی اور اسکی مشق نظریۂ مصوری - آئیل اور واٹر کلر کی تصویریں کھینچنے کے اعمال - فوٹوگریفی - تانبے پر تیزاب کے ذریعہ سے نقش و نگار بنانا وغیرہ وغیرہ یعنی چھہ زبانیں (انگریزی کو ملاکر) اور چھہ قسمیں سائنس کی (علم معدنیات اور علم الارض کو ایک سمجھکر) اور پانچ شاخیں یا شعبے فنون لطیفہ کے۔

انگریزی زبان کو علحدہ کر کے، کیونکہ اسکی نسبت ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ فطرتاً ہر انگریز کو آجاتی ہے۔ اگرچہ اسمیں بھی اچھی دستگاہ حاصل ہونے کے لئے برسوں کی مدت چاہیئے۔ آپ کے سولہ مختلف مشاغل قرار پاتے۔ اگر موسیقی اور مصوری کے ذہنی مسائل کو اُن فنون کے اعمال کے ساتھ شامل کر لیجئے، اگرچہ فی الحقیقت مسائل ذہنی ان فنون کی مشق و عمل سے بالکل علحدہ ہوا کرتے ہیں۔ لیکن اسپر بھی تو علم کے چودہ شعبے باقی رہتے ہیں جسمیں سے ہر ایک پر ایک آدمی کی پوری زندگی صرف ہوسکتی ہے۔ اگر آپ انمیں سے ہر ایک پر اپنا کچھہ وقت روز صرف کرنا چاہیں تو آدہ گھنٹہ سے زاید بمشکل صرف کر سکینگے۔ اور یہ بھی

اس حالت میں کہ آپ پیشہ ور نہیں ہیں اور اسلئے پیشہ کے مشاغل سے آزاد ہیں۔ نیز یہ کہ آپ کسی خاص مضمون کے ساتھ حد سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے جس میں وقت زیادہ صرف ہو جائے اور دوسرے مضامین کا ہرج ہو۔

آپ کے دادا جان اگرچہ اس زمانہ میں ایک بالکل دیہاتی اور جاہل آدمی خیال کئے جائینگے مگر سچ پوچھئے تو ان کو چند ایسے علمی فائدے حاصل تھے جو آپ کو بھی اُنسے زیادہ علمیت رکھنے والے پوتے کو نصیب نہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ بار مشاغل کے احساس سے بالکل بچے ہوئے تھے اُنکو کبھی یہ تکلیف دہ خیال نہ ہوتا تھا کہ جو کچھ مجھے کرنا ہے اُسکی مناسبت سے کافی وقت نہیں۔ وہ معلومات کے ذخیرہ کو یوں بڑھاتے جاتے تھے جیسے ایک موٹی لیڈی اپنے جسم کے موٹاپے کو اکل وشرب کے خواہشات کو پورا کرنے سے ترقی دیتی رہتی ہے وہ کمی اور تنگی وقت کی احساس کی تکلیف سے آزاد ہونے کے ساتھ ہی اپنے علم میں کامل نہ ہو سکنے پریشان کن خیال سے بھی آزاد تھے۔ بیشک وہ مثل ایک اگلے زمانے کے رومن کے لیٹن نہیں جانتے تھے۔ تاہم ان کو کبھی کسی ایسے پرانے وقت کے رومن سے ملاقات کا اتفاق نہ ہوسکتا تھا جسکی تیز اور پورے طور سے سمجھ میں نہ آنیوالی گفتگو سے ان کو شرمندگی اُٹھانی پڑتی ان کو اپنے زمانہ کے ایسے سے اچھے لیٹن جاننے والے سے ملاقات کا اتفاق ہوتا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ میں اس زبان کے متبحر عالموں میں سے ایک متبحر عالم ہوں۔ جب کبھی وہ اپنے مطالعہ کے کمرہ میں داخل ہوتے تھے تاکہ پاکیزہ مصنفوں کے ساتھ جن سے انہیں ایک قسم کا انس تھا چند گھنٹے مسرت اور لطف کے ساتھ گذریں تو وہ یہ خوب سمجھتے تھے کہ وہ اس سوسائٹی میں بلا کسی درمیانی ذریعہ کے بلا توقف اور اچھی طرح سے داخل ہو سکینگے۔ ان کو محض لفظی مشکلات کے بیرونی کمرہ میں انتظار کی ضرورت نہ ہوتی تھی بلکہ وہ فوراً ایسے مقام پر جا پہنچتے تھے۔ جہاں اگلے خیالات کی ہوائیں موجود ہوتی تھیں اور وہ انکی لطیف خوشبو سے مسرت اندوز ہوتے تھے۔ اور اس معاملے میں ایک مضمون کا عالم ہمیشہ مختلف مضامین میں معلومات رکھنے والے پر فروغ رکھتا

ہے جسکی سے ایک بڑی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ اُسے ہمیشہ بیرونی کمروں میں انتظار کرنا اور وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔ قواعد زبان اور لغات کو لٹریچر کے لئے، نقص نقشہ کشی و رنگ آمیزی کو مصوری کے لئے اور ناقص سُروں میں گانے کی مشق کو موسیقی کے لئے بیرونی کمرے سمجھنا چاہیئے۔ اور سب سے خراب امر یہ ہے کہ مختلف معلومات رکھنے والا ایک شخص جب کبھی ان بیرونی کمروں سے گذر ہی جاتا ہے تو اسکو اسوقت سے ایک سال آیندہ تک اپنے داخلہ کے متعلق کوئی یقین ہو سکتا۔ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ اس درمیان میں دروازہ اسکے لئے بند ہو جائے۔ بیشک علم کے ہر مختلف کمرہ کے متعلق یہ قاعدہ مقرر ہے کہ صرف وہی شخص اسمیں فوراً داخل ہو سکتا ہے جو وہاں روز حاضر ہوتا رہے۔

جس شخص کے علمی مشغلے بکثرت ہوتے ہیں اسکی مصروفیت ان سب پر کبھی یکساں اور ایک ساتھ نہیں ہو سکتی۔ کبھی تو اپنے رجحان طبیعت کے باعث اور کبھی ضرورت کی وجہ سے وہ مجبور ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے پر فوقیت دے اگر آپ پندرہ مختلف مشاغل رکھتے ہیں تو انمیں سے دس ایسے ہونگے جنپر کچہ تو بہ یکجائی ہوگی۔ ایسے مشاغل کے لئے جن پر توجہ نہیں ہوتی جو استعارہ عموماً استعمال کیا جاتا ہے وہ دھات کے زنگ لگجانے سے لیا گیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ مشاغل زنگ آلودہ ہوگئے ہیں لیکن یہ استعارہ اسقدر کمزور ہے کہ مفہوم کو پورے طور پر ادا نہیں کر سکتا اگر ہم احتیاط کو کام میں لائیں تو نہایت آسانی سے دھات کو بلکہ صیقل شدہ لوہے کو بھی زنگ سے محفوظ رکھ سکتے ہیں اور زنگ سے بچانیکے لئے ایک بندوق یا چاقو کا برابر استعمال میں رہنا لازمی نہیں ہے۔ چنانچہ بندوق ساز اور چاقو وغیرہ بنانے والے خوب جانتے ہیں کہ کس طور سے یہ چیزیں زیادہ مقدار میں زنگ سے محفوظ رہ سکتی ہیں بلا اسکے کہ وہ برابر زیر استعمال رہیں۔ لیکن کوئی شخص علم کو قایم نہیں رکھ سکتا تاوقتیکہ اسکو استعمال میں نہ لاتا رہے۔ اس استعارے میں ایک اہم تر نقص اور بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ علم بلا عمل کی ابتری کے متعلق اس سے ایک غلط خیال پیدا ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ بے توجہی سے کمالِ علم میں جو نقصان واقع ہوتا ہے وہ صرف پالش

کی خرابی یا صرف سطحی خوبصورتی کے زائل ہونے پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ اس سے سارے نظام عمل میں پورا پورا فتور واقع ہوجاتا ہے۔ ایک زنگ آلودہ چیز کو ہم ہر حال استعمال میں لاسکتے ہیں مگر ایک ایسی شے جسکے ترکیبی اجزا میں سے کوئی جزو ضائع ہوگیا ہو اسوقت تک کام نہیں دیسکتی جبتک کہ وہ ضائع شدہ جزو اپنے مقام پر ترکیب سے نہ لگادیا جاے۔ معمولی مادی نقصانات میں سے کوئی نقصان اس دماغی مضرت سے مشابہت نہیں رکھتا جو ہم لوگوں کو کسی شغلے کی جانب سے اپنی توجہ اور مصروفیت کو ہٹالینے سے اٹھانا پڑتا ہے۔ بے توجہی کو شل اس دشمن کے سمجھ لیجئے جو ہمارے زین سے تنگ، ہمارے لگام سے دہانہ ہماری کشتی سے پتوار اور ہماری گاڑی سے ایک پہیہ نکال لیتا ہے اور درحقیقت ہمکو نقل و حرکت کے ان ذریعوں پر محض برائے نام قابض چھوڑ جاتا ہے کیونکہ عملی طور پر ہمارے لئے انکا ہونا نہونا برابر ہوتا ہے۔ اور جس طرح ایک دشمن اُن پریشانیوں سے پیدا ہوجانے والی دیر کو اپنے منصوبوں کو عمل میں لانے کے لئے غنیمت سمجھتا ہے اسیطرح جب ہم اس کوشش میں مصروف ہوتے ہیں کہ اپنے علم کے ضائع شدہ حصول کو پھر سے حاصل کریں تو وہ موقع جبکہ ہمکو اسکی بہت بڑی ضرورت ہوتی ہے ہاتھ سے نکلجاتا ہے صرف وہی علم جسے ہم ہمیشہ استعمال میں لاتے رہتے ہیں بوقت حاجت ہمارے کام آسکتا ہے وہ مضامین جو اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کے استعمال میں لانے کی عموماً ضرورت نہیں پڑا کرتی بہت ہی مشکل سے دماغ میں قایم رہ سکتے ہیں۔

علم تشریح اس امر کی شاید سب سے اچھی مثال ہے۔ ہر وہ شخص جسنے اسمیں کوشش کی ہے خوب جانتا ہے کہ کس مشکل سے یہ حافظہ میں قایم رہ سکتا ہے۔ علم تشریح کے ماہر کہتے ہیں کہ قبل اسکے کہ ہمیں اسمیں کچھ دستگاہ ہواسے چھہ بار پڑھنے اور بھول جانے کی ضرورت ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ علم تشریح زندگی کے معمولی ضروریات سے اسقدر علٰحدہ اور دور ہے کہ بہت ہی کم اشخاص کو، علاوہ اس وقت کے جبکہ وہ اسے پڑھتے ہوں، اسکے استعمال کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

البتہ وہ چند لوگ جن کو اُسکی روزانہ ضرورت رہتی ہے اُنہیں اس علم کی باتیں ایسی

آسانی سے یاد رہتی ہیں جیسے ایک شخص کو اس ملک کی زبان جسکا وہ باشندہ ہو سینٹ
آبن ڈیکرول کا کارخانہ جسمیں ڈاکٹر روز و علم تشریح سے متعلق عجیب عجیب نمونے
طیار کرتے ہیں، اکے کاریگر علم تشریح سے اسقدر واقفیت رکھتے ہیں جیسے کہ ایک
مصور اپنے پلیٹ کے رنگوں سے واقف ہوتا ہے۔ اُن کو نہ کبھی تشریح کی باتیں بھولتی
ہیں نہ کبھی ان کے معلومات میں خلل پڑجانیکے باعث سے، جسکا نتیجہ عارضی ناقابلیت
اور تاخیر ہوا کرتا ہے، عملاً انکا علم فضول ثابت ہوتا ہے۔

کسی خاص مضمون کے ساتھ انس کا ہونا، اسمیں مسرت آمیز شغف و واقفیت کیساتھ مصروف رہنا اور اسکے ہر حصہ پر محبت اور محنت کے ساتھ کوشش کرنا، جسطرح کہ ایک چھوٹا سا کاشتکاری کرنیوالا زمیندار خاص اپنی زمین کی زراعت میں مصروف رہتا ہے، ایسی حالت کو، دماغی زندگی کی، کم از کم جہانتک مطالعہ علوم کا تعلق ہے، ایک قابل رشک حالت سمجھنا چاہیئے۔ لیکن اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بھی قابل لحاظ ہے۔

ہمارے لئے پہلی دقت ہماری تعلیم کے باب میں پائی جاتی ہے۔ زمانہ موجودہ کی تعلیم بہت سی چیزوں کی ابتدا اور صرف ابتدا ہوتی ہے۔ ایک دولتمند انگریز کا قول ہے کہ میرا خیال اپنے لڑکے کی تعلیم کے بابت یہ نہیں ہے، کہ میں اسکو بزمانہ کم عمری کسی چیز میں خاص طور پر قابل کردوں بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ بہت سی چیزونکی ابتدائی مشکلات پر غالب ہوجائے تاکہ جب وہ آئندہ اپنے مضمون مطالعہ کا انتخاب کرے تو جس مضمون کو وہ پسند کرے اُسکے لئے اسمیں اجنبیت کی شان نہ رہے" آجکل باپ عموماً لڑکے کو بہت سی چیزیں پڑھنے کی اجازت دیدیتا ہے کیونکہ جب کسی ایک چیز کا انتخاب مدنظر ہوتا ہے تو وہ کسی خاص مضمون کے منتخب کرنے سے ڈرتا ہے اسکا خیال یہ ہوتا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ میرے انتخاب میں غلطی ہوجائے۔ جب نسل انسان کے ترکہ میں اسقدر دولت نہ تھی تو اسطرح کی کوئی پریشانی بھی نہ ہوتی تھی۔ اگلے وقت کے ایک یونانی کی تعلیم کا حال سُنو۔ یہ شخص اتھنیس کے مشہور افراد میں سے ایک فرد تھا جو نہایت ہی مہذب اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ سوسائٹی میں رہتا تھا اور دماغی و جسمانی ترقی کے لحاظ سے اپنی عالیشان قوم

کا ایک کامل نمونہ تہا۔ وہ ایک نہایت ہی فصیح اور پر زور اسپیکر تہا نیز بری اور بحری فوجوں کی سپہ سالاری میں پوری قابلیت رکہتا تہا۔ ذرا اس یونانی، اس جلیل القدر السی بیاڈز کی تعلیم کو دیکہو کہ جسوقت سقراط نے ان چیزوں کی فہرست دی جن کو السی بیاڈز نے سیکہا تہا تو وہ اسمیں کسی ایک چیز کا بہی جس سے اسکو برائے نام بہی واقفیت ہوتی اضافہ نہ کر سکا۔ وہ فہرست کسقدر مختصر تہی۔ اسکا اندازہ سقراط کے اس قول سے ہوجائیگا کہ "مگر فی الحقیقت میں بہی کسیقدر صحت کے ساتہہ جانتا ہوں کہ کن کن چیزوں کی تجہے تعلیم ہوئی ہے۔ اگر میری نگاہ سے کوئی چیز رہ گئی ہو تو اسی تو بتا دے ہاں تو تو نے سیکہا ہے ادب ستارہ بجانا اور کشتی لڑنا کیونکہ تو نے بانسلی سیکہنے کیطرف توجہ ہی نہیں کی۔ پس صرف یہی وہ چیزیں ہیں جو تو نے سیکہی ہیں بشرطیکہ مجہسے کوئی بات چہوٹ نہ گئی ہو" طرہ یہ کہ ادب جو السی بیاڈز نے ایک معلم کامل سے سیکہا تہا اس سے مطلب صرف لکہنا اور پڑہنا تہا کیونکہ آگے چلکر وہ صاف صاف کہتا ہے کہ یونانی زبانکا بولنا میں نے کسی معلم سے نہیں سیکہا بلکہ خود اپنی قوم سے پس السی بیاڈز کی تعلیم کے برابر انگریزی تعلیم کا مفہوم یہ ٹہرا کہ لکہنا پڑہنا کشتی لڑنا اور ستار بجانا در انحالیکہ سب کے بعد والی قابلیت بہت ہی آسان اور ابتدائی موسیقی تک محدود تہی۔ یہ ہے وہ تعلیم جو ایک اتہنیس کے رہنے والے کے لئے ممکن تہی (اگرچہ از روے انصاف ہمکو یہ بہی کہدینا چاہیئے کہ سقراط کے نزدیک ایسی تعلیم کی کچہ زیادہ وقعت نہ تہی کیونکہ ایک شخص جسکی حیثیت دنیا کی علمی تاریخ میں ایسی ہو جیسے کہ السی بیاڈز کی تہی اسکے لئے زمانہ گذشتہ میں کوئی بات ایسی نہیں جو بہ نسبت زمانہ موجودہ کی باتوں کے زیادہ قابل توجہ ہو۔ محض یونانی میں گفتگو کرنا اس زمانہ کی لیاقتوں میں ایک بہت ہی اعلیٰ قابلیت خیال کیجاتی تہی اور یہ امر کہ السی بیاڈز نے اسے آسانی سے سیکہہ لیا اسکی قابلیت کی وقعت کو کم نہیں کرتا۔ باشندگان اتہنیس کے نے لوگو نہیں، جو علمی گفتگو کے بڑے شائق تہے، تکلم، واقفیت اور معلومات کی وسعت اور دماغی ترقی کے لئے سب سے اچہا اور ہر وقت موجود رہنے والا ذریعہ تہا۔ سقراط کی زبانیں کلام کرنا اور اس فلاسفر کی صحبت میں رہنا کچہ کم

فائدہ کی بات نہ تھی۔

بڑے سے بڑے زیرک اور کامل آدمیوں کی حالت مثل ہماری موجودہ حالت کے تھی یا کم سے کم ہماری اُس حالت کے مانند جبکہ ہمکو یونانی اور لاطینی زبانیں سیکھنا نہ ہوتیں اور کوئی نئی زبان سوائے فرنچ کے قابل سیکھنے کے نہ ہوتی۔ وہ یونان میں زبان گریک کی تکمیل اور تلفظ درست کرنے کے لئے جاتے تھے بالکل اسیطرح پر جیسے ہمارے نوجوان پیرس اور ٹورین جاتے ہیں۔ تاہم زمانہ گذشتہ کا معیار وقعت نسبتاً ہلکا تھا مثلاً آجکل ایک انگریز جس نے تحصیل علوم میں اس سے زیادہ کوشش کی ہو جتنی وہ لوگ کرتے تھے، درحقیقت عالم ہوسکتا ہے مگر لوگ اُسے ایسا خیال نہ کرینگے۔ ممکن ہے کہ وہ انگریزی اور فرنچ کا پورا ماہر ہو یعنی وہ ان دونوں میں نہایت ہی اعلیٰ اور پاکیزہ ادبی قابلیت رکھتا ہو۔ پھر بھی وہ ایک ناقص التعلیم شخص کہا جائیگا۔ مثلاً آجکل سر والٹر اسکاٹ کو ایک نیم تعلیم یافتہ شخص کہنا داخل فیشن ہوگیا ہے صرف اسوجہ سے کہ وہ گریک نہیں جانتے تھے۔ تاہم اسکاٹ زبان جرمن میں اچھی دستگاہ رکھتا تھا اور اپنی کثرت کتب بینی کے باعث نیز مضبوط قوت حافظہ کے سبب سے درحقیقت اُسکا علم اُن فلسفیوں کے مقابلے میں جو اس سے پہلے گذری ہیں اس مقدار سے کہیں زیادہ تھا جس مقدار میں ہوریس کی معلومات ان لوگوں سے زیادہ تھی جو اسکے سے پہلے گذرے تھے۔

ابتدا ہی سے ایک یا دو مضامین تک تعلیم کو محدود رکھنا انہیں لوگوں کو نصیب تھا جو اگلے وقتوں میں تھے اور دنیا کا علم جوں جوں زیادہ ہوتا گیا ویسے ہی ویسے یہ بات بھی بتدریج کم ہوتی گئی حتی کہ ہمارے زمانہ میں معمولی مکتب کے لڑکوں سے اگلے وقتوں کے عالی مرتبہ علمی لیڈروں کی معلومات سے زیادہ معلومات رکھنے یا کم سے کم اس کی کوشش کرنے کی توقع کیجاتی ہے۔ بھلا ایسا کون انگریز باپ ہوگا جو باوصف فارغ البال ہونیکے اس امر پر قناعت کریگا کہ اسکے لڑکے کی تعلیم ایلسی بیاڈز کی تعلیم کے برابر ہو یا اتنی ہو جتنی کہ ہوریس نے پائی تھی یا جتنی کہ شیکسپیر کے لئے کافی ہوئی تھی یا ایں ہمہ

اگرچہ حافظہ کا بار مستقل طور سے بڑھتا چلا گیا ہے لیکن اسکی قوت میں کسی ترقی کا ہونا نہیں معلوم ہوتا۔ ہمارے دماغ ہمارے اجداد کے دماغوں سے زیادہ اچھے نہیں ہوئے باوجودیکہ جہاں وہ ایک چیز پڑھتے تھے وہاں ہم متعدد چیزیں پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں بات یہ ہے کہ وہ لوگ پڑھتے تھے اور ہم صرف پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری امید صرف اس امر میں ہے کہ ہم نے عہد نو عمری میں جن چیزوں کو سیکھنے کی کوشش میں اپنے اوپر حد سے زیادہ بار ڈالا تھا اُن میں سے چند کا انتخاب کریں اور زمانۂ شباب کے بعد صرف منتخب مضمونوں پر اپنی کوشش کو محدود کر کے اپنے اجداد کا سا کمال پیدا کرنے کیلئے جد و جہد کریں۔

(ترجمہ از سید اسد اللہ گورکھپوری طالبعلم علیگڈھ کالج)

انتخاب بیاض حسرت

منیر شکوہ آبادی

دشمن کی جوانی بھی راحت نہیں ملتی | جو کھیل میں کھو لی ہے وہ دولت نہیں ملتی
لی ہم سے زمانے کی کئی بار تلاشی | دل کھو دیا جس میں وہ ساعت نہیں ملتی
دل کو ہے وہیں خاک میں ملنے کی تمنا | اے عیش گہ ... تری تربت نہیں ملتی
...نا پڑتا ہر صحبت تو بگڑ جاتے ہیں تیور | ملتا ہے دل انکا تو طبیعت نہیں ملتی

شہیدی

...ہو لی عشاق سے فرصت نہیں ملتی | یا ناز سے اپنے تمہیں رخصت نہیں ملتی
...ہر جنت سے سایہ فگن ہوگئے سر پر | تکلیف ہمارے لیے دولت نہیں ملتی
درش قدم بت ہی مرا جامہ احرام | بے خوار ہوئے عشق میں لذت نہیں ملتی
ناکامئ جاوید کی ہم مانتے منت | افسوس شہیدی تری تربت نہیں ملتی

حزیں

زہر غم ہجر تو بجان کارگر افتاد | امید وصال تو بعمر دگر افتاد

ہندو و مسلمان در ہندوستان

اس مضمون کے پہلے نمبر میں مولوی برکت اللہ صاحب ہندو مسلمان باشندگان ہند کے باہمی اتحاد کی ضرورت کو بڑی عمدگی کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں آپ نے یہ بالکل صحیح لکھا تھا کہ جب مسلمانان عالم کی کل تعداد یعنی ۲۰ کروڑ نفوس میں سے سات کروڑ مسلمان ہندوستان میں رہتے ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ فلاح اسلام کا دارومدار بھی زیادہ تر ہندوستان ہی کے مسلمانوں کی فلاح پر ہے۔ علاوہ بریں ہندوستان کی آبادی تمام دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔ پس جس وقت تک کہ پنجم حصہ نوع بشر محکومی و غلامی کی حالت میں ہیں گے اسوقت تک حریتِ عالم کا منشا پورا نہیں ہو سکتا۔ غرضکہ حریتِ عالم اور فلاح دنیائے اسلام کا ظہور بہت کچھ آنا منحصر ہے نجات ہندوستان اور ترقی مسلمانان ہند پر اور یہ دونوں باتیں نہیں ممکن ہیں بجز اسکے کہ ہندو مسلمان متحد ہو کر آزادی ہند کی درپے ہوں اور اگر اس باب میں حکومت غیر سدِ راہ ہو تو اسکا مقابلہ دفاعی مزاحمت یعنی پسیو رزسٹنس کے ذریعے سے اسطور پر کریں کہ تعلیم و تربیت ملت نیز تجارت و زراعتِ ملک کو اپنے ہاتھ میں لیکر حکومت کے محتاج نہ رہیں اور ہر شخص خدمتِ حکومت سے خواہ وہ ملکی ہو خواہ فوجی احتراز کرے۔ اس نمبر میں فاضل مضمون نگار نے یہ ثابت کیا ہے کہ اختلاف مذہب مانع اتحادِ مسلمانان و ہنود نہیں ہے۔

لیکن کہ بعضے از کم مایگان معرفتِ شریعت غرا کہ جامۂ علم و فضیلت در بر کشیدہ اند ایراد سے آورند کہ چگونہ میانِ کفر و ایمان و شرک و توحید و خدا پرست و بت پرست اتحادِ حقیقی و موالاتِ قلبی ممکن باشد! مارا باید کہ نخستین پے بکنہ دینِ الٰہی بریم و مقصود از بعثتِ پیغمبران را درک نمائیم۔ تا اشکال این سوال از میانِ رفع شود۔ و شاہدِ معرفتِ حقہ پردہ از رخ کشد۔ و ظلمتِ کوتاہ اندیشی زائل گردد تاریخ عالم شاہد است کہ اممِ سالفہ مانند افراد بشر زمانِ طفولیت و شباب و شیب داشتند۔ ہر ملتے را عہدِ ترقی و اقبال بودہ و کارہائے نمایاں کردند۔ و دورۂ تنزل و ادبار۔ و از ذروۂ عزت بحضیض ذلت

انگاشتند. وحی آلهی که مفهوم قرآن کریم است این ترقی و تنزل اقوام را قربِ ایشان بخدا
و بُعدِ ایشان از و سبب قرار داده است. قومے که بخدا نزدیک شود. تمدنِ حقیقی دارد.
اکثر افراد ملت اشراقِ روحانی دارند. معاشرتِ ایشان مبنی بر اخوتِ حقیقی باشد.
بهبودی خلقِ خدا محرکِ اعمالِ ایشان است. و محاسن اخلاق از کمینه ترین اوصافِ
ایشان. و چون قومے از خدا دور شود. تمسک بتمدنِ جعلی گردد. با وجودِ عظمت و
شوکتِ ظاهری تنزلِ روحانیت و قلتِ محبتِ عیالِ الله بوقوع آید و شهوات بهیمیه
عنانِ حرکاتِ مردم گیرد. و محاسن اخلاق بزرگترین فضیلتِ انسانی نماید. زیرا که مردم
متخلق باخلاق الله گویا حکم کبریت احمر دارند. هرگاه که شر بر خیر غالب شود. و فساد
نام صلاح گیرد و ابوابِ عرفانِ ذاتِ ازل بر وجهِ ممکنات مسدود گردد. چنانکه پیغمبر بکلمه
جامعه ادا فرموده. اذا کثُرَ الخبثُ (گندگی. وحالی فراوان شود). لا محاله غرقِ رحمتی
وسعت کل شیء بحرکت آید. و برائے بقائے عالم انسانی آفتابے روحانی با ستیغے قاهر
سطوتے غالب از افقے از آفاق گیتی طالع شود. تو بتربیتِ آن نیرِ اعظم به ذرات
عالم پرتو فگن. و نار فیضِ جان بخشش او بار دیگر موجودات [illegible]. ارث بخش موسم سرمای
جهالت و غفلت از جهان رخت بیرون کشد و انفاس بهار خلقِ جدید از او دریا حیاتِ
روحانی را بر شما نشا رانسانی بوجود آرد. حال ملاحظه فرمائید که چگونه شبِ دیجورِ ماده
پرستی و تاریکی جهالت و خود غرضی در عصر بطلوع آفتابِ تابانِ روحانیت به سرور
روشن زندگی تازه مبدل گشت. بنی اسرائیل که از اذل و اسافل امت
بودند. ملت عظیمه بفضائل جلیله گردیدند. و چون انقراض زمان باز ظلمتِ
تعصبیت و [illegible] به پستی عالم را فرا گرفت. ظهور خورشیدِ طلعتِ روح الله مرة ثانیه
اکناف عالم را منور ساخت. سه صد سال هم نگذشته بود که حب ریاست بر جهانیان
[illegible] بر زنجیر عبودیت داشتنِ عالمیان جائے حب الله و اخوتِ خلوص الله گرفت [illegible]
بهره غالب گیتی را احاطه کرد. و انسان به درکِ اسافل بهائم نازل گشت. باز شمسِ بازغه
جمالِ رحمة للعالمین با عظمت و جلال بے مثال از افق بطحا طلوع فرمود [illegible]

روحانیت باز گلستانِ انسانیت را سرسبز و شاداب و پُر از ریاحین خیر و خوبی گردانید
آیا تاریخ شاہد نیست کہ چنین انقلابات عظیمہ ہنگام ظہورِ دیگر مظاہر امر اللہ مثلاً کرشنا
و زردشت و بودہ بعالم امکان ظہور یافتہ۔ بگوش جان باید شنید کہ چگونہ عندلیب
آشیانی روحانی بمنقارِ ہزار داستان سرای کرشنا این نغمۂ لاہوتی را بچہ جوش الہائی
پیش ارجون سرائیدہ است۔

(اے خلف الصدق بہراتا (ارجون) ہرگاہ کہ دین مضمحل گردد۔ و بی دینی
سربلند سازد من آنوقت خود را ظاہر میکنم۔ برای حمایت ارباب دیانت
و خیر۔ و اہلاک بدکاران و برای ابقاے دینِ آلہی من در ہر عصر پیدا میشوم
بھگوت گیت۔ ۷۔ ۸۔ مقالۂ چہارم۔)

نقطۂ فرقانی این نکتہ را کہ ہمہ مظاہر امر اللہ گو، در ہیاکل انسانی حسب مقتضائے زمان و
مکان از او جدا جدا گانہ می نمایند۔ اما من حیث الروحانیت۔ کہ مرایای جمال ازلی اند۔
یک ہستند۔ باین رمز ادا فرمودہ است۔ کہ تکذیب یک پیغمبر تکذیب ہمہ پیغمبران است
مثلاً۔ کَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِين (قوم عاد ہمہ پیغمبران را تکذیب کرد) گرچہ ایشان یک پیغمبر
را تکذیب کردہ بودند۔ ہمین است معنی کلام کرشنا کہ "من پیدا میشوم"۔

از کلام ما سبق ہویدا گشت کہ دینِ ہنود و بودہیان و زردشتیان در ابتدا
ہمچنین من جانب اللہ بودہ است کہ دینِ موسوی و عیسوی و جناب ختم مآبی۔ بلکہ قرآن
کریم برای ہمہ ملل ماضیہ و امم موجودہ یک دین آلہی بیان فرمودہ است وَإِنْ مِنْ
أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِير (ہیچ امتے نبود است کہ از میان او پیغمبری ترسانندہ مبعوث
نشدہ)۔ و سببِ مماتِ روحانی این ملل ہمان است کہ سببِ موتِ روحانی مسلمانان
ہر پیغمبر انفاس جان بخش خویش را در کلماتِ منزلہ بر خویش ودیعت میگذارد۔ پس
باقتضائے زمان کثافت بر لطافت غالب آید و غرض بر محبت مرجح گردد۔ ملکۂ فہمیدن
وحی گوئیا زائل شود۔ عقول تاریک۔ و درک تنگ گردد۔ و یُرْفَعُ الْعِلْمُ وَيَكْثُرُ الْجَهْلُ صادق
آید۔ مثلاً در ابتدای عہد اسلام ہر مسلمان نور ایمان و حیاتِ روحانی از قرآن بلاواسطہ

کلام الناس حاصل میکرد۔ ولیکن امروز چند مرد مانند که قرآن را می فهمند۔ بعد زمان از عهدِ پیغمبر وحدوثِ اغراض سیاسیه درین سیزده صد سال حجاب اکبر میانِ احوالِ واقعیِ زمان نبوی و امتِ محمدیه در ازمنهٔ متاخره حائل کرده۔ حتیٰ که فهم عبادت قرآنی وبیاناتِ احادیث دشوار گشت وکم مانگان راهبر ملت شدند و اتخذ الناس رؤسا جهالا۔ فضلوا و اضلوا۔

ازقرنها تا قرنها اسلام را شمس هُدیٰ
تا که نفاقِ جاهلستان بشکست تاب شان
شیرازهٔ امت گسست آن قوتِ ملت شکست
اسلام بوده در شباب چون آفتاب عالم‌شتاب
اکنون شد افرادش جدا از هم چو ریگ کربلا
اسلام بُد اول یکے اکنون تمام چند سے

پرتو فگن بر هر کجا بر تنگیها و گنگ و جمن
آمد غرض اندر میان بگشاده شد باب فتن
دولت زبون و دین گذشته پست از اخلاق و از فن
یا که و یخ بر و سے آب هر سو روان پر سد شکن
گویا بظاهر تو دهها لیکن بباطن پر و ز هن
هر فرقه را شد مسلکے هر یک بزعمے مفتتن

درین که چک مدت یک هزار و سه صد سال دیدی که غرض نفسانی و رزالتِ شهوانی چه بلاها و فتنها برانگیخته است و اشرفِ ادیان سید هر دو جهان را بچه ذلت و قباحت انداخته پس چه رسد باهلِ آن ادیان که از مظاهرِ امر الله دوری هزارها سال دارند۔ بلے۔ ذاتِ همایونِ لوناک که شمسِ کلی این دورهٔ اخیره است وعده فرموده است بحیاتِ جدیدهٔ عمومیه که رستاخیز همه نوعِ بشر خواهد بود کنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم (شما مرده بودید بموت روحانی۔ پس خدا شما را زنده کرد بحیاتِ روحانی۔ پس از یک مدت بر شما موت روحانی طاری کند و بعد از زمانے شما را باز حیاتِ روحانی عطا فرماید) از عهدِ پیغمبر تا خروج چنگیز خان درمیانِ مسلمانان روحانیت غالب بود۔ سردارانِ عالم بودند۔ و درین هفت صد سالِ اخیره بجز مماتِ روحانی چیزے دیگر شعارِ مسلمانان نبوده است۔ ولیکن اکنون وقت رسیده است که حسب وعدهٔ قرآنی باز حیاتِ روحانی بالیشان زاده شود۔ آن حاصل نشود الا باتباعِ سنتِ نبوی۔ زینت بخشِ سریر قاب قوسین حکومتے را بنا نهاده بود که اساسش بر حریتِ خلائق از ظلمتِ تقلید آبا و ظلم سلاطین و امرا۔

وبر مواسات مردم پیش قانونِ عدالت و مواخات اولادِ آدم بود۔ یعنی مسلمانان را منصب تربیتِ عالم عطا شده بود تا اخوتِ افرادِ نوعِ بشر را از قوت بفعل آرند۔ از اینجا است که بهادیانِ دینِ مبین از جنابِ رحمة للعالمین فرمانِ واجب الاذعان صادر شده بود یسّروا ولا تعسّروا وبشّروا ولا تنفّروا وکونوا عباد الله اخواناً برخلاف فهمیدنِ رموزِ اسرارِ الٰهی را آسان کنید و هیچ دشواری را میان نیارید۔ بلکه بعبارتِ الفاماتِ خداوندی دلِ مردم را بدست آرید۔ نه که ایشان را از سوءِ خلق و تعصب متنفر سازید۔ تا که همه شما بندگانِ خدا گردید و احرار۔ نه بندگانِ سلاطینِ با استبداد و استکبار و نه تابعینِ شیاطین که عبارت است از علمائے کاذب و هادیانِ فجار۔ و این خجسته خصال بنی آدم را برادرانِ حقیقی سازد و روئے زمین موطنِ عائلهٔ رحمن گردد۔ برائے اعادهٔ حیاتِ روحانی درمیانِ مسلمانان لازم است که قرآنِ مجید را با تاریخ عالم از سلف و خلف و با کتبِ مقدسهٔ دیگر ادیان بخوانند تا عظمت و شوکتِ آن کلامِ قدیم ظاهر گردد۔ و نیز علمِ سیاست را جزوِ دین شمارند و برائے اقامهٔ آن جمهوریتِ حقیقی که پیغمبر بنا کرده بود و نظیرش در همه تاریخِ عالم نبوده است سعی نمایند۔ و این هردو کار در هندوستان آسان تر است از دیگر جاها۔ مثلاً اگر علمائے اعلام هند کتاب بهگوت گیتا (نغمهٔ الٰهیه) را با التفاتِ محبانه مطالعه فرمایند۔ آیا درین شک است که اتحادِ دینِ الٰهی در هر عهد هویدا گردد و معنی مصدقاً لما بین یدیه آشکارا شود۔ برائے توضیحِ مقال یک مثال بگیریم۔ این ماده پرستانِ یوروپ که برائے تحصیلِ زر دنیائے عالم را تاراج میکنند و خونِ بیگناهان را میریزند۔ بر جانِ مبارکِ سیدِ لولاک خرده میگیرند که چرا جهاد را روا داشت۔ حال ملاحظه کنید در دو واقعهٔ عظیمه را که یکے در بهگوت گیتا و دیگر در قرآن مذکور است۔ بر صفحهٔ خیال تصویر کشیده باهم مقابله نمائید۔ واقعهٔ اول چنین است۔ در عهد کرشنا همه عساکرِ هند در میدانِ جنگ فراهم آمده منقسم بدو صف شده بودند۔ یکے بر حق و دیگرے بر باطل۔ پدران و پسران و خویشان بعضے یک طرف و بعضے دیگر طرف۔ چون هردو فوج باراده کارزار روبروئے یکدیگر ایستادند کوسهائے جنگی

بو قتاے ہولناک از ہر دو طرف بفریاد آمدند۔ ارجون کہ یکے از اصحاب کرام آن حضرت بود عرض نمود کہ چگونہ انسان با اقارب و جگر پارہہائے خویش جنگ کند دل زدہ بر اندامش افتاد و کمان را از دست نہادہ در لجۂ تحیر و تحسر غرق گشت۔ در ان ہنگام منظور الشد زبان گوہر فشان را بخطابہ بلیغۂ روحانیہ گویا فرمود ولآلی آبدار اسرار قدیم را بسلکِ بیان منتظم ساخت۔ و ارجون را بجنگ براے اقامت حق و ہدم باطل فرمان واجب الاذعان داد۔ وحال این صورت واقعہ را بالتصویر واقعۂ بدر کبریٰ از سید کونین با صحابۂ عظام بمقابلہ صنادید قریش کہ اقارب قریبۂ آن ذات اقدس و اصحاب کرام بودند۔ ایستادہ بودند وقت طلب مبارزین از جانب مخالف امر فرمودند۔ قم یا عبیدۃ بن الحارث وقم یا حمزہ و قم یا علی باہم مقابلہ کنید چگونہ کار پاکان رنگ یکرنگی دارد۔ و از شائبہ نوشتہ غرض مبرا است۔

اگر نیک بنیم علت غائیہ بعثت پیغمبر التئام بین الاضداد و تالیف قلوب عباد کردہ اند۔ بہ زان ساخت تو برائے وصل کردن آمدی نے برای ... رشتۂ حب اتم از ہر شان کردہ رسن ... علماء ہند با فیلسوفان ... بساط دوستی گستردند۔ کتب مقدسۂ ایشان را با مقا... کردہ باشند ملاقہ براے وصل کردن آمدی نے برای ... فصل کردن آمدی۔ علاوہ ازین این مسلک صلاح و دوستی بسیار لطائف را از پردہ ... بظہور آید کہ اغیار بیدا گشتید یاران غمگسار پیدا شوند۔ و آن قصہ ... کہ از ... روحانی پیغمبر ... اوج حقیقت بودہ است۔ در مثنوی ... مناز مت اہل ادیان مختلفہ ذکر فرمودہ۔ عیان گردد۔

... را ... درمے یک درم
باہم در نزاع و در غضب
عرب گفتا منا ذا العنب لا
... خواہم عنب خواہم اوزم

ہر یکے از شہرے افتادہ بہم
فارسی گفتا ازیں چوں وارہیم
من عنب خواہم نہ انگور اے دغا
آنکہ رومی بود گفت این قیل را

فارسی و ترک و رومی و عرب
ہم بیا کاین را بانگورے دہیم
آن یکے کز ترک بد گفت اے گزم
ترک کن خواہم من استافیل را

صاحب سرے عزیزے صد زبان ⁂ گر بدے آنجا بدادے صلح شان

درحقیقت این خلافِ میان اصحاب ادیان ناشی از عدم فہم اصطلاح
یکدیگر ہست - والا ہمہ طالبِ یک مطلوب اند - مثلاً مسلمانان بزرگانِ خویش را بالفاظِ انبیا
ورسل واولیا تعبیر میکنند - ہنود برائے بزرگانِ خود - اوتار وآلہہ وغیرہا استعمال
مینمایند - ونزاعِ لفظی نامناسبِ شانِ اربابِ عقول است - بویژہ ہنگامیکہ حکم کل
اُمتہ تدعٰی الیٰ کتابہا در رسیدہ است یعنی ہر ملت را بواسطۂ کتاب دینی اش اصل غرض
دینِ آلہی ومحبتِ خلقِ خدا باید تلقین کردن - وتیرگیِ کوتاہ فہمی بنورِ اشراقِ روحانی
محو نمودن - وبنائے حریتِ عامہ نہادن . . . . حریتِ خاصہ کہ حریتِ
عامہ منتج گردد - از حریتِ افراد حریتِ قوم حاصل شود - واز حریتِ ہمہ اقوام حریتِ عالم جلوہ نماید - ہمچنین
اگر ہندوستان برائے دوام بذلتِ عبودیت راضی شود - حریتِ عامہ ہرگز بظہور نیاید
اکنون جاپان قوم حر شد وچین ہم اسبابِ حریت وبزرگی را آمادہ کردن گرفتہ - اگر ہند
ہم درین راہ قدم فرسا شود - نجاتِ براعظم آسیا گویا متقین الوقوع گردد ونجاتِ
آسیا کہ مسکن نیمۂ افرادِ نوعِ بشر است ضامن نجاتِ عالم خواہد بود - فقط

بلجیم کے دلفریب نظارے

(۶)

عجائب خانہ کو چھوڑ کر محلہ حبشی سے ہوتی ہوئی ہماری گاڑی پارک لیوپولڈ میں پہونچی
جہاں سے چند منٹ میں ایک خوبصورت احاطہ نظر آیا جو فواروں اور عمدہ عمدہ روشوں
اور کیاریوں سے آراستہ تھا - یہاں سے کسیقدر چکر کے بعد ہم اُس خوبصورت سڑک پر
نکلے جسکا نام ایونیو لوئیس ہے - یہ سڑک پیرس کی شانزی لیزی کے جوڑ پر ہے - اس
وقت جبکہ ہم یہاں پہونچے شام کا وقت تھا - بے شمار موٹر کاریں اور طرح طرح کی خوبصورت
گاڑیاں ہر طرف سے گذرتی ہوئی باغ شانبیر کی طرف جارہی تھیں - اس سڑک کے دونوں
طرف نہایت عالیشان عمارتیں ہیں جنہیں دیکھکر اُن میں رہنے والوں کی قابلِ رشک زندگی
کے سین میری نظر کے سامنے پھرنے لگے - یہ چھوٹے اور بڑے مختلف طرز کے مکانات

ہیں جو اتنے اونچے نہیں ہیں جو بدنما معلوم ہوں۔ انکے دیکھنے سے بنانے والوں کے عمدہ
مذاق کا پتہ ملتا ہے اور آرام و راحت کی تصویر سامنے پھر جاتی ہے یہ سڑک بہت
لمبی ہے جہاں سایہ دار درختوں کے کثرت جھنڈ ہیں۔ یہاں سے گذرتے ہوئے
ہم تھوڑی دیر بعد بولوار ہنوئی ڈے سے ہوکر بولوار آپیرا میں داخل ہوئے۔ یہ خوبصورت
سڑکیں جن کو شہر کا بڑا چوک کہنا چاہیے اور جو پیرس کے گرینڈ بولوار کا مقابلہ کرنے کو
تیار ہیں واقعی پیرس کی جان ہیں۔ اسوقت ہر طرف بجلی کی روشنی جگمگا رہی ہے جس سے
آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔ ٹریم گاڑیاں اپنا بھونپو بجاتی ہوئی گذر رہی ہیں اور لوگ
گاڑیوں سے اتر اتر کر ہوٹل اور قہوہ خانوں میں جمع ہوتے جاتے ہیں۔ ہم بھی تھکے
ہوئے تھے اسلئے گرینڈ ہوٹل کے سامنے والے قہوہ خانہ میں جا کر بیٹھ گئے۔ اسوقت
یہاں ڈنر کا وقت تھا۔ خدام ہر طرف سرگرم نظر آتے تھے اور تمام میزیں خوش پوشاک
عورتوں اور مردوں سے قریب بھر گئی تھیں۔ قہوہ خانوں کا اسوقت کا مجمع
بالکل پیرس کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ وہی لوگوں کا آہستہ آہستہ لقمہ لقمہ اپنا ڈنر گھنٹے
ڈیڑھ گھنٹے میں ختم کرنا۔ اپنے ہمراہی مرد یا عورت سے گپ شپ ہنسی مذاق کرتے جانا۔
سامنے پتھر کے چبوترے پر آنے جانے والوں کا ہجوم۔ کسی نقال کا سامنے آکر کچھ بجانا
یا ہولے ہولے گانا۔ پھر انعام کا خواستگار ہونا، پیرس کے سے مناظر پیش کرتا تھا۔
خاص کر اخبار بیچنے والوں کا ہجوم جسمیں دیکھو وہ سوکھی بڑھیا سادہ لباس پہنے گلے میں
بستے کی طرح کوئی چیز لٹکائے جسمیں اخبارات بھرے ہیں گلا پھاڑ پھاڑ کر "لے متان
لے متان" چلا رہی ہے۔ شاید یہ اس مشہور اخبار کا شام کا اڈیشن ہو جسے لوگ پیسہ دیکر
لیتے جاتے ہیں۔ کھانے پینے کے چیزوں کے ساتھ اخبار کا پڑھنا بھی لوازمات زندگی
میں سے سمجھا جاتا ہے۔ ذرا آنکھ اٹھا کر اس شخص کو دیکھو جو سڑک کے کونے پر کھڑا ہے
ٹین کی تین بوتلیں اسکے کمر سے بندھی ہوئی ہیں اور ایک ٹونٹی سی سامنے کی طرف
نکلی ہوئی ہے۔ غریب غربا کو گلاس میں شربت بھر بھر کر دیتا جاتا ہے اور اپنے دام
کھرے کر رہا ہے۔ دوسری طرف ایک قلفی والا اپنی چھوٹی سی گاڑی میں رنگ برنگ کا

جما ہوا برف پیچھے سے نکال نکال کر لوگوں کو دیتا جاتا ہے۔ ایک لڑکا میلے کچیلے کپڑے پہنے تمہاری طرف آتا ہے۔ اور جیب سے ایک لفافہ نکالکر چند تصاویر عورتوں کی جو شاید فحش ہیں تمہیں دکھاتا ہے اور خریدنے پر اصرار کرتا ہے۔ دوسری طرف نظر جاتی ہے تو بکثرت عورتیں سامنے سے گذرتی معلوم ہوتی ہیں جن کی چال ڈھال سے ایک قسم کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کی صورتیں پھر اُسی قہوہ خانے میں جہاں ہم بیٹھے ہیں نظر آتی ہیں۔ غرضکہ قسم قسم کے لوگ نظر کے سامنے سے تھیٹر کے سینوں کے مانند گذرتے جاتے ہیں کہ اتنے میں قہوہ خانے سے ایک نہایت شیریں لحن میں گانے کی آواز آتی ہے۔ اور ہم تھوڑی دیر کے لئے آیند و روند سے بے خبر ہو کر اُسی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی لقمہ بلقمہ کسی بڑے اُستاد کا پکایا ہوا کھانا نہایت لطف کے ساتھ کھاتے جاتے ہیں اس کے بعد ہم اُسجگہ سے بادل ناخواستہ اُٹھتے ہیں اور اپنی راہ لیتے ہیں۔

برسلس میں بہت سی مقامات ایسے ہیں جہاں جاکر ہم کسی عمدہ ڈرامے یا آپیرا کا لطف اُٹھا سکتے ہیں اگر ملک کی زبان جانتے نہ ہوں تو کیسے لے دی جاکر تماشہ دیکھ سکتے ہیں جہاں رات کیوقت طرح طرح کے تماشے ہوتے ہیں یا اگر کسی کھلی ہوئی جگہ میں بیٹھنا مرغوب ہے تو اس سے بہتر کوئی تجویز نہیں ہوسکتی کہ کھانے کے بعد خوبصورت پارک میں جائیں اور ٹکٹ خرید کرکے اندر ایک کرسی پر جا بیٹھیں اور عمدہ موسیقی کے دلکش ترانوں کا لطف اُٹھائیں۔ اس جگہ ہم واقعی بلجیم کی عمدہ سوسائٹی کے لوگوں کا ہجوم دیکھیں گے اور ایسی ایسی حسن کی دیبیاں بیش قیمت لباس پہنے سامنے نظر آئیں گی کہ سارا غم غلط ہو جائیگا اسجگہ وہ گھر کی سادی زندگی کے نظارے سامنے آتے ہیں جن کے لئے برسلس اسقدر مشہور ہے اور ساتھ ہی تخیلہ ہمیں اس شہر کے پرانے کارناموں کی طرف لیجاتا ہے جبکہ اُسکی دیواروں کے قریب نپولین کی افواج ظفر موج بڑھ رہی تھیں جبکہ یہاں کے لوگوں میں ابتری پھیلی ہوئی تھی اور اعلیٰ سوسائٹی اپنی عیش و رنگ میں محو رہتی خاصکر اس رات کا نظارہ ہمیں یاد آجاتا ہے جبکہ ڈچز آف رچمنڈ کے محل میں ناچ کی صحبت گرم تھی۔ مرد و عورت ہر طرف اپنے اپنے لطف میں سرگرم تھے کہ نپولین کی افواج

کی ہیبت ناک توپوں کی آواز سنائی دی اور تمام مجلس درہم برہم ہونے لگی۔ دوسرے دن ڈچز آف رچانڈ کے مکان کا نظارہ قابل دید تھا جو اس پر لطف واقعہ کی یادگار میں آج تک اُن صحبتوں کو یاد دلا رہا ہے۔ لارڈ بائرن کے جادو بھرے قلم نے چائلڈ ہیرلڈ کے تیسرے کینٹو میں اسی نظارے کی تصویر کھینچی ہے۔ مانی"

تنقید

(۱) جُنید بغدادی

یعنی حضرت ابو القاسم جُنید رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری مولفہ مولانا مولوی عبدالحلیم صاحب شرر تقطیع $\frac{20 \times 26}{16}$ حجم ۱۲۶ صفحے قیمت ۸؍ درخواست خریداری بنام مولف لکھنؤ دفتر دلگداز روانہ ہونا چاہیئے۔

حضرت شرر سے عام طور پر لوگ صرف ایک ناولسٹ کی حیثیت سے واقف ہیں لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اردو زبان اور بھی کئی صورتوں سے مولانائے موصوف کی زیر بار احسان ہے۔ مثلاً فسانہ نویسی سے زیادہ آپ کی تاریخ نگاری اور تاریخ نگاری سے زیادہ اب آپ کی سوانح نگاری مفید ملک و ملت ثابت ہوگی جسکی نسبت زیر عنوان التماس آپ لکھتے ہیں کہ "میں نے ایک زمانے تک غور و فکر میں مصروف رہنے کے بعد اس تجویز پر کاربند ہونے کا ارادہ کیا ہے کہ جو مشہور اور نامی گرامی بزرگان سلف ہماری انشاء و شاعری کے عنصر بنے ہوئے ہیں عام اس سے کہ کسی طبقے اور کسی فن سے تعلق رکھتے ہوں ان کے حالات امکانی جستجو و تلاش و تحقیق و تنقید کے بعد شائع کئے جائیں اور ہر بزرگ کے حالات میں ایک مستقل رسالہ تیار کر دیا جائے۔ حصول برکت کے لئے میں نے سب سے پہلے مشائخ صوفیہ کو منتخب کیا جن میں سے حضرت جُنید بغدادی ابو بکر شبلی۔ بایزید بسطامی۔ ابراہیم ادہم اور حسین ابن منصور حلاج وغیرہ کے نام ہماری نظم و نثر میں بار بار آتے ہیں مگر جن کی زبان پر یہ نام آتے ہیں اُنھیں میں سے اکثر اُن کے حالات سے بالکل بے خبر ہیں۔ مشائخ صوفیہ کے بعد دیگر لوگوں کا مرتبہ ہے جیسے حاتم طائی سخاوت کا ہیرو

مجنوں، لیلیٰ، فرہاد، شیریں، عاشق کی سیر، وریں اسیلاح کرادر بی صدہا نام ہیں جو کسی خاص ہنر یا جوہر سے تعلق رکھتے ہیں کیا اچھا ہو اگر ان سب کے حالات میں ایک ایک ایسا رسالہ اردو زبان میں موجود ہو جائے۔

ہمکو اس امر کے اظہار میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ حضرت شرر اس کام کو غیر معمولی خوبی اور قابلیت کے ساتھ انجام دینگے جسکا ثبوت اس مجوزۂ سلسلہ مشاہیر اسلام کے پہلے ہی نمبر یعنی سوانح زیر نظر کے مطالعے سے ملسکتا ہے۔ ابتدا میں تمہید کے بعد ایک بسیط اور قابل دید تحریر تصوف کی اصلیت اور اسکی مختصر تاریخ کے متعلق درج ہے۔ ازاں بعد حضرت جُنید کی (۱) ولادت، بچپن، تعلیم و تربیت (۲) علوم باطن کی تحصیل۔ ارادت اور معرفت (۳) آپ کے سفر (۴) عام حالات زندگی۔ کرامات اور اوضاع و اطوار (۵) سماع اور صحبت حال و قال۔ (۶) تعلیم اور طرز تعلیم (۷) آپ کی مخالفت۔ (۸) فیض یابان صحبت۔ اقران و تلامذہ (۹) وفات (۱۰) معرفین کمال کے مفصل حالات مختلف کتابوں سے بڑی تلاش اور تحقیق کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں اور خاتمہ آپ کے ۱۲ کلمات حکمت پر کیا گیا ہے جن میں سے بعض یہ ہیں۔

(۶) ماست باز کی حالت دن میں بیس بار بدلتی ہے اور ریاکار چالیس برس تک ایک ہی حالت میں قایم رہتا ہے۔

(۱۱) جب محبت سچی ثابت ہو تو شرائط ادب ساقط ہو جاتے ہیں۔

(۷) حقیقی سچائی یہ ہے کہ تو اُن موقعوں پر سچ بولے جہاں بغیر جھوٹ کے مفر نہ نظر آتا ہو۔

(۲) محبت زیادتی میلان کا نام ہے جو بغیر نیل مرام کے ہو۔

(۱۳) گذری بات کی طرف توجہ کرنا آنیوالی حالت سے غافل ہو جاتا ہے۔

آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ "جب تم صوفی کی یہ حالت دیکھو کہ ظاہر داری کی باتوں کا زیادہ خیال رکھتا ہے تو جان لو کہ اُس کا باطن خراب ہے۔" نیز فرمایا کرتے تھے کہ "تصوف کی بنیاد آٹھ خصلتوں پر ہے جو انبیا علیہم السلام کے ساتھ مخصوص تھیں (۱) سخاوت جو

۞ از صفحہ ۶۶ دریا یہ تعلیم و ہر دو تفصیل۔

حضرت ابراہیم کا حصہ تھی (۲) رضا جو حضرت اسحٰق کے ساتھ مخصوص تھی۔(۳) صبر جسکا حق حضرت ایوب سے ادا کیا۔(۴) اشارہ جو حضرت زکریا کے لئے خاص تھا۔(۵) غربت جو حضرت یحییٰ کے لئے تھی (۷) سیاحی جو حضرت عیسیٰ کے خصائص میں سے تھی۔(۸) فقیری جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص تھی۔

ایک دفعہ لوگوں نے پوچھا کہ "محبت رکھنے والا محبوب سے ملاقات ہونے کے وقت رونے کیوں لگتا ہے؟" فرمایا "اسکا سبب یہ ہے کہ ہجوم شوق سے اسپر سرور و وجد کا عالم طاری ہوجاتا ہے"

قصہ مختصر کتاب ہر نہج قابل دید و شنید ہے ہم بطور نمونہ حضرت مولف کی دلچسپ تمہیدی تحریر بجنسہ ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

تا زیاد ہمہ پیام او مے شنوم — وز بلبل مست نام او مے شنوم
ایں نقش عجب کہ دیدہ ام بود دل — آوازہ آں ز بام او مے شنوم

تمہید

تیسری صدی ہجری کا زمانہ وسطی اسلام کے عروج کا زمانہ تھا۔ اور ایسا دور تھا کہ جیسے باکمال اسلام کے آغوش میں پرورش پاکے اُن دنوں تیار ہوسکے پھر کبھی نہیں نظر آئے۔ اُسی بابرکت عہد کے لوگ تھے جن کے نقش قدم پر بعد والے چلتے رہے اور وہی گران پایہ بزرگ تھے جن کی پیروی مسلمانوں کے لئے ہمیشہ ذریعۂ فلاح رہیگی۔ واقعی وہ عجب دینی اور علمی خیر و برکت کا عہد تھا جب کہ مفسرین اپنے روحانی الہاموں سے کلام ربانی کے رموز و حکم کا پتہ لگا رہے تھے۔ محدثین اقوال و افعال حضرت رسالت کی جستجو اور تحقیق و تنقید کے بعد اُن کے مدون کرنے کی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ فقہا اپنی دقیقہ سنجی کی محنت سے روز بروز ثابت کرتے جاتے تھے کہ دنیا اپنی عام معاشرت اور نیز اپنے نظام حکمرانی و تمدن میں شریعت اسلامیہ کی کسقدر محتاج ہے۔ اور ذات یزدانی سے لو لگانے والے بزرگان دین اپنی خانقاہوں میں خاموش بیٹھے ہوئے عالم باطن کے وہ مراحل طے کر رہے تھے جہاں تک فرشتوں کی بھی رسائی

نہ ہو سکتی تھی۔

اُسی زمانے میں ایک دن کا واقعہ ہے کہ بغداد کے اُس بازار میں جہاں فرمانوں کے کاغذات فروخت ہوتے تھے کسی مکان کے اندر ایک نوعمر عورت دلکش آواز اور وجد میں لانے والی دھن میں یہ اشعار گا رہی تھی۔

اذا قلت اہدی الہجر لی حلل البلا — تقولین لو لا الہجر لم یطب الحب

جب میں کہتا ہوں کہ ہجر نے مجھے مصیبت کے خلعت عطا کئے تو وہ جواب دیتی ہے کہ اگر ہجر نہ ہوتا تو محبت میں مزہ ہی نہ تھا۔

وان قلت ہذا القلب احرقہ الہوی — تقولی بنیران الہوی شرف القلب

اگر کہتا ہوں کہ عشق نے اس دل کو پھونک دیا تو وہ کہتی ہے کہ عشق کی آگ ہی نے تو دل کو شرافت عطا کی ہے۔

وان قلت ما اذنبت قالت مجیبۃ — حیاتک ذنب لا یقاس بہ ذنب

اور اگر کہتا ہوں کہ میں نے کیا خطا کی تو جواب دیتی ہے کہ خود تیری زندگی ہی اتنا بڑا گناہ ہے جسکے برابر کوئی گناہ نہیں ہو سکتا۔

ان اشعار اور اُس دلربا کے گلے نے شاید بہتوں کو اپنی کشش سے راستہ روک کے کھڑا کر دیا ہوگا۔ بہتوں کی زبان سے بے اختیارانہ "واہ!" کا کلمہ تحسین نکل گیا ہوگا۔ اور بہتوں نے متاثر ہو کے بے تحاشا آہ فلک دوز کھینچی ہو گی۔ لیکن ان سب کے مذاق سے الگ ایک پاکباز و صاحب باطن رہرو پر یہ نغمہ اور یہ جادو بھری آواز قیامت کا اثر کر گئی اُس نے بے تحاشا ایک نعرہ مارا۔ اور اُس پر ایسا وجد طاری ہوا کہ دروازے پر کھڑے ہو کے ستون کی طرح جھومنے لگا۔ اُسکا ستانہ نعرہ سن کے راہگیر ٹھٹک کے کھڑے ہو گئے قرب وجوار کے لوگ جوش ہمدردی سے دوڑ پڑے۔ اور خود مالک مکان بھی گھبرا کے باہر نکل آیا۔ مالک مکان نے باہر آتے ہی پوچھا "کیا ہوا؟" از خود رفتہ صاحب دل نے عجز و فروتنی سے جواب دیا "مجھے اس نغمے نے بیتاب کر دیا۔" اس کے بعد گانے کی آواز سننا اور اپنا بیتاب و بیخود ہو جانا غرض ساری سرگزشت صاف صاف اور

اور ملکا ست کر شناسائی مکان والا ہی اہل دل کا قدرشناس فیاض اور منچلا تھا۔ ایک غریب و نیک سیرت شخص کو اس بیتابی و مدہوشی کے عالم میں دیکھ کے عرض کیا حضرت میری لونڈی کی آواز تھی۔ آپ کو اس سے دلبستگی پیدا ہو گئی ہے تو وہ آپ ہی کی نذر ہے۔ یہ کہتے ہی اندر جا کے لونڈی کو باہر نکال لایا۔ اور اس کا ہاتھ ان بزرگ کے ہاتھ میں دے کے کہا۔ اب یہ آپ کی ہو چکی۔ آپ کو اختیار ہے چاہیئے یونہیں اپنے تصرف میں لیئے اور چاہے آزاد کر کے نکاح پڑھا لیجیے۔ یہ بزرگ بھی کوئی معمولی شخص نہ تھے۔ ان کی بے خودی کسی شہوانی جوش اور سیہ کاری کے جذبے کا نتیجہ نہ تھی۔ لونڈی پر قابو پایا تو اُسی جگہ اور اُسی مقام پر آزاد کر کے اپنی خانقاہ کے ایک شریف و ہم مذاق دوست کے ساتھ اُس کا نکاح پڑھ دیا۔ اور آگے کی راہ لی۔[1]

اس واقعہ کی یادگار میں اُدھر اُس لونڈی کے بطن سے تو چند روز بعد ایک صاحب علم وفضل لڑکا پیدا ہوا جس نے پا پیادہ تیس حج کیئے۔ ادھر ان بزرگ کی بھی عجب حالت ہو گئی۔ یہ نغمۂ دلکش ان کے پُرشور دل پر کچھ ایسا اثر کر گیا تھا کہ اسی ایک سُریلی تان اور جادو بھری آواز نے بھی فنائیت کے رتبے پر پہونچا کے ولی کامل بنا دیا۔

یہ بزرگ کون تھے؟ انھیں کوئی گمنام و غیر معروف شخص نہ خیال کرو یہ ایک بڑے اعلےٰ پایہ کے ولی کامل تھے۔ اور وہ شخص جن کا نام حقیقت و عرفان کے عالم میں ہمیشہ آفتاب عالمتاب کی طرح چمکتا رہے۔ یہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جن کے نام کا ساری دنیا ادب کرتی ہے۔ جنھوں نے ریاضت و نفس کشی اور صفائے باطن کے اعتبار سے اسلام میں امامت کا مرتبہ حاصل کیا ہے۔ جنھیں مشائخ باطن اپنا پیشرو تسلیم کر کے "سید الطائفہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اور جن کے حالات کو ہمارے ناظرین ان اوراق پر تفصیل کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں گے۔

۲- جہان آرا بیگم

یعنی شاہجہاں بادشاہ کی فاضل بیٹی جہاں آرا بیگم کی سوانح عمری مولفہ جناب مولوی

[1] وفیات الاعیان لابن خلکان حالات جنید بغدادی رح

محبوب الرحمن صاحب کلیم بی۔ اے مدرس مدرستہ العلوم علیگڈھ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ لکھائی چھپائی نہایت نفیس حجم ۰۰ صفحے قیمت مجلد ۸ ر ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ فاتح نیا علیگڈھ۔

اس دلچسپ کتاب میں مولف نے شاہجہاں وممتاز محل کی بیٹی، آصف خاں اور نور جہاں بیگم کی نواسی ستی النسا خانم ہمشیرہ طالب آملی کی شاگردہ، اورنگ زیب کی بڑی بہن یعنی جہان آرا بیگم کے حالات مختلف ذرائع سے ایسی تلاش وکاوش کیساتھ بہم پہونچائے ہیں کہ طبیعت داد دینے پر مجبور ہوجاتی ہے خصوصاً (۱) ولادت اور خاندانی حالات (۲) تعلیم (۳) تالیف وتصنیف (۴) مشغل واخلاقی حالات (۵) بیگم صاحبہ کا چال چلن (۶) شادی نہ ہونے کی وجہ (۷) حالات (۸) بیگم صاحبہ کی پالٹیکس (۹) آخری ایام۔ مذہب اور وفات (۱۰) بیگم صاحبہ کی یادگاریں وغیرہ تمام ابواب دیکھنے کے قابل ہیں۔

مونس الارواح حضرت خواجہ اجمیر رحمتہ اللہ علیہ کے حالات میں اسی بیگم کی تالیفات میں سے ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جہان آرا بہت بڑی انشا پرداز تھی۔ مضامین کی ترتیب عبارت کی سلاست، الفاظ کی تلاش ونشست سے صاف عیاں ہے کہ وہ ملک فصاحت پر بھی قبضہ رکھتی تھی یہ شعر وشاعری سے بھی بیگانہ نہ تھی۔ چنانچہ مونس الارواح میں بزرگان دین کی شان میں جابجا بہت سے اشعار اپنی تصنیف سے درج کئے ہیں۔

خوبی صورت کے ساتھ خوبی سیرت میں بھی بیگم صاحبہ (جہاں آرا اسی نام سے مشہور تھی) آپ اپنی نظیر تھیں چنانچہ ان کی شرم وحیا کے ثبوت میں یہ واقعہ کافی ہے کہ ۱۰۵۳ھ میں جشن کے موقع پر ان کے کپڑوں میں آگ لگ گئی چونکہ اس موقع کے قریب تمام عمائد سلطنت موجود تھے اس نے ذرا بھی شور وغل نہ کیا اسکو اسوقت یہ خوف غالب تھا کہ عمائد اسکا شور وغل سنکر بیتابانہ اندر نہ چلے آئیں اور اسکو اس حالت میں دیکھ لیں۔ اس ڈر سے وہ اپنی جان پر کھیل کے سرعت کے ساتھ آگے بڑھی اور زنانے کمرے میں پہونچتے ہی زمین پر بیہوش گر پڑی یہ سب کچھ تھا لیکن چونکہ ملکی مصلحت یا قابل ملامت شاہی غرور وخودداری کے لحاظ سے جہان آرا بیگم کی عمر بھر شادی نہیں کی گئی اسلئے بدگمانوں کو بدگمانی کا اچھا بہانہ ہاتھ آگیا۔ ہمارے خیال میں انسانی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر برنیر کے سے نکتہ چینوں سے

الزام دو سا اعتراض بالکل بیوجہ ہی نہیں معلوم ہوتے۔ تاہم فاضل مولف نے ان کی تردید
پورے طور پر ان الفاظ میں کر دی ہیں کہ

جہاں آرا بیگم کے اخلاق اور چال چلن پر جس پہلو سے نظر کیجائے قابل تعریف ہے۔
تمام مورخین اُسکو فرشتہ سیرت کا خطاب دیتے ہیں۔ اور اُسکے خلق و فطرت کے مدح سرا ہیں
لیکن ہمارے ڈاکٹر برنیر صاحب نے سب کے خلاف اُس پاکباز بیگم پر طرح طرح کے بے اصل و
خلاف عقل اتہام لگا کر اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کیا ہے چونکہ ہماری اس کتاب کا موضوع
اُن غلط الزامات کا رفع کرنا ہے۔ اسوجہ سے ہم اس موقع پر اُسکے بے اصل قصوں کی اُسکے
الفاظ میں نقل کر کے بیان تردید کرتے ہیں۔ تاکہ ناظرین کو پوری طور پر اندازہ ہوسکے کہ
وہ کہاں تک صحیح ہیں۔

ڈاکٹر برنیر لکھتا ہے "اگرچہ[1] بیگم صاحبہ محل میں حسب معمول محصور رہتی تھی اور محل کی مستورات
کی طرح اُس کی بھی نگہبانی ہوتی تھی۔ مگر کسی مخفی طور پر اُسکے پاس ایک نوجوان کی آمد و رفت
ہو گئی۔ جو اگرچہ کوئی خاندانی آدمی نہ تھا۔ مگر حسین بہت تھا۔ لیکن اُسکی کسی حرکت کا اُسکے
ہم جنس اور ہر وقت کے محافظوں سے مخفی رہنا ممکن نہ تھا۔ اور جبکہ یہ عورتیں بیگم صاحبہ کے
رنگ وحدت چلے ہی جل رہی تھیں۔ تو یہ راز کسطرح نہ کھل جاتا۔ الغرض شاہجہاں
بھی بیگم صاحبہ کی خطا و لغزش سے واقف ہو گیا۔ اور یہ ارادہ کر کے خلاف معمول محل میں
جا کر اُس ماجرے کو دریافت کرنا چاہیے۔ ناگہاں وہاں چلا گیا اب چونکہ بیگم صاحبہ کو بادشاہ
کے آنے کی خبر جلد نہ ملسکی کہ اُس شخص کو کسی مناسب جگہ پر چھپا سکے۔ اسلئے اُس خوف
زدہ عاشق نوجوان کو حمام کی ایک بڑی دیگ میں چھپا دیا اس امر کے ملاحظے سے بادشاہ
کے چہرے پر نہ تو کچھ تعجب ہی کے آثار ظاہر ہوئے اور نہ کچھ غصہ و ناخوشی ہی معلوم ہوئی
بلکہ بیٹی سے معمولی باتیں کرتا رہا۔ لیکن کسیقدر بات چیت کے بعد کہا یہ کہ معلوم ہوتا
ہے کہ تم نے آج حسب معمول غسل نہیں کیا۔ حمام کرنا چاہیئے۔ اور خواجہ سراؤں کو حکم دیا
کہ دیگ کے تلے آگ جلائیں اور جبتک کہ اُنہوں نے یہ نہ جتلا دیا کہ وہ قسمت کا مارا کشتہ

[1] سفرنامہ ڈاکٹر برنیر

رقابت بلکہ خاک ہو گیا ہے وہاں سے نہ ہلا"
ایک اور جگہ پر وہ لکھتا ہے کہ شاہجہاں کی بڑی بیٹی بیگم صاحبہ بحد حسین خوش اندام اور باپ کی نہایت ہی پیاری تھی۔ ایسے غیر طبعی میلان کے افواہ کی نسبت اشارہ کرنا ایک نامطبوع واقعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ عذر بیگناہی و برات جسپر شاہجہاں کے دل کو اس علم سے میں اطمینان دیا گیا تھا وہ یہ ہے کہ بادشاہ کو اُس درخت کے میوے سے متمتع ہونا جسکو اُس نے خود لگایا ہے جائز اور درست ہے۔
ڈاکٹر برنیر کی اس تحریر کو بوجوہ ذیل میں خلاف اصل سمجھتا ہوں۔
(۱) یہ کہ ان واقعات کو کسی اور مورخ نے برنیر کے سوا نہیں لکھا۔ یہ صرف برنیر ہے جو اس پاک طینت بیگم کے دامن عصمت پر دھبا لگاتا ہے۔ بخلاف اسکے تمام مورخین اوسکی عفت اور پاکدامنی کی تعریف کرتے ہیں۔ اسلئے اصول تاریخ کے موافق ایک شخص کی روایت سیکڑوں کے مقابل کسی طرح پر قابل اعتبار نہیں ہو سکتی۔
(۲) ڈاکٹر برنیر کے سفرنامے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ حد درجہ مرض حسد و تعصب میں مبتلا تھا۔ سلطنت مغلیہ کی ہر خوبی کو وہ عیب کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ اور ہر ایک بات پر کچھ نہ کچھ نکتہ چینی ضرور کرتا ہے۔
(۳) اُس نے اس قصے کو ایک پرتگال کی بڑھیا سے سُنا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اُس کو بیگم صاحبہ سے کچھ رنج پہونچا ہو۔ اور وہ بھی برنیر کی طرح مرض حسد و تعصب میں مبتلا رہی ہو۔ علاوہ بریں برنیر اس روایت کو افواہی قرار دیتا ہے۔
(۴) برنیر خود معترف ہے کہ محل کی عورتیں بیگم صاحبہ سے بہت کچھ حسد و بغض رکھتی تھیں اس بنا پر ایسے لوگوں کی روایت کا ماننا اصول درایت کے خلاف ہے۔
(۵) شاہجہاں بہت خدا پرست آدمی تھا۔ اور اسکی بیٹی بھی زہد و ورع میں اُسوقت ضرب المثل تھی۔ شاہجہاں کا جہاں آرا کے ساتھ ایسا ناجائز تعلق رکھنا آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا ہے۔ یہ وہ الزام ہے جو زمین میں سما سکتا ہے نہ آسمان میں۔ حقیقت یہ ہے کہ برنیر کی انہیں بے اصل روایتوں نے اسکی کتاب کو بالکل لوگوں کی نظر سے گرا دیا ہے۔

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

طرفہ یہ کہ برنیر لکھتا ہے کہ علماء نے بھی اس امر کی شاہجہاں کو اجازت دیدی تھی شاباش

این کار از تو آید و مردان چنیں کنند

(۶) خود مسٹر ٹیورنیر نے بھی اس روایت کی تردید کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زہد و تقویٰ جہاں آرا بیگم کی غالب خصوصیت ہے اور اسکو اطاعت خدا اور رسُول میں حد درجہ استغراق تہا۔ عین شباب میں اُسکا وقت زیادہ تر صوم وصلوٰۃ میں گزرتا تھا۔ ڈاکٹر برنیر کا اُسپر یہ محض اتہام ہے اور کتاب مونس الارواح جس کو اُس نے عین شباب میں لکھا ہے۔ اُسکا حرف حرف روایات برنیر کی تردید کرتا ہے۔

مسٹر ٹی ڈبلیو۔ بیل صاحب لکھتے ہیں کہ "جہاں آرا بیگم عورتوں کی تاریخی دنیا میں بلحاظ عصمت و حیا کے بے مثل شاہزادی گذری ہے۔ جو تمام کتب تواریخ اور ملکی راگوں میں ایک نامور بذلہ سنج۔ خوش اخلاق۔ فاضل اور خوبصورت بیگم مشہور ہے۔ جہاں آرا کا نام ہمیشہ صفحات تاریخ کو آراستہ رکھیگا۔ اور وہ قیامت تک اطاعت والدین اور ادائے فرض منصبی میں ضرب المثل رہیگی"

ثمرۂ فصاحت

دیوان حضرت حاجی حافظ مولوی محمد فیاض الدین صاحب فیاض حیدرآبادی تقطیع ۲۲×۱۸ حجم ۱۴۶ صفحے قیمت ۸ ارمع محصول ڈاک۔ ملنے کا پتہ:۔ محمد عبدالوہاب صاحب متصل کیپٹ کیل شاہ علی بندہ حیدرآباد دکن۔ فرزند مصنف۔

ہم اس موقع پر حضرت فیاض کی ایک غزل بطور نمونہ نقل کرتے ہیں جس سے شائقین سخن کو ان کی شاعری کا پایہ معلوم ہوجائیگا۔

حیران وضع حسن خداداد رہ گیا ۔ لیکر قلم کو ہاتھ میں بہزاد رہ گیا
اے شوق دید رحم گران جانیوں پہ کر ۔ کمبخت دیکھہ بازوئی جلاد رہ گیا
چرچے نہ عشق کے نہ جنوں کے وہ ولولے ۔ افسانہ عاشقوں کا فقط یاد رہ گیا

اسلام کا پتا ہے نہ ایمان کا نشان — اس بحث کے عہد میں فقط الحاد رہ گیا
آہن ربا ہو کہیں یہ سوزش جگر — سینہ میں بنکے نشتر فصاد رہ گیا
تقسیم جب ازل میں نصیبوں کی ہو چکی
فیاض کے لئے دل ناشاد رہ گیا

رپورٹ کمیشن تحقیقات شورش مدرسۃ العلوم علیگڈھ

آخرکار شائع ہوگئی لیکن ہمارے خیال میں اسکی تمام کارروائی کوہ کندن وکاہ برآوردن سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اصل یہ ہے کہ علیگڈھ کالج کی درستی کے لئے لازمی ہے کہ (۱) ایک مستقل سرمایہ نیشنل فنڈ کے نام سے جمع کیا جائے تاکہ کالج کو سرکاری دباؤ سے کسیقدر آزادی حاصل ہو اور اسپر نیشنل کالج کا اطلاق ہو سکے (۲) ایسا انتظام کیا جائے کہ کالج کی اور اسکے ساتھ تمام مسلمانوں کی قومی پالیسی صرف مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو یعنی انگریزوں کا اگر دخل بھی ہو تو صرف معاملات درس و تدریس میں اور اس مقصد کے حاصل ہونیکے لئے (۳) یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ٹرسٹیوں کے قواعد میں مناسب ترمیم کیجائے اور آیندہ صرف تعلیم یافتہ اور قابل ٹرسٹی مقرر کئے جائیں جنکی سوا اسکے اور کوئی شکل نہیں ہے کہ انتخاب ٹرسٹیان کا اختیار صرف ٹرسٹیوں کی مختصر جماعت تک محدود نہ ہے بلکہ باحتیاط مناسب پبلک کو بھی جسمیں کالج کے پرانے طلباء بھی شامل ہیں، ووٹ دینے کا اختیار دیا جاوے اور اس رائے دینے والی جماعت کے انتخاب کا بھی ضابطہ معین کر دیا جائے ۔ نیز ٹرسٹیوں کا انتخاب تمام عمر کے لئے نہو بلکہ صرف ۳ سال یا زیادہ سے زیادہ ۵ سال کے لئے ہو اور موجودہ ٹرسٹی بھی ۳ سال کے لئے سمجھے جائیں جسکے بعد انکا دوبارہ انتخاب لازمی قرار پائے اور ناقابل ٹرسٹی خارج ہو جائیں ۔

افسوس ہے کہ کمیشن نے ان معاملات میں سے بجز ایک کے کسی پر بحث نہیں کی اور اس ایک مسئلے کی نسبت بھی نواب وقار الملک بہادر کی رائے کے خلاف یہ فیصلہ کیا کہ "ہماری رائے میں ٹرسٹی کے منصب کا تاحیات ہونا ٹرسٹ کانسٹی ٹیوشن کا کوئی عیب نہیں ہے"۔ کانگریس پارٹی کی "بے مانگی مدد" کا بے بنیاد افسانہ بھی رپورٹ میں موجود ہے جسکی اصلیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ انگریزوں اور بعض ٹرسٹیوں کے ڈرانے کے لئے چند طالب علموں نے (جنکا نام ہمکو معلوم ہے اور غالباً البشیر کے ایڈیٹر صاحب کو بھی معلوم ہوگا) کالج میں یہ مشہور کر دیا کہ شہر کے ایک ہندو بزرگ ... روپے دینے پر آمادہ ہیں اور بنگال سے بھی کئی لاکھ کی مدد آنے والی ہے۔ حالانکہ ہم بوثوق کہہ سکتے ہیں کہ انہیں سے کوئی افواہ صحیح نہیں ہے کمیشن کا ایسی افواہوں پر بلا تحقیق یقین کر لینا سخت اعتراض کے قابل ہے اور ہمارے دل میں جائز طور پر یہ بدگمانی پیدا کرتا ہے کہ کمیشن کی دیگر اطلاعیں اور اسلئے اسکے فیصلے بھی اسی صورت سے محض غلط اور بے سروپا ہو سکتے ہیں۔ اگر اس باب میں کمیشن اپنے فیصلے کی صحت کا یقین ہو تو وہ شہادت دینے والوں کا نام اور بیان شائع کرے جسکو ہم یقیناً غلط ثابت کر دینگے فقط

غزلیات حضرت مولانا شاد خان بہادر عظیم آبادی

پھر مزہ کیا تری یکتائی میں پیدا ہوتا — تجھسا ہوتا جو کوئی وہ بھی تجھی سا ہوتا

جسم خاکی کے تعلق نے گرانبار کیا — کاش میں راہ میں تیری تن تنہا ہوتا

مژدہ وصل میں اے دل تجھے دیتا لیکن — تجھکو مجھ پر تو مجھے کسپہ بھروسا ہوتا

میں تو اک حسرت و اندوہ کا پتلا ٹھہرا — بھول جاتا تجھے پر تو تو نہ بھولا ہوتا

درد الفت سے قوی ہوتی ہے روح اس تنمیں — اور بڑھتا یہ مرض شاد تو اچھا ہوتا

مطلع جہاں ہے مکتب الفت خموش ہو رہنا — بڑا گناہ بیاں ہے الف سے بے کہنا

ولہ

بدلی وہ وضع طور سے بیطور ہوگئے — تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہوگئے

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار — جب تک چلی شراب کئی دور ہوگئے

آئینہ لیکے ہاتھ میں کہتا ہوں کیوں فلک — ہم اور ہوگئے کہ وہی اور ہوگئے

ہر چند شاد بے خبر و نیم نہ تھے مگر — راضی تری رضا پہ بہر طور ہوگئے

ولہ

کھلتا نہیں کسی ڈھب احوال اس انجمن کا — پردہ پڑا ہوا ہے آنکھوں پہ ماؤ من کا

بلبل نے جان دی ہے اب گل کو ہوگی راحت — ہاں سچ ہے خار ہی تھا کمبخت اس چمن کا

منظور رنج تھا یہ ان کو مٹی بجائے برباد — پتلا بنا دیا ہے ہمکو غم و محن کا

بانٹے جنوں نے خلعت تقسیم کی تھی دولت — مژدہ ہی شاد ان کا محتاج ہے کفن کا

غزل حضرت ضامن کنتوری

چارہ جب ہو نسکا عقل کی بیماری کا — نام رکھا گیا تقدیر خطا کاری کا

مجمع حشر میں ہے شرم گنہ تیرے ہاتھ — ہے یہی ستاری وقت ہے ستاری کا

پاؤں بھولے سے بھی رکھا نہ رہ حق میں کبھی — حال کیا پوچھتے ہو میری خطا کاری کا

پیش کر سکتے ہیں کب ہم کوئی بخشش کی دلیل — عذر مسموع نہیں مجرم اقراری کا

زخم دل نے مجھے اسطرح کی لذت بخشی — کبھی احسان نہ لیا مرہم زنگاری کا

لے ہی ڈالا نہ چلا عشق سے آخر کچھ روز — ورنہ دعوی تو بہت تھا ہمیں ہشیاری کا

قافلہ کوچ پہ تیار ہے ضامن اُٹھو
نیند اچھی نہیں یہ وقت ہے بیداری کا

غزل جناب کوثر خیرآبادی

حال درد دل سنایا سخت نادانی ہوئی
انکو بزم غیر میں کیسی پشیمانی ہوئی

فرقت جاناں میں ہر شے کا مزا جاتا رہا
جب سے گلرنگ اُتری حلق سے پانی ہوئی

حلق سے جو گھونٹ اُترا زہر قاتل بن گیا
کیا دوا تھی دامن شمشیر میں چھانی ہوئی

تشنہ کامان محبت نے بجھائی اپنی پیاس
موج کوثر حلق میں تیغ صفاہانی ہوئی

حشر میں جوش جنوں نے خوب پردہ رکھ لیا
مثل یوسف شاہد اپنی چاک دامانی ہوئی

نامہ اعمال اپنا دیکھکر ہوش اُڑ گئے
داور محشر سے کوثر کیا پشیمانی ہوئی

عزیز۔ مرزا محمد ہادی صاحب لکھنوی

غرور حسن ہے عہد شباب کے قابل
یہ مشغلہ ہے شب ماہتاب کے قابل

مزاج حسن کی گرمی بڑھے خدا نکرے
کسیکا دل نہیں تیرے عتاب کے قابل

بشوق دید ارنی گوئے طور کا وہ سوال
تمہیں بتاؤ کہ تھا اس جواب کے قابل

کہا محاسب رحمت نے دیکھکے فرد عمل
ترے گناہ نہیں ہیں حساب کے قابل

شراب عشق سے چھلکا جو دل کہا میں نے
یہ جام تھا کسی مست شباب کے قابل

ہجوم جلوہ رخ ہے حجاب اہل نظر
فروغ حسن نہیں ہے نقاب کے قابل

بنایا عشق کو دل سے خلاصۂ فطرت
یہ تین حرف ہیں بس انتخاب کے قابل

وہ کروٹیں ترے بیمار ہجر نے بدلیں
جہان عشق ہوا انقلاب کے قابل

بدور صحبت مے جلوہ ریزی ساقی
یہ کیفیت ہے شب ماہتاب کے قابل

بتوں نے دلپہ جوانی میں وہ ستم ڈھائے
رہا نہ حسرت عہد شباب کے قابل

نگاہ شوق میں سبکے نہیں اثر یکساں
یہ ہر نگاہ تھی بیشک حجاب کے قابل

عزیز دیدہ تر سے تراوش خوناب
یہ تازہ گل تھے کسی فرش خواب کے قابل

غزل حضرت محشر لکھنوی

رستہ کسیکا دیکھا وعدی کی شب یہاں تک ــ آنکھوں سے نظر گردی ہمراہ شوق جاں تک
اسے شوق زخم کاری ہمت یہ چاہتی ہی ــ دل خود ہی اڑکے پہونچے اُس تیر ناروا تک
انجام پر نظر ہے جو کچھ ہو عین راحت ــ تڑپے گا شوق سے دل تڑپا ئی غم جہاں تک
اظہار سوز باطن ہمدم سے ہو تو کیا ہو ــ ایک آبلہ ہے دلسی لیکر مری زباں تک
کہتے ہیں پا شکستہ راہ وفا میں گرکر ــ کوئی خدا کا بندہ پہونچا دی کارواں تک

اغیار جاں بلب ہیں اور چارہ گروہ ظالم
محشر حیات آخر اس رشک سے کہاں تک

کلام جناب خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج پنشنر خفیفہ

رات اُس مِس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار ــ ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
زلف پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید ــ قد رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں ــ گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں
گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے ــ دلکش آواز کہ سُنکر جسے بلبل چہکے
دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رکجائیں ــ سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں
آتش حسن سے تقوی کو جلانے والی ــ بجلیاں لطف تبسم سے گرانے والی
پہلوئے حسن بیان شوخی تقریر میں غرق ــ ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق
بس گیا۔ لوٹ گیا۔ دل میں سکت ہی نہ رہی ــ سر سے تمکین گئی مسلک دین وہ گت ہی نہ رہی
ضبط کے عزم کا اُس وقت اثر کچھ نہ ہوا ــ یا حفیظ کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہوا
عرض کی میں نے کہ اے گلشن فطرت کی بہار ــ دولت و عزت و ایمان ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہد وفا باندھ کے میری ہو جائے ــ سارے دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے
شوق کے جوشیں میں نے جو زباں یوں کھولی ــ ناز و انداز سے تیوری وہ چڑھا کر بولی

غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے
بوئے خون آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بنکر
حلے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بنکر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑجاتے ہیں

گل لگائے کوئی میدانیں تو اترا جائیں
پائیں سامان اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ابھی ان کی رگوں میں اثرِ حکم جہاد

دشمن صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی

عرش کی میں نے کہ ای لذتِ جاں راحتِ روح
اب زمانے پہ نہیں بارِ اثرِ آدم و نوح

شجرِ طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہے براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجمن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پر پڑھتے ہیں سبحان اللہ

جوہرِ تیغ مجاہد تری ابرو پہ نثار
نورِ ایمان کا ترے آئینۂ رو پہ نثار

اُٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحث بدِ نیک
دو وسیلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک

موجِ کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپکو ایمان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحب فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ یہ وہم

سیکر اسلام کو ایک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی وہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

رپورٹ کلکتہ کانگرس

جو اس ماہ کے رسالے کے ہمراہ بطور ضمیمہ روانہ کیجاتی ہے وہ صرف ان لوگوں کی خدمت میں بھیجی گئی ہے جو للعہ رسالانہ قیمت ادا کرتے ہیں کیونکہ رسالے کے ساتھ جو کتابیں یا دیوان بطور ضمیمہ شائع ہوتے ہیں ان کے مستحق اسی قسم کے خریدار ہیں۔ باقی جن حضرات کو رپورٹ مطلوب ہو وہ ۳ کے ٹکٹ بھیجکر منگالیں یا اجازت دیں کہ ۴ر مع محصول ڈاک وفیس منی آرڈر میں ویلو کرادی جائے۔ مینجر اردوی معلے علیگڈھ

حضرت مولانا ... شاہجہانپوری سلمہ ... [illegible]

... وقت حساب آہی گیا | دل سے منھ تک خود بخود پھر کے جواب آہی گیا
[illegible] ست غفلت سے پیری آگئی | پڑ کے ایسے سوئے سر پر آفتاب آہی گیا
[illegible] پیری ادھر کو سفر | زندگانی کی ورق سے تو جواب آ ہی گیا
[illegible] کے نشے میں مست تو بیہوش تھے | پٹ پٹا کر ہوش انہیں بعد شباب آہی گیا
عمر بھر بھٹکا دل تک رسائی اب ہوئی | ٹھوکریں کھا کر سوئے راہ صواب آہی گیا
[illegible] کے ساتھ زاہد چل سکا آخر نہ تو | کوچ کا جب وقت آیا تو جگر خراب آہی گیا

دیگر

حشر کے دن قد آدم آفتاب آہی گیا | تو بھری محفل کے اندر بے نقاب آہی گیا
[illegible] کی مجلس سے ہم پیکر کسکے بھی کو تھے | جھٹ سے واعظ کے ہاتھ میں کتاب آہی گیا
[illegible] محفل میں وہ آنکھیں لڑاتے تو رہے | پھر بھی وہ معشوق تو آخر حجاب آہی گیا
[illegible] اس دلدار کا عمر بھر اس نے خراب | جسکو دیکھا اسپہ یہ خانہ خراب آہی گیا
[illegible] مستوں پر کرم ہے جب لگایا منہ سے جام | جو تھا مغرب سی مستانہ شتاب آہی گیا
شوق پابوسی میں جوش صید دیکھ شہسوار | لاکھ زخمی تھا تڑپ کر تا رکاب آہی گیا
اسکی خاطر سے یونہی اقرار کر بیٹھا تھا میں | ساقی بدست جھٹ لیکر شراب آہی گیا

صحبت رندان سے زاہد مدتوں بچتا پھرا
میکدے میں ہو کے آخر کو خراب آہی گیا